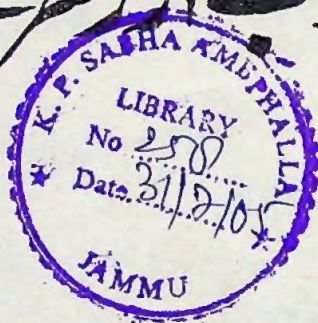






سیلاب اور قحط



تیج بہادر

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

۱۹۶۷ء

طباعت

ایک ہزار

تعداد

پرائیٹس پبلیشرز (سرینگر) کشمیر

طالع

خواجہ لیتھو پریسی جامع مسجد
(دہلی)

مطبع

۶ روپیہ ۴۰ پیسے

قیمت

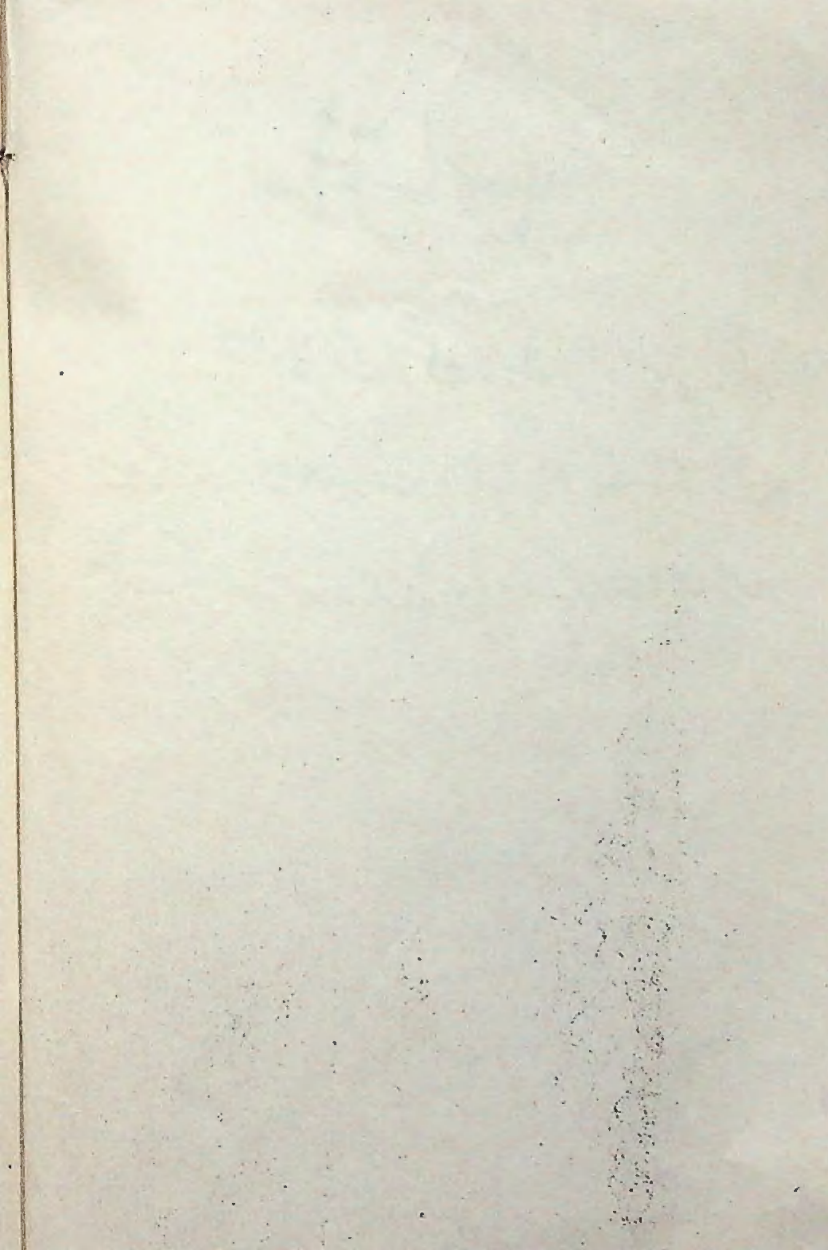
(کتبہ شمیم گوندوی)

انتساب

کشمیر کے مشہور شاعر

جناب دینا ناتھ نادم کے نام

جو میرے استاد بھی رہ چکے ہیں



بیش لفظ

اپنے دو افسانوی مجموعوں "جہلم کے
سینے پر" و "محورت" کے بعد یہ ناول
آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

تیج بہادر

”سیلاب قطروں کو بہا لے جاتا ہے
لیکن قطرے مل کر سیلاب بن جاتے ہیں“

آسمان گھنے بادلوں سے گھرا ہوا تھا۔ شام اندھیری تھی، کبھی کبھی بجلی چمک اٹھتی۔ لمحہ بھر کے لئے گھاٹ کی سیڑھیاں روشن ہو جاتیں۔ اور گھاٹ تلے جہلم میں بننے بگڑتے ہکوردوں کی حدیں واضح ہو جاتیں۔ لمحہ بھر کے لئے گھاٹ سے کشتی کی بے ہنگم چھپت اندھیرے میں نمودار ہوتی اور بجلی کی چمک کی آخری چمکی کے ساتھ ہی پھر سے اندھیرے میں ڈوب جاتی۔

بجلی تڑپ تڑپ کر چمک رہی تھی۔ جیسے کوئی مچھلی، اُجلی اُجلی، گہرے پانی میں دم گھٹتا محسوس کر کے ذضا میں سانس لینے کے لئے لیک رہی ہو، بجلی کی چمک لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی جا رہی تھی اور ہوا میں بھی نیسز ہوتی جا رہی تھیں۔ گھاٹ سے ذرا اُدھر کیسے کاد درخت بدستور سرچنے پر مجبور ہو رہا تھا۔

دفعۃً بجلی بڑے زور سے چمکی۔ ساتھ گرج کا ایک ٹہیب دھماکہ اٹھنے میں گونج اُٹھا اور بلکہ کاک پاؤں بڑھاتے ہوئے ہچکچا سا گیا۔ کیسے پرہیزگار کئے پرندے پھر پھڑا کر اور چلا چلا کر قدرت کی دست درازی کے خلاف احتجاج کرنے لگے۔ بھلا ان کا کیا قصور تھا کہ قدرت ان کی نیند خراب کرنے پر تل گئی تھی؟ قصور اگر کسی کا تھا تو بلکہ کاک کا جو ایک ایسا قدم اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا جس سے بہت ساروں کی کائنات ڈھسے جلنے کا خطرہ تھا۔

گرج کی گونج ڈوبنے۔ یہی تو بلکہ کاک کی سوچ اُبل پڑی۔ اسے محسوس ہوا

کہ قدرت اسے تبنہ کر رہی ہے کہ دینا ناکھ اور رحمان کو الگ رکھنے میں ہی بھلا ہے۔ ورنہ ان دونوں کا ساتھ ملنا کیا رنگ لا بیگا۔ جب کبھی دونوں ساتھ رہے کوئی نہ کوئی فتنہ کھڑا کرتے رہے۔ اور قصور دینا ناکھ کا نہ تھا بلکہ رحمان کا تھا جس کی لپیٹ میں آکر دینا ناکھ اس کا بھولا بیٹا ناحق مارا جاتا تھا۔ دینا ناکھ نمائش میں رُمال چراتے ہوئے کبھی نہ پکڑا جاتا اگر رحمان کا ساتھ نہ ہوتا ایک چوری کی بات ہوتی تو اتنی تکلیف دہ نہ ہوتی۔ دینا ناکھ سچے تو تھا ہی نا کجی میں رکھ گیا ہو گا رمال پر۔ لیکن رحمان کی ترغیب نے دینا ناکھ کو گھر سے برتن چرا کر بیچنے پر بھی آمادہ کیا تھا تاکہ دونوں سینما دیکھ سکیں۔ بلکہ کاک کو یقین تھا کہ سب کارستانیوں کی جو رحمان ہے۔ بھلا بھک منٹے کے پاس نہ ہی کیا جو بیچ سکے۔ بوسیدہ ناؤ کے پھٹے تو بھلائے کے قاب میں بھی نہ تھے!

بلکہ کاک نہ جانتا لیکن رحمان کے بوڑھے باپ بڑی بات ٹالتے بھی نہ بنتی تھی۔ بیچارہ بڑا خود بھی بیٹے کے چھانٹوں نالاں تھا۔ رحمان آج دینا ناکھ کی وساطت سے کام پر لگ جائے تو بھر لے بھی بہت سارے دکھ دُور ہو سکتے تھے۔ دینا ناکھ کسی ٹھیکیدار کا مزی بن گیا تھا۔ خیال کرتے ہی بلکہ کاک کے چہرے پر افسوس کی لہر اٹھ آتی۔ بلکہ کاک اپنے بیٹے کو انجیر یا ڈاکڑ کی صورت میں دیکھنا زیادہ پسند کرتا۔ پر جب بیٹا نالائق ہو تو باپ بیچارہ کیا کرے۔ بلکہ کاک کا جی چاہا کہ بیٹے کو دے چار گالیاں دے۔ لیکن وہ سمجھ نہ کہہ سکا۔ اُسے محسوس ہوا کہ بیٹے کو گالیاں دینے سے کام نہیں چلے گا۔ بھلا وہ خود کون افسرین پایا تھا۔ وہ تو دینا ناکھ کے دادا کی کوششوں سے ایسی جگہ کھر کی پر ماور ہو گیا تھا جہاں رشوت پانی کی طرح ملتے تھے۔ ورنہ آج اُس کے اپنے پاس تن ڈھانپنے کو چیچرے بھی نہ ہوتے۔ اس لئے اسے کوئی حق نہ تھا بیٹے کو کو سننے کا۔ بلکہ بھگوان کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ

لے دیکھا کہ چھوٹا سا شید کا ما جہلم کی لہریں پر ہولے ہولے ڈول رہا ہے جیسے
 بڑی ناؤ کو اپنے ساتھ بہا لے جانے کی جدوجہد کر رہا ہو۔ بڑی ناؤ
 کے پیٹ سے پتھر پتھروں کی بے ربط آوازیں آرہی تھیں۔ بلکہ کاک کو
 گھٹیں سی لگی۔ بوڑھے بوڑھے لڑکوں کا ساتھ دینے کی کوشش
 کریں اور نوجوان بوڑھوں کا ہاتھ پکڑنے کی زحمت بھی نہ اٹھائیں۔
 اس طوفان میں گھر سے باہر نکل آیا۔ تھکن کے مارے جوڑ جوڑ الگ سا
 ہو گیا تھا۔ کھنڈ سے ہڈی ہڈی کا پڑھتی تھی اور ایسے بے شرم مشاہدوں
 سے واسطہ پڑا تھا کہ ایک بوڑھے کو دوسرے بوڑھے کے سہارے کے
 لئے بھیج دیا۔

شاید چھوٹا شکار بڑی ناؤ کو گھسیٹ کر نہا ہی لے جائیگا؟ حراج
 ہوں۔ بوڑھا منبرا اور وہ خود ایک بوڑھا۔ پھر منبرا تو اتنا زیا
 بوڑھا نہیں۔ اب بھی دامن کی بوری سر پر لاد کر گھاٹ پر چڑھ جاتا ہے
 نہ چڑھ پائے تو کھائے کیونکر..... اور ایک وہ خود ہے کہ سیڑھیاں
 اترتے سخت گیا۔ دفعتاً اس نے منزل سے سوال کیا۔
 ”منبرا تم مجھ سے کس سال چھوٹے ہو.....“

”یہی کوئی تین ایک برس..... کیونکہ.....“ منبرا بھی سیڑھوں
 پر بلہ کاک کے پاس بیٹھ گیا۔ بلکہ کاک کو گھونک چکا کہ منبرا کا سینہ بھی
 دھوئیں کی طرح چل رہا ہے۔ محسوس ہوتے ہی تسکین کی لہریں اس کے
 بدن میں دوڑ گئی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے منبرا کی حالت پر رحم بھی آ گیا۔ منبرا
 کی زندگی بڑی کٹ رہی تھی۔ بڑھاپے میں بھی محنت مزدوری کرنی پڑھتی
 تھی۔ اور بیٹا تھا کہ آوارہ پھرا کرتا تھا اور جو کہیں رحمان کا ساتھ دینا

کو بھی آوارہ کر دے تو ۹ اُسے خود بھی شاید منبر کی طرح بوڑھا پے میں در در
 کی سٹو کریں کھانا چڑیں۔ ۱۰ سے سوچ کچھ سر قدم اٹھانا چاہئے۔ معمول کی طرح نوا
 کو نظر انداز کرنا چاہئے۔ منبر کا گند ذہن ایسی لکھتیاں سمجھانے کا اہل نہ تھا۔
 وہ اپنے بیٹے کو ڈھیل دینے پر آمادہ نہیں۔ لاکھ جتن کر کے دینا نہ تھا۔
 ذکری میں جٹ گیا تھا۔ کچھ دنوں میں باپ بھی بن جائے گا۔ بہنو امید سے تھی۔
 بھگوان لڑکی دے تو دل کے ارمان پورے کرنے کا موقع بن جائے۔ اب تک
 ان کے گھر میں لڑکی پیدا نہ ہوئی تھی۔ رشتہ دار اور ہمسائے بھی سمجھیں کہ بلہ
 کاک ایک معمولی کلرک سہی پر پوتی کو اتنا جہیز دیا اتنا جہیز دیا کہ
 ... پر کیا فائدہ لڑکی ہونے سے۔ لڑکی کے بڑے بڑے تھک تو وہ جیتا میں
 چل کر راکھ ہو چکا ہو گا۔ کہیں وہ سڑی تو نہیں جو عجیب عجیب پسینے دیکھ رہا
 ہے۔ لڑکی پیدا ہوئی نہیں اور وہ ہوں بوڑھا ہو گیا ہے نا
 بقیہ ذہن بہک بہک جاتا ہے۔ اس وقت وہ اس لئے سیڑھیوں پر بیٹھا
 ہے کہ منبر پر جتلائے کہ دینا نہ تھا اور رحمان کا ساتھ ٹھیک نہیں۔ دونوں
 نوکریوں سے ہاتھ دھو بیعتیں گے اور جو منبر اُٹھان جائے تو بچپن کا
 دوست جو عتھرہا۔ پھر اس کے بغیر چالہ ہی کیا ہے کیسے سمجھائے اس
 بوقت کو کیسے کہہ دے اس بدحواس پرٹھ، جاہل گنوار سے کہ
 وقت بدل رہا ہے۔ دوست بدل ہی ہے۔ دوستی کے اصول بدل رہے ہیں
 دیکھ منبر تم دینا نہ تھا کے ساتھ رحمان کو گاؤں بھیجنے سے
 انکار کر دو۔ اکیلی جان ہو، کیا بھروسہ۔ دیکھ بھال کے لئے بھی کوئی
 ہونا چاہئے۔ میری مافوق اسے یہیں روک لو۔ یہاں بھی گیسے مزدوری
 مل سکتی ہے۔ کام نہ کرنا چاہئے تو وہاں بھی در بدر پھرتا رہے گا۔ اُسے

یہیں روک لو تو اچھا رہے گا۔

یہاں مزدوری کرنی ہوتی تو در بدر کیوں پھر کرتا۔ یہاں میں بوجھ
جو ہوں کمانے کے لئے۔ اب تم ہی بتاؤ۔ گھر کا کام کاج میں کروں۔ کھانا
میں پکاؤں اور مزدوری بھی میں ہی کروں اُسے کوئی شکریہ یہاں جو
سنبھل جائے گا۔ وہاں سب اپنے کندھوں پر آپڑے گا تو شاید سنبھل
جائے۔ اسد کرناٹی کی لڑکی سے بات چل رہی تھی۔ سوچا کوئی عورت
آئے گی تو گھر بھی بن جائے گا۔ اور یہ خطمی کا پلا بھی سنبھل جائے گا۔ لیکن
اب اسد کرناٹی دنیا ہی لاگ الاپ رہا ہے۔ ”بڑا کی آواز میں آن گزشتہ
دکھ یہاں تھے۔

”کیا کہہ رہا ہے اسد کرناٹی! بلہ کاک نے ہمدردی ظاہر کی۔
”کہتا کیا۔ یہی کہ رحمان لفنگا بن گیا ہے۔ لڑکی کی زندگی خراب
ہو گی تو کون ذمہ دار ہو گا۔“

”اچھا.....“ بلہ کاک نے جھوٹ مٹ کی حیرانی ظاہر کی۔

”ہاں بھئی اب تم ہی بتاؤ۔ بچپن میں کون ایسا نہیں ہوتا۔ اپنی ہی کہو۔
یاد ہے دیوان باغ کے مالی کی کیا حالت بتا یا کرتے تھے ہم دونوں۔ ایک
انارکھی نہ رہنے دیتے تھے درختوں پر..... بھلا ہم لفنگے تھے کیا؟“

اور بلہ کاک پھر سے سوچ کی لہروں میں غوطے کھائے لگا۔ مزاحمت
ہی کہہ رہا تھا۔ وہ خود بھی تو بچپن میں ایسی ہی شرارتیں کیا کرتے تھے۔ انارکھی
کی چوری کیا کرتے تھے۔ دینا نا تھنے نے بھی یہی کیا تو اسے قصور وار نہیں گردانا
جاسکتا۔ اس زادی سے دیکھا جائے تو رحمان بھی برا نہیں۔ اب وہ
کیا کرے..... کیسے سمجھائے بڑا کو یا شاید اپنے آپ کو سنبھالنے کی نوبت

آئے۔ اوفہ..... ران گتھیوں کو سلجھاتے سلجھاتے وہ خود الجھ رہا تھا اور
 سیڑھیوں پر بیٹھے بہنے کے باوجود اسے بے انتہا متکثر محسوس ہونے لگی
 نہرا آپ ہی آپ جھنجھلا اٹھا۔ بل کا ک۔ بوڑھے سے سٹھپا گیا تھا
 شاید کیا باتیں لے بیٹھا اور وہاں بچے ناؤ میں انتظار کر رہے ہوں گے۔
 سوچنے کی بات تھی۔ اتنی ٹھنڈی ڈراؤنی رات میں گھاسٹ کی سیڑھیوں پر
 بیٹھ ہی بیٹھے ادنگھ رہا تھا بل کا ک جیسے پتھر کی سخت کھردری سیڑھیوں پر
 نہیں بلکہ گھریں تکیہ سے پیٹھ لگائے بیٹھا ہو۔

بھئی رات یہیں کاٹتی ہے کیا..... دیکھو تو..... بوندیں بھی گرنے
 لگی ہیں۔ "نہرا نے گسے کندھے سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔ بل کا ک چونک پڑا۔
 بدن کے ننگے حصوں پر بارش کے قطرے چھپتے سے محسوس ہوئے۔ اس
 نے اپنا سوکھا ہاتھ تیز کے کھردرے ہاتھ کو تھامنے کے لئے بڑھایا۔ نہرا کا
 کھردرا ہاتھ لمحہ بھر کے لئے بڑا سا لگا۔ اور دوسرے لمحے اپنا توازن برقرار
 رکھنے کے لئے کھردرے ہاتھ کو زور سے تھاما۔ زندگی شاید اچھائی برائی دونوں
 کے سہارے آگے بڑھتی ہے۔

اُس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ فضلی نام ہو کر اُسے لوگ پھولی کے نام سے کیوں پکارتے تھے۔ پھولی نام پیارا تھا... پر زبان پر اچھے پلے مسگر لین کا احساس ہونے لگتا تھا۔ ذہن میں موٹی تازی لڑکی کی صورت ابھرتی۔ پھولے گال... پھولا سینہ... پھولے پھولے بازو۔ پھولی پھولی رانیں اور گوشت سے ڈھلکے بے ڈھنگے ہاتھ پیر، اور حد سے زیادہ بکے موٹے سے شلغم کا خیال آتا تھا۔ پردہ اس تصور کے بالکل برعکس تھی... لمبی بے ہنگم ڈانڈ کی طرح پتلی... لمبو ترہ چہرہ جیسے کوئی کچا بگو گرشہ... گال چپکے سیدب جیسے سپیلیوں نے بارہا ڈھارس بندھائی تھی کہ چہرہ بہت دلکش ہے پر پھولا تو نہ تھا۔ سینے پر ہلکے سے دڈا ابھار جو جوتی کو بچپن کی طرف دھکیلتے محسوس ہوتے تھے۔ لمبے ہاتھ پاؤں۔ ابھری ہڈیوں سے مزین اور سوکھے ندرت جیسی ٹانگیں۔

— ہو سکتا تھا کہ بچپن میں بہت کھا کھا کر وہ پھول کر گیا ہو گئی ہو۔ اُن دنوں اُس کا باپ زندہ تھا... گھر میں مولیٰ تھی۔ بھیڑ بکریاں تھیں۔ اُس کا باپ صبح جود کے درجھیل کو چل دیتا تھا۔ دن بھر کیچڑ اذر لہروں سے الجھتا رہتا۔ پانی میں اُگی گھاس کو روند مٹا کاٹتا۔ نرکوں میں آنکھ مچولی کھیتا رہتا اور سنگھاڑے کھٹے کیا کرتا تھا۔ کالے کالے سنگھاڑے جن کے دوسری طرف اُگے کانٹے کالی گائے کے سینگوں کی طرح لٹکے تھے... وہ خود دن

۱۔ کنوں گھٹا۔ کنول ڈھنڈل۔ سبزی کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

گائے کو چراتی پھرتی تھی۔ اس کی ٹانگوں کے بیچ منڈ لاتی۔ اس کی تھو تھنی کو
 چومتی جانتی۔ اور تھو تھنی میں بی ہری ہری گھاس کی خوشبو سے لطف اند
 ہو ا کرتی تھی۔ کبھی کبھی اس کی پیٹ پر چڑھ کر دو سینگوں کے ہمارے سواری
 بھی کرتی تھی اور کالی گلے کبھی سینگ نہ مارتی گوہنک یہ چھوٹے چھوٹے بے رحم
 سینگھاٹے ذرا بے امتیاطی سے چھوڑ تو کاٹ کھائیں اور خون کی دھار پھوٹ
 پڑے۔ گھر میں چھلکوں کے ڈھیر بکھرے رہتے تھے اور پردوں میں چھپتے رہتے تھے
 وہ۔ تو باپ ہی کا کمال تھا جوتنے سارے سینگھاڑے بکھتے کرتا تھا رات
 کو جب گھر پہنچ جاتا تو ماں کو اس کی تھیلی اور تلوؤں پر کر دے تیل
 کی مالش کرنی پڑتی مہاپ کی تھیلیوں پر زخموں کی چھینٹ دیکھ کر اس نے کئی بار
 پوچھا تھا کہ کیا سینگھاڑے اکٹھے کئے فردری ہیں۔ کیوں نہ باپ بھی گھر بیٹھ کر اس
 کے ساتھ گائے چرانے جایا کرے یا ٹوکریاں بنا کرے، گھر کے کا کاغذ سے فرسدت پلتے ہی
 ماں ٹوکریاں بننے میں جت ماتی۔ ڈکریاں بننے بننے ماں کی انگلیاں اتنی تیزی
 سے چلا کرتی تھیں کہ اس کا تنہا سر چکرا جاتا تھا۔ دیکھتے دیکھتے نازک ٹہنیاں
 خوبصورت مضبوط ڈکریوں کا روپ دھار کر لیتی تھیں۔ یہ ٹہنیاں بھی تھیں
 کا باپ و برتھیل سے لے آتا تھا۔ جب وہ باپ کو آتے دیکھتی تھی تو گائے کو
 بھول کر اس کے پاس دوڑی دوڑی جاتی۔ اس کی ٹانگوں سے پیٹ پیٹ
 جاتی۔ باپ سینگھاڑوں کی تازی تازی دس بھری گریباں اسے دیتا۔ -
 جباتے ہوئے اس کا منہ میٹھے میٹھے دودھ سے بھر جاتا تھا۔

اور گریباں دوڑے وہ چل اٹھتی اور باپ اسے بانہ سے پکڑ کر سر پر
 رکھی ٹہنیوں کے گھٹے پر اچھال دیتا تھا۔ بھیگی بھیگی ٹہنیوں پر وہ بے طرح
 پھیلنے لگی تھی۔ زمین کو سوں ذوہ محسوس ہوتی اور وہ مارے ڈر کے صغیر لگتی

باپ ہنس دیتا اور دوڑ لگاتا۔ خطرناک جھٹکوں سے وہ ٹہینوں میں دھنسنے لگتی
ٹہینوں میں جگہ سی بن جاتی جس میں وہ سما جاتی۔ اُس کا ڈر ذائل ہو جاتا اور اسے
محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کالی گائے کی پیٹھ پر بیٹھی دروازہ گاری ہے ۔

— باپ کی یاد آتے ہی اُس کی آنکھوں میں آنسو ابھر آئے ۔۔۔ شاید یہی دن

تھے ۔ ایسا ہی موسم تھا ۔ اُسے یاد کہاں ۔ وہ شاید چھ سات برس کی ننھی
سی بچی تھی ۔ لیکن ذہن کے تاریک خانوں میں دریا سے جہلم میں باڑہ کرنے کے خطوط
مٹ نہ پائے تھے ۔ جہلم میں یوں تو ہر سال باڑہ آیا کرتی تھی اور لوگ جہلم میں
باڑہ آنے کے تصور سے ایسے مانوس تھے جیسے موسم بہار سے ۔ اور لوگ
یہ بھی جانتے تھے کہ ہر سال باڑہ مویشی بہا لے جاتی ہے ، گاؤں کے کچے کچے مکان
ٹھکانے ہیں ، اور فصلوں پر بھگاڑو پھیر جاتی ہے ۔ بال مویشی اور فصل پاتے
بچاتے کچھ لوگ بھی بہہ جاتے تھے ۔ اُن سے وابستہ امیدیں بھی بہہ جاتی تھیں ۔ کچھ
دن اُن کو یاد کر کے ردیا بھی جاتا تھا ۔ اُن کے لواحقین سے ہمہ دم بھی جتنا جانتی تھی
لیکن باڑہ اترنے کے ساتھ وہ لوگ بھی ذہنوں سے اتر جاتے تھے ۔ یادوں کے
دیرانوں پر نئی امیدیں لگنے لگتی ۔ لوگ پھر سے لوٹ کر بلے کے ڈھیروں کو ٹھہرا کر
لگتے ۔ گھر بسنے لگتے ۔ زندگی بھر سے موت پر چھانے لگتی تھی ۔ باڑہ کی پیٹھ
میں آئے انسانوں کی جگہ نئے انسان ابھرتے ۔ اُن سے نئے رشتے ہو جاتے
بھی کچھ ہوتے یا یہی کچھ تو ہوتا رہتا ہے ۔ لیکن اُس کی ننھی سی زندگی میں کوئی
نیا باپ نہ ابھر پایا تھا ۔ اُس کی ماں نے کسی بچے انسان کو موقع نہ دیا ، اس لئے
شاید باپ کے غم و خال یا دداشت سے میٹھا جالے کے بازوؤں اُس کے ذہن
نے ایک خیالی باپ کو جنم دیا تھا ۔ جو بہت اچھا تھا ۔ ہر وقت لادو پیار کرنے والا ۔
فصل بے فصل سنگھاڑے لاکر دیئے شالا ۔ اور جو بڑا رشتہ کہنے پر بھی اُسے کبھی نہ

ڈانٹا جیسے اور باپ اپنے بچوں کو ڈانٹا کرتے تھے۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ باپ کی غیر موجودگی میں گھر کی حالت بالکل اتر ہو گئی تھی۔ کالی گلے تو ڈوب ہی چکی تھی۔ باقی مال مویشی یک گئے تھے۔ مکان کے سامنے بڑھوڑی بہت زمین جو تھی بیکار پڑی تھی۔ گھر کی چھت ٹوٹ کر گرنے کے قریب تھی۔ اور اسے منہ دندھیرے بارش ہونے کی پر واہ کئے بغیر درجہ بیل دیا تا پڑتا تھا تاکہ کچھ سنگھاڑے لکھ کر سکے اور ماں بیٹی پیٹ بھر سکیں۔

اُس کی حیرانی بجا تھی۔ اتنا کچھ دل کے ... گھر بار ... مال مویشی گاؤں والے اوردہ خود بھی ایک پتلی بے سہم لڑکی سوکھی مولی جیسی اُجھس کا نام کیوں بدل گیا کیوں نہ اس کا نام سوکھی ہو سکا آخر کیوں نہیں ؟ پگڈنڈی سنان تھی۔ اس کا شہر بھی کوئی تارا نہ تھا۔ بادلوں کی ڈیز بھرنے تاروں کو بھی ڈھک رکھا تھا۔ اندھیرا کافی گہرا تھا۔ عرف موصیہا رنگ کی لیکر مشرق میں نمودار ہونے لگی تھی۔ جس کی روشنی میں پھولی پگڈنڈی پر جمع ہوئے پانی کے گڑھوں سے پیریا کر چل سکتی تھی۔ پگڈنڈی کے دونوں طرف کیمت خالی تھے امد خالی کیمت خاموشی کی چادر اترے سے پڑے تھے۔ عرف اس اپنے پیروں کا چاپ اس بھیانک خاموشی میں ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔
— دفعتاً پھولی کو محسوس ہوا کہ نام کے متعلق سوچنے سے بے کلی نہیں گئی آج وہ بہت سویرے گھر سے نکل پڑی تھی۔ اُسکو اتنے سویرے نہ آنا چاہئے تھا کیا معلوم سرکنڈوں میں کون سے جانور پھپھے بیٹھے ہوں۔ گھاس پھوس میں کتنے سانپ بھینکارتے پھر رہے ہوں۔ سانپوں کا خیال آتے ہی وہ ڈر سے حقیر کرنے لگی اور اس کا پاؤں پانی کے ایک جڑے گڑھے میں گرتے گرتے بچا۔
کانہ سے پرکھی۔ رٹی کی لپٹ میں ایک دو گانٹھ اور بڑھلتے ہوئے

وہ سوچنے لگی کہ یہ اس کا تہ ذرا نہیں کہ بچہ پوچھنے سے پہلے گھر سے نکل پڑی رہی ہو۔
وہ سنگھاڑے لکھتے نہ کر سکتی تھی۔ کیونکہ اس کے پاس لاکٹیں بھرنے کے لئے
بھڑائی کوڑی نہ تھی۔ اور وہ بھر گارڈ لوگ ہرے رنگ کی کشتیوں میں دودھ کی
پروں پر گھومنا کرتے تھے۔ کشتیوں کا ہر رنگ۔ دودھ کی ہریالی میں بالکل نہ ابھرتا
تھا۔ حتیٰ کہ کشتیاں سر پر پہنچ جاتی تھیں اور سنگھاڑے لکھنے کرنے والوں
سے پوچھتا چھہ ہوتا کچھ بکے سنگھاڑوں کی شناخت ہوتی تھی۔ سنگھاڑے
تو بے جلتے تھے کہ کہیں ساری فصل ہی نہ اڑا لیا ہو۔ سنگھاڑوں کے تحفظ کے
لئے خاص ہدایت کی گئی تھی۔ بغیر لائسنس سنگھاڑے اکٹھا کرنا جرم تھا۔ قانون
کا احترام کرنے کے لئے گارڈیگوں کی فوج میدان میں جھونک دی گئی تھی۔ قانون
تورنے والوں کو پولیس کے حوالے کیا جاتا تھا۔ کچھ منچلوں نے احتجاج بھی کیا
کہ سبھی سنگھاڑے اکٹھے نہ کریں تو کھائیں گے کیا۔ لیکن حکومت نے یہ کہہ
کر ان کا منہ بند کر دیا تھا کہ تعمیری کام شروع ہوتے ہی لوگ مزدوری کریں۔ سرکار
سیلاب روکنے کے لئے بہت سارے اقدام لے رہی تھی۔

سرکار نے علاقہ کا نام بھی بدل دیا تھا۔ سن دور سے سن داہری... سونے
کا گھڑا..... سونے کا آئینہ یا سونے کا باغیچہ..... اوں ہوں.... کاش
اس کا نام بھی کوئی بدل دے!!

خدا بھانت ہے۔ سونا کب آگ آئے گا یہاں..... یہ آخری الفاظ
پھولی بڑبڑا اٹھی اور ساتھ ہی وہ مرد گئی..... چہار سو چھپائی خاموشی میں اسے
اپنی آواز بھیانک سی لگی۔

پھولی مزدوری کرتی — ماں کا اور ایتنا پیٹ بھڑا تھا۔ اب اس کی
بڑھتی ماں کو کہیاں بھی نہ بن رہی تھیں ماں سوکھ کر کاشا ہو گئی تھی اور بے حد

چہرہ چڑھی ہو گئی تھی۔ وقت پر کھانا بلاتا تھا تو دن بھر صلو اتیں سنانا مہتی۔ اور جو
 کہیں زیادہ غصے ہو جاتی تو اسکو مارے سے بھی گریز نہ کرتی۔ ایسے موقعوں
 پر پھولی کو اپنی حالت پر رونا آتا۔ یقین نہ آتا کہ یہ بوڑھی وصال اس کی مال ہو سکتی
 ہے۔ یہ وہی عورت ہو سکتی ہے جس نے اپنی اکاوتی چچی کی خاطر خاوند کے منے کے
 بعد دوسرا گھر نہ بسایا۔ اس بوڑھیا کے سو کھے پتھر میں وہی دل دھڑک رہا
 ہے۔ جس کی دھڑکن سمجھی اس کے لئے زخف تھی۔ اور پھولی کے جی میں آسنا کہ
 اس بوڑھی کے سوکھے پنجہ کو آٹھا کر جہلم میں پھینک دے۔ نہ کر کے تو اپنا
 کر کے کہ مار مار کر اس کی پٹی پڑی تو رٹ ڈلے۔ یہ بھی کوئی زندگی تھی کہ دن بھر
 کام کرتے کرتے مرد۔ اور رات بھر بوڑھیا کی گالیاں سننے رہے۔ لیکن ماں نہ
 ہونے کا احساس اسے بھیا نک گھرا یوں میں دھکیلنے لگتا۔ اور ایسے
 محسوس ہوتا جیسے وہ دریا میں نہاتے نہاتے دریا میں ڈبوئی لٹکائی ہو اور
 پانی کے اندر بہت زور اندر چلی گئی ہو۔ جہاں آنکھیں کھولنے کے باوجود کچھ
 دکھائی نہ دے بلکہ پانی بہت کو بہنے لگے۔ اور پانی کے سہانے کے باوجود
 تلی بے سارا بہتا ہے۔ وہ اندھا دھند ہاتھ پیر چلانے پر مجبور ہو جیسے تاکہ
 دریا کی کشتی گھریلوں میں سے ابھر پائے۔ دریا کی تہ پر بھرت گول گول سنگریز
 یا چھوٹی چھوٹی نازک سپیاں بھی اسے دم گھٹتی گھریلوں میں کچھ دیر اور رکھنے
 کی ترغیب نہ دیتی تھیں۔ جب کبھی اس کے ذہن میں ماں کی موت کا خیال پیدا
 ہوتا تو اس پر کچھ ایسی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ جیلا وہ اکیلی بے سارا۔
 اس دنیا میں۔ کیسے رہ پائے گی۔ سدا ان مکان میں رات بھر اکیلی سوئے
 گی گھات کے گھورا نہ ہیرے میں کس کی اکھڑکی سانس اس کو سہارا دے گی
 کوئی نہ تھا اس کا دھڑکیا کے بغیر اس بے رحم دنیا میں !

اس لئے وہ چپ چاپ بورصیا کی مار بہہ لیتی تھی۔ گالیاں سن لیتی تھی۔ اس کا بس چلتا تو وہ مزدوری کرنے بھی جاتی۔ پر مزدوری ملے بھی۔ سوکھی سوکھی کردار سی لڑکی کو بھلا کون کام دے۔ ایک ڈکری بھرٹی تو تھا دزن اس کا۔ چار دنا چار اسے ڈر جا کر خود سنگھاڑے اکٹھے کرنے پڑتے تھے۔ لاشنس نہ ہونے کی وجہ سے وہ منہ اندھیرے گاؤں سے نکل پڑتی تھی۔ جب کارڈ لوگ لمبائوں میں ڈبکے رہتے تھے۔ اور سورج طلوع ہونے سے پہلے پہلے وہ گھر لوٹ آتی تھی پہلے پہل اسے بہت تکلیف محسوس ہوتی تھی۔ رات کے اندھیروں میں بھٹکانا..... سہندے برف جیسے پانی کا بس اور سنگھاڑوں کی چیخیں..... زخمی ہتھیلیوں پر کڑوا تیل ملنے والا بھی کوئی نہیں تھا لیکن آہستہ آہستہ وہ اس زندگی سے مانوس ہو گئی۔ اب تو عادت سی ہو گئی تھی اسے منہ اندھیرے ڈر جانے کی اور وہ نہیں جانتی تھی کہ زندگی کی کوئی بھی حرکت جب عادت بن جاتی ہے تو اعتدال کی حدیں ٹوٹنے لگتی ہیں اور مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ بھلا سولہ برس کی لہڑی لڑکی کیا جانے ایسی باتیں۔

سرکندوں کی قطاریں گھٹی ہوتے لگیں اور دفعتاً میں کہرے کی لہریں اٹھنے لگیں۔ رات بارش ہوئی تھی۔ اس لئے سارے ڈر پر کہرے کے بادل ستر لارہے تھے۔ پھولی کو تسکین سی لی۔ کہرے کی وجہ سے وہ دنی سے ہلکا سا لگا ہوں سے ادھل رہے گی۔ اور بہت سارے سنگھاڑے اکٹھے کرنا لگی۔ پھر تو دفعتاً چار دن آنے کی ضرورت نہیں۔ دیسے سرے مال میلے اور انچہ گئے تھے۔ جو میں بھی پڑ گئی ہوں گی سر میں۔ دقت ملا تو وہ بال بھی دھو ڈالے اور آنگن میں دھوپ سینکتے سینکتے بکڑے ہی نکال دے گی۔ نہ بہت خوش ہوئی دیسے کھداری زمین میں بھی زخمی پسدا بازی تھی۔ آگے کچھ قدم پر کچھ شروع

ہونے والی تھی اور کچھ سے ذرا پرے در کے پانی کی سطح۔ پھولی نے دیکھا
چاروں طرف تیرے کے بادل اٹھلا رہے تھے۔ گھر بھر کے سنے اُس کے دن
میں آیا کہ کہیں نہ کچھ دیر لوگ گر کمرے کے سروانوں کو تاقی رہے۔ کمرے کی اپریں
ایسے اٹھلا رہی تھیں جیسے کسی پری کے بال زد کے دوش پر اٹھلا رہی ہوں
ویسے کچھ دیر سستا بھی بتی۔ وہ پیدل چار میل کے قریب چل کر آئی تھی۔

ٹانگوں میں ٹھنک اٹھ کر آئی تھی۔ لیکن دوسرے لمحے یہ سنہری خیال پیٹ میں
بڑھتے تدریک فلاں میں ڈوب گیا۔ اُس نے کندھے پر سے ردیوں کی پوٹی
اتار کر نزدیک ہی سر کٹے کی جڑ میں چھپا دی اور شلوار کو اوچھا کرتے ہوئے
اُدس کے بنید پانی کی طرف بڑھنے لگی۔ کمرے کی ایک دیز لہر سے بھونکنی اور
ننگی ٹانگوں میں جھرجھری سی پیدا ہوئی۔ وہ لوگ گئی۔ کمرے آج واقعی گھٹا
گھٹا۔ نگاہیں کچھ دھڑکتے تک ہی جا پاتی تھیں۔ کیا عزت تھی شلوار بھگولے
کی۔ جیسے شلوار ٹانگوں پر بڑی بڑی گتے تھی اور دایں جاتے وقت بھونکنی شلوار
میں کٹھن سے ٹانگیں اکڑ جانے کا خطرہ تھا۔ آج سردی تیز تھی۔ شلوار کو نکال
کر کسی سر کٹے پر رکھ دے۔ اور پانی میں بڑھتے بڑھتے وزن کو بتدریج
اوپر کرتی جائے تو شلوار بھیننے سے بچ جائے گی۔ فیصلہ کر کے اُس نے
چاروں اور نگاہیں دڑا لیں۔ کمرے کے بادل اُٹھے چلے آ رہے تھے۔ اُس
نے ایزار بندھ ڈھیل کرنا شروع کیا۔ پیٹ پر تھنڈے پانی کا لمس بُرا
محسوس ہوا۔ شلوار کو سر کٹے کی تہنیوں پر بھینک کر وہ آگے کو بڑھنے
لگی۔ کچھ گہری جوتی جاری تھی اور پاؤں چپ چپ سی آواز پیدا کر رہے تھے
وہ سرتک پانی میں تھی۔ پانی کی سطح کا زیر و بم اُس کے جسم کو برق طرح
سے کاٹ رہا تھا۔ لیکن وہ اپنے جسم سے بے نیاز سنگھڑے چمنے میں مصروف

اس کی انگلیاں پانی میں آگی گھاس پھوس میں ایسے چل رہی تھیں جیسے ماں کی انگلیاں بہت پہلے.... ٹوکریاں بٹنتے وقت چلا کرتی تھیں۔ ایک ہی وقت دونوں ہاتھوں سے سنگھاڑے ٹٹولنے کے لئے اُس نے پھرن کو کمر پہ گانٹھ دے کر روکا تھا تاکہ سنگھاڑے جمع کر سکے۔ اور پھرن کا جھول پُر ہو تا جا رہا تھا۔ انگلیاں ہنسنے لگیں تو سورج لکھنے تک وہ پھرن کے کئی جھول بھر سکتی تھی۔

ایکایک کہیں سے سرسراہٹ کی آواز سنائی دے گی۔ جیسے سرکنڈے آپس میں ٹکرا رہے ہوں۔ گھبرا کر اس نے چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں۔ گھسنے لڑنے کی وجہ سے کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ کمرے کے دبیز بادل دبیز پردوں کی طرح لہرائے تھے۔ شاید مرغابیاں ہوں۔ ڈر ڈرائل ہونے سے پہلے اُس نے ہری ٹوک اٹھنے کے دبیز پردوں میں اُچھوٹے دیکھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہری ٹوک اُچھوٹ کر کشتی کے سر کی شکل اختیار کر لے لگی۔ اُس نے بھاگتا چاہا۔ لیکن پیر کچھ طرین دھنسنے پڑے تھے۔ بے تحاشہ اُس کے ہاتھ پھرن کی گانٹھ کھونٹے کو بڑھ گئے۔ انگلیاں الجھ گئیں۔ کئی سنگھاڑے بھی انگلیوں میں چبھ گئے۔ اور سب تک نہ گانٹھ کھونٹے۔

کر پھرن کو آزاد کرتی ہری کشتی اس کے مر رہے آہنی۔ کشتی کے بیچ میں عبد السلام گارڈ چھوٹا تھا بھوت کی طرح بیٹھا دکھائی دیا۔ بھوت کا چہرہ کردہ ہنسی میں لپٹا پڑا تھا۔ آنکھوں میں وحشت کو اندری تھی۔ اور نہ کوئی اور بوجھوں کے سروں پر درندگی پر توتلی محسوس ہو رہی تھی۔ کچھ دُور کے ٹھنڈے پانی کا اثر..... کچھ شرم و جفا کا اثر، اور کچھ ان خوفناک آنکھوں کا سحر جیسے آنکھیں نہ تھیں بلکہ انگاروں کے ایتار تھے۔ پھولی بے سدھ سی ہو گئی۔

عبد السلام نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھرتے ہوئے سحر توڑ دیا۔
 "آج پھنس گئی نامچھلی جاں میں۔ روز بجل دے کر نکل جاتی تھی۔ آج

بھنس گئی مچھلی.....۔۔۔۔۔

”میں..... میں..... میں..... پھوٹی نہر چھپٹنے کی کوشش کی۔ لیکن
 پیرا کھڑی نہ پاتے تھے۔ جیسے ویر کی تہہ پر مچھلی کیچر نے جان بوجھ کر اس
 کے پاؤں جکڑ لئے ہوں۔ کانش دہ ایک قدم پیچھے ہٹ سکے۔ کاش عبداللہ
 کی آنکھیں ایک دفعہ..... صرف ایک دفعہ جھپک جائیں۔ کاش اس کی موچھیں
 یوں تھیں نہ رہیں..... یہ موچھیں کہاں تھیں۔ سر کنڈوں کی جھاڑیاں تھیں شاید
 - تو ذرا سر کنڈوں کی جھاڑیاں، جن میں پانی کے سانپ چھپے بیٹھے ہیں.....
 پانی کے سانپ..... پانی کے سانپ کچھ زیادہ زہریلے نہیں ہوتے..... بالکل
 زہریلے نہیں ہوتے..... زہریلے نہیں ہوں گے۔ یقیناً زہریلے نہیں ہوں گے
 اسے چاہئے ہمت کر کے پاؤں چھپے کو بڑھائے۔ پانی کے سانپ بالکل
 زہریلے نہیں ہوتے..... بالکل زہریلے نہیں ہوتے.....“

بھرم رکھنے کے لئے کچھ راشن آ بھی جاتا تھا تو پک چھپکنے میں ادا راشن کالے
 بازار کی بھینٹ ہو جاتا تھا یا بڑے انسروں کے کوارٹروں میں گم ہو جاتا تھا
 عام ملازم منہ تکتے رہ جاتے۔ اس پر طرہ یہ کہ چنگی والے ایک دانہ ادھر ادھر
 کرنے کی اجازت نہ دیتے تھے۔ حرامی کہیں کے۔ راتوں کو سیٹھ بنیوں کے
 ٹرک گزرتے رہتے تھے اور کوئی غریب اپنے کھانے کے لئے ایک پاؤ سیراناچ لیکر
 پکڑا جائے تو قانون بگھارنے کے لئے سبھی اس پر پل پڑتے تھے۔ اگر وہ خود
 اپنے دماغ سے کام نہ لے تو اس کی حالت بھی غیر ہو گئی ہوتی۔ شہر سے تھوڑا
 بہت ساگ سبزی منگا کر اپنے انسروں کی نذر کرنے سے اس کی بہت ساری
 مشکلیں حل ہو گئی تھیں۔ اس کی بیوی دفتر کی بجائے دلیر پر لگا دی گئی تھی۔ جہاں
 روز کوئی نہ کوئی سنگھارے چوری کرتے پکڑا جاتا تھا۔ اور روز کچھ نہ کچھ مل
 جاتا تھا۔ لیکن اس میں بالوں کا حصہ، اکوٹھٹ کا حصہ، ہسیا لکڑک کا
 حصہ، حتیٰ کہ دفتر کے چپڑاسیوں کا حصہ بھی انگ کرنا پڑتا تھا۔ چوری کے مال
 پہرہ ایک کی حیثیت ایک بلا رکھتی۔ ورنہ اکیلا تو وہ ہمارے بن گیا ہوتا۔ یہ سونہ
 وادی نہ تھی بلکہ بہنم کی سرزمین تھی، نہ اُٹھ کرنے کا، اجازت اور نہ فریاد کرنے
 کی اجازت۔ اور کام کا یہ حال کہ گھر جانے کی بھی اجازت نہ تھی۔ اب کوئی
 بیوی بچے لانا چاہے تو اس کی بھی اجازت نہیں۔ حکومت کا خیال تھا کہ بیوی بچوں
 میں رہ کر ملازمین مستعدی سے کام میں جتے نہیں رہینگے۔۔۔ یہ سالی حکومت

.....
 کئی جہیزے پڑ گئے تھے اسے یہاں آئے ہوئے اور بیوی بچوں کی یاد نے
 اسے بے کل کر دیا تھا۔ ساری رات کر دہیں بدلتے گزرتی تھی اور بدن میں
 عجیب سی گھٹن رہتی رہتی تھی۔ اس گھٹن کو کم کرنے کے لئے کشتی چلانے کے سوا

عبدالسلام ایسے ہی کسی موقع کا منتظر تھا۔ تب سے جب اُس
 نے پہلی بار سرکٹے کی آڑ سے پھوٹی کوبے حجابانہ سنگھاڑے چوری کرتے
 ہوئے دیکھ لیا تھا۔ شاید عہدِ پہلے کی بات تھی یا شاید کئی عہدِ پہلے کی بات
 تھی۔ اِس جگہ آ کر وقت کا احساس بھی مرنے لگا تھا۔ لیکن اُسے یاد تھا
 کہ اُس دن صبح عین جب وہ کشتی میں بیٹھ کر ڈلر کی طرف چل پڑا تھا۔ دلر
 رات کی لمبی خاموشی سے اُن کا ہلکی ہلکی کر دھیس لے رہا تھا۔ اور اِن ہلکی ہلکی
 کر دھولوں پر اُس کی کشتی ڈولتی جا رہی تھی۔ ہلکے ہلکے دھیرے دھیرے
 جیسے کوئی مجبور کسی عاشق کی گود میں ہولے ہولے ڈول رہا ہو۔ اور اُسے
 محسوس ہوا تھا کہ دلر کا سینہ نہیں ڈول رہا ہے۔ بلکہ اُس کی اپنی بیوی کا سینہ ڈولتا
 جا رہا ہے۔ جب وہ تنہا اور نیند سے بخود ہو کر اُس کے بازو پر سر رکھ کر غافل
 ہو جاتی تھی۔ کئی عہد سے ہو گئے تھے اُسے گھر چھوٹے ہوئے۔ سونہ داری تریلی
 کیا ہوئی تھی اُس کی تو جان پر بن آئی تھی۔ نہ رہنے کو مکان ملتا تھا اور نہ
 کھانے کو چادر نہ ہی بدن کی گرمی برقرار رکھنے کے لئے ایندھن۔ دن
 کو بھوکوں مرو، اور راتوں کو منجھد بستر میں اکیلے ٹھٹھرتے رہو۔ یہ ٹھٹھک تھا
 کہ حکومت نے راشن اور بالن دینے کا انتظام کر دیا تھا۔ یہ بھی ٹھٹھک تھا کہ
 حکومت ایسا انتظام کرتی رہتی ہے۔ ورنہ حکومت کے کیا معنی۔ لیکن کافذی
 کا ردائی کو چھوڑ کر باقی کچھ نہ کر کے برابر تھا۔ اور جو بھی سمجھا حکومت کا

اُس کے پاس کچھ کام بھی نہ تھا۔ ایسے میں سرکنڈوں کے بیچ میں کوئی سنگھاڑے چوری کرتا ہوا پکڑا جائے، چنانچہ وہ گنوارن ہی کیوں نہ ہو تو ہوس پوری کرنے کی خواہش مچنے لگتی ہے۔ اس لئے چپو سے توار کا کام لے کر اُس کی کشتی میں قوس بناتی ہوئی سرکنڈوں کے بیچ سے گزر گئی۔ سامنے کوئی لڑکی مجسم اُس کی بیوی سنگھاڑے اکٹھا کر رہی تھی۔ بے ہنگم لڑکی نزدیک آ کر اُس کی بیوی کے بالکل برعکس نکلی۔ پتی اور پتی تلی لڑکی کے چہرے پر ہلاک جا ذہیت تھی اور بدن پر چاندی کی چمک، رتھماں تھی۔ اُس کی آنکھیں چند مصیبتیں۔

لڑکی اُسکو سامنے پا کر بد کہلا گئی۔ وہ سنگھاڑے پھینک کر کنارے کی طرف بھاگ گئی۔ عبدالسلام بھی کچھ کم تیرتا تھا۔ اُس نے پانی میں چھلکا لگائی اور لڑکی کو پکڑ لیا۔ دونوں پانی میں غوطہ کھا گئے۔ اور جب دونوں ایک دوسرے کا سہارا لے کر اٹھے تو عبدالسلام کے بازوؤں میں لڑکی چھپی کی طرح کسمار ہی تھی۔ چپل رہی تھی۔

پانی بھٹکا تھا۔ دُور کی تہہ میں کیچڑ تھی اور اُن کی کشمکش سے کیچڑ پیل کر پانی کو گدلا۔ اُسے جاپی تھی۔ لیکن عبدالسلام دن سب چیزوں سے بے نیاز تھا۔ لڑکی کو بازوؤں میں چمکتا محسوس کر کے اُس کے سارے بدن میں تناؤ اُبھر آیا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ دنیا کو توڑ پھوڑ دے۔ کیچڑ کو روندنا مسلتا جائے۔ دُور کی تہوں کو چیرنا پھاڑنا پھرے۔ کچھ نہ کر سکے تو کم از کم اس لڑکی کو سینے سے اتنا لپٹالے اتنا لپٹالے کہ ساری لڑکی اُس کے جلتے سینے میں جذب ہو جائے۔ لیکن اُسے سمجھنا پڑا۔ آوازیں سن کر گاؤں کے لوگ ان کی طرف دوڑ رہے تھے۔ بمشکل اُس نے لڑکی کو اپنے آپ سے جدا کیا اور کنارے لے آیا۔ لوگ نزدیک آنے لگے تو عبدالسلام نے لڑکی کے بازو پر

اپنی گرفت ذرا ڈھیلی کر لی اور ڈانٹتے لگا۔

”لائسنس کہاں ہے تمہارا۔ جواب دو۔ کہاں ہے لائسنس!“
عبدالسلام کی آنکھوں میں رقصاں خواہشات تے لڑکی کو بڑی طرح سے جھنجھوڑ دیا تھا۔ اُس کے بدن میں ڈر کی تھر تھری رواں تھی اور بھیگے پڑے بدن سے بڑی طرح چپک گئے تھے۔ جیسے بدن پر کپڑے نہ ہوں بلکہ وہ تنگی کھڑی عبدالسلام کی آنکھوں کا مرکز ہو۔ وہ ہر کلامے لگی۔

”لائسنس..... لائسنس نہیں ہے.... لائسنس نہیں...!“

”لائسنس نہیں ہے.... ہوں....“ عبدالسلام کی جان میں جان آگئی۔ کہیں ہوتا لائسنس اس لڑکی کے پاس تو اس کشمکش کا انجام بُرا ہوتا۔ اُس نے اپنا بھیگا کوٹ نکالا۔ مارے ٹھنڈ کے دانت کلکٹارہے تھے۔ یہ تو ان ہی گنواروں کا دل گردہ تھا جو دن بھر اس رخ بستہ پانی میں دھوئے پھرتے تھے۔ کوٹ کی جیب میں رکھی سگریٹ کی ڈبیہ کا ستیا ناس ہو گیا تھا۔ اُس نے ڈبیا پھینک دی۔ ایک ماہی گیر نے ڈبیا اٹھائی اور اعتیاد سے بھیگے سگریٹ ڈبیہ سے نکالتے لگا۔ مسکھا کر شاہد پی لے۔ عبدالسلام کو اپنی جلد بازی پر افسوس ہوا۔ ذرا سی محنت سے سگریٹ استہمال کے قابل ہو جاتے۔ غلطی ہو گئی جو ڈبیہ پھینک دی تھی۔ اب واپس مانگنا اتنے سارے آدمیوں کے سامنے خود کو اُن کی نظر دس سے گرا دینا تھا.... بھکاری کہیں کے.... کچھ نوٹ بھی بھیگ گئے تھے۔ نوٹوں کو تہ بہ تہ جھلالتے ہوئے اُس نے لڑکی کو گھورا۔ ماہی گیر عبدالسلام کو جانتے تھے۔ اُس سے ڈرتے تھے۔ اس نے میر کوئی اپنی طنداری جتا رہا تھا۔ رائے دے رہا تھا اور پھٹولی پر ہنس رہا تھا۔

”ہیں کہتا ہوں گارڈ صاحب۔ اس کو لے چلو تھانے“
 ”لے چلنا پڑیگا۔ بھاگی عمار ہی تھی۔ وہ تو میں نے پانی میں تھپلا لگا کر
 پکڑ لیا ورنہ سرکنڈوں میں تماء ہو گئی ہوتی“
 عبدالسلام سہمی کرتے ہوئے بولا
 ”میں..... میں..... میں بھرچوری نہیں کروں گی۔۔۔ قسم اللہ کی اڑکی
 رونے لگی۔

لڑکی کوروتے دیکھ کر ماہی گیر نے جرات کی۔۔۔ جانے دیجئے صاحب
 ”..... کافی سزا ملی ہے۔ اب ایسی حرکت نہیں کریگی۔“
 ”شہ پاکر سب اڑکی کی طرف خداری کرنے پر آمادہ ہو گئے۔“ ہاں صاحب
 جانے دیجئے۔ صرف بوڑھی ماں ہے اس کی اور کوئی نہیں.....
 عبدالسلام چاہتا یہی تھا کہ لڑکی کو چھوڑ کر اس کے دل میں اپنے
 لئے جاگ پیدا کر لے۔ لیکن لوگوں کا شک دُور کرنے کے لئے اس نے ذرا سی ہن
 کی۔

• معافی مانگ لے۔ کان پکڑ کر کہہ پھر چوری نہیں کریگی!“
 لڑکی ڈر گئی۔ وہ کسی طور ان وحشتناک آنکھوں سے چھٹکارا پانا چاہتی
 تھی۔ تھانے کا نام سن کر وہ اور بھی ہلساں ہو گئی تھی۔ پولیس کی بے ضابطگیوں
 اور قلم و جبر کا گڑ۔۔۔ کبھی بچے کو علم تھا۔ اُس نے عبدالسلام کے رشتے
 کو ظاہر کرنے کی بجائے معافی مانگنے میں ہی اپنی خیریت سمجھی۔
 عبدالسلام کو اڑکی کے معافی مانگنے کا انداز بڑا پیارا لگا۔ سر جھکا
 دونوں ہاتھ جوڑ کے لڑکی پیارے ہوئے اُس کے سامنے جھک گئی۔ جھکنے
 کے سبب لڑکی کے پھرن میں جھوٹ سا آگیا۔ سینے کی دودھیا چمک.....

عبدالسلام کی آنکھوں کے سامنے مچل گئی۔ سردی کے بادِ جود اُس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے پھوٹ پڑے۔ دیکھتے دیکھتے یہ ننھنے ننھنے پسینے کے حیر قطرے ایک سے ایک بل کر اس کی خواہشات کا دھارا بن گئے۔ اور سندھ داوی کی دلدل میں اُس کی بے کیف زندگی کے لئے ایک نیا راستہ چیرنے لگے۔

اور کئی ہفتوں سے عبدالسلام کا معمول بن گیا تھا کہ موقع بے موقعہ ڈر آ جاتا۔ سرکنڈوں میں تاک لگائے بیٹھتا۔ نرکلوں میں چھپا جا چتا۔ ہر لڑکی سے کبھی مدد پھر نہ پوئی۔ جب کبھی سامنا ہوا بھی تو کوئی نہ کوئی اُس پاس تردد ہوا کرتا اور جب کوئی بھی اُس پاس نہ ہوا کرتا تو لڑکی اُس کی پہنچ سے فوری طور پر گرتی تھی۔ اوردہ اکیلے اکیلے ہی اپنی ناؤ میں بیٹھا دل موسس کر رہ جاتا تھا۔ لڑکی اُس سے بہت خائف ہو گئی تھی۔ نہ وہ دلدل آتی تھی اور نہ سنگھاڑے لکھا کرتی تھی۔ عبدالسلام نے سوچا کہ لڑکی سنگھاڑے لکھنے نہ آئے تو کھائے گی کیا۔ اُس نے لڑکی کے متعلق چھان بین کی۔ تب اُسے معلوم ہوا کہ اُس لڑکی کا نام پھوٹی ہے۔ اُس کی ایک بوڑھی ماں کے علاوہ کوئی بہن نہیں ہے۔ وہ دلدل آتی ہے۔ ضرور آتی ہے اور موقع بے موقعہ آ جاتی ہے۔ اس لئے عبدالسلام بھی موقع بے موقعہ ڈر آ جاتا تھا۔ کبھی طوفانی لہروں میں آتا اور کشتی طوب ڈوب جاتی۔ کبھی بھیاں تک سیاہ راتوں میں آ جاتا اور کشتی سرکنڈوں کی بھول بھلیوں میں جھٹک جھٹک جاتی۔ شام کے دھندلکے میں آ جاتا جب ڈوبتے سورج کی شعائیں دلدل کے پانی میں آگ سی لگا دیتی تھیں۔ اور کبھی سحر پھوٹنے سے پہلے دلدل کی خاموشی میں اپنے بے تراز چہرے سے اور کبھی پیدا کیا کرتا تھا۔ یہی ایک تلاش رہ گئی تھی اُس نے دیر نہ کی تھی کہ وہ

کہلا بھیجا کہ چھٹی لے کر چلے آؤ۔ دونوں بچے بابا کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔
 لیکن پھولی کی چال ڈھال۔ پھولی کے ہاتھ سکرانے کا انداز۔ پھولی کا
 چاندی جیسا رنگ۔ بیوی کی صورت پر چھاجاتا۔ اس کے ارادوں کو تحس
 نس کر کے بچوں کی ہر چھالیاں ذہن سے مٹا دیتا اور وہ دنیا یا نہا سے
 بے خبر دن رات دُسر کے سینے پر ٹوٹتا پھرتا تھا۔

پھولی کی گوری باہرہ عبد السلام کی گرفت میں جکڑی پڑی تھی، اور
 پھولی کمر تک پانی میں گھڑی، سہمی سہمی عبد السلام کو دیکھ رہی تھی۔ لمحہ بھوکے
 لیے عبد السلام کے دل میں رحم کی لکیری دوڑ گئی۔ پھولی بچا رہی۔ بہت
 ڈر رہی تھی۔ گھبراہٹ کے مارے اس کی آنکھیں پھیل رہی تھیں اور ہونٹوں
 کے کنارے خوف سے کپکپا رہے تھے۔ اُسے یوں نہ پیش آنا چاہیے۔ اُس
 کے گھر میں بیوی ہے۔ دو بچے ہیں۔ وہ پتیس برس کا ہو گیا ہے اور یہ لڑکی بہت
 چھوٹی ہے۔ اُسے واقعی یوں نہ پیش آنا چاہیے۔ لیکن دوسرے لمحے دُکرتے
 شفات پانی میں لڑکی کی نظر آتی ہوئی، تنگی رائیں۔ جو پانی کی حرکت سے ارتعاش
 کرتی ہوئی، سی محسوس ہو رہی تھیں جیسے لہراتی ہوئی، دودھ کی دو دھاریں۔
 یا بجلی کی لکیریں یقیناً بجلی کی لکیریں عبد السلام کے
 ذہن میں ہر جہے کوچاٹ گئیں اور اُس نے پھولی کو کشتی کی طرف کھینچنا
 شروع کر دیا۔ کشتی کے کھر درے کناروں کا لمس پھولی کے جسم کو کاٹ
 گیا۔ اُس کے ذہن کو جھنجھوٹ گیا۔ وہ ہوش میں آ گئی۔ ویسے اب عبد السلام
 کی خطرناک آنکھیں اُسے ایک ٹک نہ گھور رہی تھیں۔ جدوجہد کے بندھ
 آزاد ہو گئے۔ اُس کے حلق سے چغیں ابھر آئیں۔ اُس کے ہاتھ پیر چلے۔
 غصے اور نفرت کا ایک سمیٹا ٹک طوفان پھوٹ پڑا۔ جس کی تیزی سے
 کشتی اس بری طرح ڈولنے لگی کہ اب ڈوبی اب ڈوبی

کے طور پر سالوں میں سجاے جانے تھے۔ سنگھار دکنی لوکیں کان کے چسید میں بڑی
 آسانی سے گھس جایا کرتی تھیں۔ کیچڑ بھاگارا بنا کر ہندی کے بدلے تھیلیوں اور
 تلوؤں میں لگایا جاتا تھا۔ گھاس کی بنی رسیوں میں ٹنگے پھول بدین پر زیوروں میں
 منتقل ہو جاتے تھے اور دو گھنٹوں گھونگھٹ اکٹھا کرانے کی مشق کیا کرتی تھیں
 اور جو کہیں حقیقی بیاہ شادی پر ہندی لگانے کا موقع مل جاتا تو وہ ہاتھوں اور پیروں
 کو ہندی سے خوب لیرپ پوت کر سرخ مرچ بنا دیتی تھی۔ یہ رنگ ہیتوں جسا ہوتا تھا
 کبھی داؤ چل جاتا تو ہندی کی کٹوریاں پھپکا کے رکھ دی جاتی تھیں۔ تاکہ بعد میں لگانے
 کے کام آجائے۔ آج بھی شاید کسی کا بیاہ تھا۔ اُسے آج ضرور کچھ ہندی پھپکا کے رکھتی
 چلی پڑے بہت دنوں بعد کسی کا بیاہ ہو رہا تھا۔ درندہ اتنا غل غپاڑا نہ جتا چوک گئی تو ہندیوں
 ہندی لگانے کا موقع نہیں مل سکے گا۔ واقعی آج کسی کا بیاہ ہو گا۔ لیکن وہیں ہے کہاں
 ... کہیں ہندی کے کٹورے میں تو نہیں ڈوب گئی۔ ڈوب جائے اس کی بلا ہے۔ اُسے
 تو برات کا انتظار تھا۔ سہرا باندھ دیا۔ گھوڑے پر بڑھ کر آئیگا۔ اُسے سند پٹھا
 دیا جائیگا۔ براتیوں کی دعوت ہوگی۔ پر دو ہا شرم کے ماتے شاید کچھ نہ کھا سکے
 بے چارہ دو ہا..... وہ خود دو ہا ہوتی تو پیٹ بھر کر دعوت کھاتی۔ اور گھوڑے
 پر بھی نہ چڑھ آتی۔ کہیں گھوڑا انتبازیوں سے بھڑک اُٹھے اور گر ادے تو ہاتھ پیری
 ٹوٹ جائیں۔ کال کالے کی تو اور بات ہے۔ اب تو وہ بھی نہ رہی اس لئے گھوڑے پر
 ضرور بیٹھ پڑیگا۔ باز آئی وہ نہ ہا بنے سے۔ وہیں غنا ہی اچھا ہے گا۔ زیور
 اور اسے کپڑے تو لیں گے پیٹھ کو۔ وہیں کے کپڑے پہن کر تو وہ شہزادی بن
 جائے گی۔ شہزادہ دہریا ہو جائے گی۔ مولوی بی آئیں گے۔ صلاح پڑھیں گے
 اُس سے اقرار کر لیں گے۔ بھلا وہ ہا کانا ہو یا لکڑا ہو تو اترا کیسے کہے
 گا۔ انکار بھی نہ کر سکے گا۔ سارے براتی اُس کو نوچ کے رکھ دیں گے۔

سی ہو گئی۔ اُس کے بازو میں تھکن کیوں پیدا ہوئی۔ اور یہ بازو جو سانس لہرا رہا تھا۔ کہاں سے آیا۔ یہ تو کیلی سوکھی انگلیاں جن کے ناخن سیکڑ کر ہنسنے لگے دبے گئے ہیں۔ اُس نے اپنا ہاتھ لہراتے بازو کو قلمباز کرنے کے لئے بڑھایا۔ دوسرے بازو میں بھی تھکن کی لہر رواں ہو گئی۔ درد کی شدت اتنے اُسے ایک بار پھر آنکھیں میچنے پر مجبور کیا اور تب اُسے محسوس ہوا کہ یہ بازو اُس کے اپنے بازو ہیں۔ ان تو کیلی سوکھی انگلیوں سے وہ شگھاڑے اکٹھے کرتی ہے۔ پر یہ تھکن کیوں۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔ یہ درد کیسا۔ ابھی تو اُس کی انگلیاں کسی شگھاڑے کو چھو نہ گئیں۔ نہ ہی ڈمیر سارے شگھاڑے اُس کے بازوؤں میں جھول گئے۔ تو پھر یہ تھکن کیسی۔ اُس نے آنکھوں کو پھر سے کھلنے پر مجبور کر دیا۔ چاروں طرف دھند کے مرغوعے پرداز میں محو تھے۔ نفی نفی دھویں کی لکیریں۔۔۔۔۔ معننی لکیریں۔۔۔۔۔ کہیں کہیں بیچ اور دم۔۔۔۔۔ جتنے بگڑتے قوس۔۔۔۔۔ وہ ہکھورا ناچنے لگا اور ناچتے ناچتے کھنور بن گیا۔ "چھو۔۔۔۔۔" کھنور ٹوٹ گیا۔ بکھر گیا۔ اور اُس کی سانس تیر کی طرح دھند کے مرغوعوں میں گھسٹی چلی گئی۔ اور گرد دھند کے بادل پر نشان ہونے لگے۔ بازو تھکن سے سینے پر گر گئے۔ صرف اُس کی سانس دھند کے دبیز جلد کو جھٹلانے لگی۔ توڑنے لگی۔

۔۔۔۔۔ اُسے اپنی پیٹھ پر نہی کا ہلکا سا اتھاس ہو گیا۔ شاید وہ پانی میں ڈوب گئی ہے۔ پیٹھ ٹھنڈے مارے بے حس ہوئی

شاید مٹھنڈ کا اثر تھا پر کان کی لویں دھکتی آگئیں۔ کیکپاتے
 ہاتھ رنگھاڑے کے ڈھیر کی طرف بڑھے اور دلیں
 ڈر اُکھر رہا تھا کہ اُس کے ہاتھ رنگین رومال سے
 نہ چھو جائیں۔۔۔۔۔ نہ چھو جائیں۔

سوما دتی سویرے سے پریشان تھی ساڑھی ل
 چیر، سینڈل، پوڈر کریم اور کپڑے کمرے کے فرش پر۔
 چاروں طرف بکھرے پڑے تھے اور بکھرے کپڑوں کے
 سج سوما دتی میلی کھلی ساڑھی میں لبوس اکٹوں بیٹھی
 تھی۔ بدن ٹھنڈ کے مارے ٹھٹھڑ رہا تھا۔ اُس نے پتی
 کو کہی بار ڈانٹا تھا کہ کھڑکی بند کر دے لیکن دینا نا تھا
 بیوی کی ڈانٹ پٹکار سے بے نیاز کھڑکی کے پٹ کھول کے
 بارش کو بڑے انہماک سے دیکھنے جانے میں مصروف تھا
 سردی کے تند چھوٹے کمرے کا طواف کرتے پھر رہے تھے
 اور سوما دتی کے جسم میں سویاں سی چھوٹے پھر رہے تھے
 سوما دتی کا جی حسب معمول پتی سے لڑ پڑنے کو چاہتا تھا۔
 لیکن آج اُس کی زبان گنگ تھی۔ ڈر تھا کہ پتی ناراض ہو
 گیا تو سب کچھ دھڑے پر پانی پھر جائے گا۔ دینا نا تھا اُسے
 اپنے ساتھ لے جانے پر بڑی مشکل سے راضی ہو گیا تھا۔

دیر اور ایسے سیٹھے رہے گی۔ تو ٹھنڈے کے مارے
وہ خود بھی ہٹکانے لگے گی۔ اُس نے پتی کی طرف
دیکھا۔ دینا ناٹھ بدستور بارش کے قطروں
کو دیکھنے میں مصروف تھا۔ دیکھنے کے انداز میں
غیر قدرتی انہماک عیاں تھا۔ شاید جان بوجھ کر
آنکھیں پھیرے بیٹھا تھا۔ وہ اور برداشت نہ
کر سکی۔

”اب کھڑکی تو بند کر دو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کوئی
سمجھے گا بارش دیکھی نہیں ہے کبھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔“
کہتے کہتے اُس کے دانت کٹکٹانے لگے۔

”تو میں کیا کر دوں۔ تمہیں کنگھی چوٹی سے
فرست رہی نہیں تھی اور دیر ہو رہی ہے۔
میری! تو یہیں رہ جاؤ“ دینا ناٹھ نے منہ پھیرے
بغیر جواب دیا۔ کچھ دلوں سے اُسے سوا دتی اچھی
نہ لگتی تھی۔ سوا دتی دبلی پتلی تھی۔ اس سے
اُبھرے پیٹ کی وجہ سے بڑی سجدی لگتی تھی۔
”تم تو یہی چاہتے ہو کہ میں اس گھر میں
سٹر سٹر کر مر جاؤں اور تم وہاں پاؤں پزارے
سو تے رہو“ سوا دتی کو چچی کے جواب
سے کھٹیس سی لگی۔

”تو پھر جلدی سے تیری ہو جاؤ۔ میں نے ٹھیکہ دار سے کل پہنچے کا وعدہ کیا تھا۔ تمہاری
ہربانی سے ایک دن کی دیر ہو گئی۔ میں نہیں جانے گی تو پھر دیجے کی بات سے جانا پڑے گا۔“

رات کے اندھیرے میں پہنچنے کے سواؤں ۹
 "تو تم ہی ہونا کچھ۔ کون سے کپڑے ساتھ لے جاؤں گی۔ میری سمجھ میں
 تو کچھ نہیں آتا۔"

واقعی سوما دتی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا وہ چاہتی تھی کہ ساری
 ساڑھیاں، شال، رجمیر ساتھ لے جائے۔ اس گھر میں آکر اسے باہر جانے کا بھی
 موقع ہی نہ ملا تھا۔ جو پہلے پہنانے کا موقع ملتا رہی تو چاہتا تھا کہ سب کپڑے آٹ
 ہی پہن لے۔ لیکن دینا ناتھ کی انجمن بڑھ رہی تھی۔ ایک دیر ان سے علاقے میں اتنے
 سارے کپڑوں کی ضرورت نہ تھی۔ ویسے اس کا دل چاہتا تھا کہ سوما دتی ساس سے
 سلاح لے۔ اب تو سوما دتی جا رہی تھی ساس کا دل بھی بہلا رہتا۔ اس نے شہہ دی۔
 "ماں سے پوچھنا کہ کون سے کپڑے لے جانے ہیں۔ عورتیں ان معاملوں میں مردوں
 سے بہتر رائے دے سکتی ہیں۔"

سوما دتی کو پتی کی بات بہت بُری لگی جیسے اس کی شادی سامنے بیٹھے پتی سے
 نہ ہوئی تھی، بلکہ بوڑھی ساس سے ہوئی تھی۔ وہ پھر بڑی۔

"تمہاری مالک کہا چاہتی ہے کہ میں بھی اور بہو بیٹیوں کی طرح ڈھنگ سے رہوں
 اس کا بس چلے تو چھٹروں میں پٹا رکھے مجھے۔ خود بیٹی کوئی سنی نہیں ہے۔ نا۔ اس لیے
 بیٹی کی قدر و قیمت معلوم نہیں۔" یہ حربہ سوما دتی کا پسندیدہ حربہ تھا۔ کئی بار اس
 نے اس حربے کو استعمال کر کے ساس کے منہ میں لگام دی تھی۔

دینا ناتھ کو بیوی کی زیادتی پر غصہ آگیا۔ سمجھا کون ماں ہوگی جو اپنے اسلمنے
 بیٹے کی بہو کو چھٹروں میں پٹا رکھے گی۔ سوما دتی سر اسر بہتتان تراش رہی تھی۔
 لڑنے پر آمادہ ہو گیا۔ بہہ دور سے رحمانی کو گھاٹ کی سیڑھیاں پڑھتے ہوئے
 دیکھ کر اس کو گزرتے لمحات کا احساس ہو گیا اس نے بات ختم کر دی۔

اچھا..... اچھا اب چپ بھی رہ رہیکم رہا ہے جو کپڑے جی
جاسے بے چل۔ دیر ہو رہی ہے۔“

— رحمان گھاٹ کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ پیٹھ پر لوٹی میں کچھ
بندھا ہوا پٹا تھا۔ جس کے بوجھ سے گھجکا گھجکا سا تھا۔ پاؤں میں پھیپھی چل سکتی
اور سر پر گولے کنارے والی مخصوص کشمیری ٹوپی اور ٹوپی کے کناروں سے ہلکے اربالوں
کے گچھے یا ہر جھانک رہے تھے۔ دنیا ناگھنے کئی بار سوچا تھا کہ چلن ٹوپی پہننا پھوٹ
وے تو گھنگھریالے بال اس کے چہرے کو ایک نئی جلالتش دیں گے۔ یہ نہ معلوم رحمان
کو اس ٹوپی سے کیا لاش تھا کہ لاکھ کہنے پر بھی نیگے سر نہ رہتا تھا۔ گوروز بال
تیل کنگھی سے سنوارا کرتا تھا۔ ویسے رحمان جس طبقے سے تعلق رکھتا تھا اس طبقے
میں ظاہری دیکھا داسرے سے ہی مفقود تھا۔ یہ سوٹی گھٹری خود رحمان کی ہیرے پر
کپڑے کے کوہان کی طرح لگ رہی تھی۔ اسی گھٹری میں رحمان کا سارا اثاثہ تھا کچھ
برتن۔ ہوں گے کنگھی آئینہ ہو گا۔ ایک آدمہ قمیص ہو گی اور بس..... جہاں
دل چاہا چلے گئے۔ جہاں رات آگئی سو گئے۔ نہ گھر گھسٹی کی فکر۔ نہ کھانے کھلانے
کا ڈر۔ نہ کوئی سوکھی کھائی اور سوچ آڑائی اور ایک وہ خود تھا کہ بیوی اور
ماں کے بچ ایسے پتلا رہتا تھا جیسے گیہوں پکی کے دو پاٹوں کے پیچ پستار ہوتا ہے۔
باپ کی ڈانٹ سے بھڑکا رہا سنے۔ ماں کی شکایت وہ سہلے اور جو بیوی نے دکھا
کنا سب سمجھ لیا تو ایک اور مصیبت۔ نہ ایک کے ساتھ تھے اور نہ دوسرے کے
ساتھ..... صرف وہ..... رحمان کی آواز نے اس کے

ذہن کو موقع پر لگام دی۔

”کیا بات ہے بھئی..... جانے کا ارادہ نہیں“
”جانا ہے بھئی..... جانا ہے۔ تم تا نگہ لے آؤ میں تب تک کپڑے

بدل لوں گا۔

ابھی تک کپڑے نہیں بدل پائے۔۔۔۔۔ تم تو کہتے تھے بس دس بجے روانہ ہو جاتی ہے۔

ابھی وقت ہے۔ تم تاں گھر تو لے آؤ، رحمان جانے لگا تو اسے یاد آیا تانگے تک سامان لے جانے کے لئے مزدور بھی لیتے آنا، رحمان لگا ہوں سے اچھل ہو گیا۔ تو اس نے بیوی کی طرف دیکھا، سوما دتی بڑی بے دلی سے ٹنک میں کپڑے سمیر رہی تھی، اس کا چہرہ اتنا سالگ رہا تھا دینا ناتھ کو رحم آگیا۔ سوما دتی سب کی ڈانٹ پھٹکار کی مرکز تھی۔ اور یہ ہونے کے ناطے کوئی اس کی سسٹنے پر تیار نہ تھا۔ جی چاہا۔ بیوی کو گد گدائے۔ اسے خوب ہنسٹے لیکن دروازے کی حرکت نے اس کی آرزو کو پورا نہ ہونے دیا۔ وہ سنہل کر بیٹھ گیا۔ ماں اندرائی پوچھنے لگی کہ ارد گرد کدھنگی کے آثار کتنے رہو کی طرف دیکھو بغیر اس نے کہا۔

کھانا پر دس رکھا ہے۔۔۔۔۔ کھا لو۔

اچھا مال۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ دینا ناتھ نے میدان چھوڑنے ہی میں اپنی غیریت سمجھی۔ کپڑوں کے معاملے میں ساس بہو کی جھڑپ یقینی تھی۔ اور تجربے نے اسے سکھایا تھا کہ ان بکھیڑوں سے جتنا دور رہا جائے اتنا اس کی صحت کے لئے اچھا ہے۔

کھانا کھا کر اس نے کپڑے تبدیل کئے۔ رحمان بھی تانگے کو سڑک پر کھڑا کر کے اطلاع دینے آیا۔ سوما دتی نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا۔ وہ بن سٹن کر منہ میچھلائے کسی سے کچھ کہے منے بغیر سڑک کی طرف چل دی دینا ناتھ نے ماں کی طرف دیکھا۔ ماں کا لگا ہوں میں نفرت اور طنز کی ہلکی گیس آسمان پر ابھری تھی۔ اور وہ جل ہی تو گیا۔ بیوی کی طرف نداری کرے تو ماں ناراض۔ ماں کی

طرفداری کرے تو بیوی ناراض۔ اور جو دور رہنے کی کوشش کرے تو دونوں ناراض۔ غصے میں آکر اس نے ماں باپ سے اجازت بھی نہ مانگی۔
 ”اے بھیڑیا رحمان۔ اُسٹھا ایک طرف سے ٹرنک اور دوسری طرف سے
 میں اٹھاتا ہوں۔ اس بارش میں کسی کو کیا پڑی ہے۔ کہ مزدوری کرنے
 لکل پڑے۔ وہ تو میں ہی ایک کر اے کاٹھو ہوں۔ جو دن رات کام میں جتا رہتا
 ہوں۔“

جانے سے پہلے رحمان نے دینا ناتھ کی ماں سے رسوا کہا۔ اچھا ماں
 جی۔۔۔۔۔ ہم چلے۔

دینا ناتھ کی ماں چاہتی تھی کہ دینا ناتھ بھی اُس سے کوئی
 بات کرے۔ بیٹے کے ایک لفظ کہنے پر وہ سب کچھ فراموش کر دینے پر
 تیار تھی۔ مخلص اب کس بیٹے کا منہ دیکھنے کو ملے۔ لیکن دینا ناتھ کے رویے
 نے اسے ٹھیس پہنچائی اور وہ منہ سپھر کر رسوائی میں گھس گئی۔ جس لئے بیٹے کو تو
 ہیبت پیٹ میں سنبھالا تھا۔ اُسے پیدا کیا تھا۔ بالاپو سا تھا۔ اُس سے بیٹا بات
 کرنی گوارا نہ کرے تو ماں کو کیا پڑی ہے کس بیٹے کے پیچھے دیوانی ہوتی پھرے۔
 ناحق مانتا پھوٹ پڑ رہی تھی اُس کے سوکھے پسینے سے اس سے تو مردہ ہی بہتر ہیں
 جن کو ان پیزوں کی فکر ہی نہیں۔ باپ بیٹے سے ناراض ہے تو کرے میں بیٹھا تھا
 گر گڑا رہا ہے۔ نہ کوئی ظلم نہ کوئی فکر۔ جب کھجواں نے عورت کو اتنی مشکلیں سہنے
 کے لئے پیدا کیا ہے تو دل بھی کھٹور بنایا ہوتا ہے۔“

بس تیار کھڑی تھی رحمان سامان کو بس کی چھت پر رکھولنے
 کے لئے کلینر کا ہاتھ پٹانے لگا۔ دینا ناتھ کرایہ ادا کر کے ٹکٹ لے آیا تو سوماوتی
 کو کھڑی کے دروازے کے پاس کھڑا پایا بس بھری پڑی تھی عورت ذات کا

دراستہ دے کر اس نے بڑی مشکل سے ایک سیٹ حاصل کرنی۔ سماوتی کو اس میں کٹھنوس دیا اور خود سیٹ کے دستے پر بیٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ پتی کے چہرے پر بدستور زکھایں دیکھ کر سماوتی نے خود ہی بات بھیڑ دی۔ زندگی کا سفر تھا۔ وہ پہلا قدم سٹپ کیا۔ ڈھنگ سے بڑھا نا چاہتی تھی۔

”کتنا کہ ایہ لیا گاڑی والوں نے۔۔۔۔۔“

تین ٹکٹوں کے تین روپے اور سامان کا ایک روپیہ..... دینا نا تھ
تے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے جواب دیا، اُسے سگریٹ کی طلب محسوس ہو رہی
تھی۔

”تم تو کہتے تھے ایک سواری کے بارہ آنے لیتے ہیں۔۔۔۔۔“
 ”گو رننٹ ریٹ تو بارہ آنے ہے۔ لیکن پرائیویٹ بس والے سواریاں
 زیادہ دیکھ کر کراہ بڑھا سیتے ہیں۔“

”اور حکومت کچھ نہیں کہتی۔۔۔۔۔“ سوادتی سرے کہنے کی دہر تھی کہ
 ارد گرد بیٹھے دو چار آدمی بول اٹھے۔
 ”حکومت نے بی نوکھی بیٹھی دے رکھی ہے۔ حکومت کیا ہے۔۔۔۔۔“
 ننگوں اچکوں کی جماعت ہے۔“

سوماوتی کو کمرائے کی اتنی فکر نہ تھی جتنی اپنے بچے کو سنانے کی۔ اور
لوگوں کو بیچ میں پوتے دیکھ کر افسوس تے بات بدل دی۔
”جرمان کا کسایہ بھی دیا تم نے۔۔۔۔۔“

ہاں۔۔۔۔۔" دینا ناسخہ نے بے خیالی میں جواب دیا اور عمان لین کے اندر نہ آیا تھا۔ اور اُس کی سگریٹ کی طلب بڑھتی جا رہی تھی۔

"کیوں" سو ماوتی کے کہنے کا کچھ ایسا انداز تھا۔ جیسے اُس کے پتہ سے

عبدالسلام بند دوکان کے چھجے پر لوئی اوٹھے ایسے سیٹھا تھا جیسے اپنے آپ کو لوئی میں چھپانا چاہتا ہو۔ بازار کی چہل پہل سے بے نیاز وہ ہر آنے جانے والے کو ہانپنا پر کھنڈا ٹھنڈے کے باوجود اُس کا بدن پینے سے تر ہو گیا تھا۔ ذہن میں اُگ دھک رہی تھی۔ اور انگ انگ خوف سے جل رہا تھا۔ کہیں کوئی کھٹکا ہوتا تو وہ بری طرح سے چونک پڑتا اور اپنے آپ کو لوئی میں سکیڑنے کی ناکام کوشش کرنے لگتا۔ غرور سے تنی گردن آج ٹھکی تھی۔ رعب دار چہرہ بے رونق ہو گیا تھا۔ نکساہوں میں بیباکی کے بجائے لاچاری سمٹ آئی تھی۔ آج کوئی ماہی گیر عبدالسلام کو اس حالت میں دیکھتا تو اُسے ہرگز یقین نہ آتا کہ یہ وہی عبدالسلام کا رڈ ہے۔ جس کے نام سے سوئداری کے سارے ماہی گیر کھتر کھتر کانپا کرتے ہیں۔ ماہی گیر بھی شاید اُس کی اتنی گری حالت دیکھ کر ترس کھانے پر مجبور ہو جاتے۔

عبدالسلام بھی اپنی حالت سے انجان نہ تھا۔ اور یہ احساس بذات خود بے حد تکلیف دہ تھا۔ یہ سوں اپنے بدن کو کسرت کے بل بوتے پر اپنی سوچوں کو پال پال کے اپنی آواز کو کرجت اور گرجدار بنا کر اُس نے جو شخصیت بنائی تھی۔ وہ اس ذرا سی لفزش سے کہیں خاک میں نہ مل

جلے۔ کہیں کھولی کھاؤں پہنچ گئی۔ اور راز افشا ہو گیا۔ تو کیا ہو گا۔ کہیں جان
 ہی سے نہ ہاتھ دھونا پڑے۔ سنا ہے یہ ظالم ماہی گیر دشمن کو ایک ہی وار
 میں ختم نہیں کرتے بلکہ کشتی کے سرے پر باندھ کر دریا میں گھسیٹتے پھرتے
 ہیں۔ اور جب آدمی ادھوا ہوا جاتا ہے۔ تو پانی سے باہر نکال کر ہوش میں
 لاتے ہیں۔ ہوش میں آتے ہی پھر اسے کشتی کے سرے سے باندھ کر دریا میں
 گھسیٹتے سمھرتے ہیں۔ حتیٰ کہ آدمی بے حال ہو کر جان دے دیتا ہے۔ آجکل
 پانی بہت ٹھنڈا ہے۔ پانی میں گرتے ہی اس کا بدن اکڑ جائے گا۔ آواز
 بھی حلق سے نکل نہ سکے گی۔ آف..... اسے پھر بھری سی آگئی۔

ایک پہلو بیٹھ بیٹھ ٹانگ اینٹھ گئی۔ لیکن ہل کر وہ لوگوں
 کی توجہ اپنا طرف نہ کھینچنا چاہتا تھا۔ وہ صرف یہ چاہتا تھا کہ کھولی کے
 کھاؤں پہنچنے سے پہلے پہلے وہ بس میں نکل سمجھا گئے۔ ہو سکتا تھا بعد میں
 اسے لو کر سی سے ہاتھ دھونے پڑیں یا شاید جیل بھی جانا پڑے۔ لیکن
 جان تو بچ جائے گی۔ جان ہے تو جہان ہے۔ اس کا بس چلے تو پیدل نکل
 چلے یہاں سے۔ لیکن راز افشا ہو گیا تو کھاؤں والے چاروں کھونٹ
 اسے ڈھونڈنے نکلیں گے۔ اور کسی کو گمان نہ ہو گا۔ کہ وہ اسی کھاؤں
 میں چھپا بیٹھا ہے۔ ٹھیک ہے۔ اسے نہیں بیٹھ کر بس کا انتظار کرنا چاہیے
 کھولی اتنی جلدی کھاؤں نہیں پہنچ جائے گی۔ ہوش میں آئے ہیں دیر لگ جائے
 گی۔ کاش وہ یوں نہ گھبرا جاتا۔ گوارا رٹ سے ہوا تھک پڑے نہ یہی کھانڈی
 تو لے آتا۔ شیلوار کے پائینچے ابھی تک دم تھے۔ کھاڑی آگئی تو سمجھ گیا شیلوار
 کو چھپ چھپا کے رکھنا پڑے گا۔ شاید گول گول کی آواز آرہی ہے۔ یقیناً
 کھانڈی آرہی ہو گی۔ بس دیکھنے کے اشتیاق میں وہ بے تماشا آگے کو

بھکا اور دکان کے چھبے سے گرتے گرتے بچا۔
 بس اپنی مخصوص جگہ پر آکر رک گئی۔ سوار پاں اترنے لگیں۔

عبدالسلام بیتاب ہو کر چھبے پر سے لپک پڑا اور بس سے عکلی سوار یوں کی
 پردہ کئے بغیر بس میں گھسنے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔ کہاں تو بازار میں
 رکاوٹ کا آدمی ہی چلتا نظر آتا تھا اور کہاں بس آتے ہی شہر جانے والی
 سوار یوں کا غول اُسڈ آیا۔ پلک مچکتے ہی سارے بازار میں رونق آگئی
 بس شہر سے خبریں لاتی تھی۔ سبزی ترکاری لاتی تھی۔ اور کچھ نئے چہرے بھی گاؤں
 کی زندگی میں اہل سا پیدا کرتے تھے۔ ہر بس کی آمد پر پترانے سماج
 کی کچھ کرم خوردہ کڑیاں گر کر ٹوٹ جاتی تھیں۔

رحمان بشکل جم فخر سے بچ کر نکل آیا۔ کلیر چلا چلا کر لڑکوں کو بس پر بیٹا کرنے
 سے روک رہا تھا۔ اور بس سے عکلی سوار یوں کو باہر دھکیل رہا تھا۔ اور
 سوماتی سیٹ پر بدستور ناک سکوڑے بھی لطف اٹھا رہی تھی۔ لوگوں کا
 زور کچھ کم ہوا تو دینا نا تھ ڈرائیور اور کلیر کی مدد سے بیوی کو بس سے
 باہر لانے میں کامیاب ہو گیا۔ باہر آکر اس نے ایک لمبی سانس بھری کر د
 ویش کی جانب نکلا ہیں۔ اور عبدالسلام کو دیکھ کر ساری
 کوفت محسوس کیا۔ عبدالسلام اتنی بہت ساری مشکلیں حل کر سکتا تھا۔

عبدالسلام کسی کو اپنی طرف آتے دیکھ کر گھبرا گیا۔ لیکن
 دینا نا تھ کو پہنچا نتے ہی اس کا ڈر کچھ کچھ ذائل ہو گیا۔

ابو بھئی۔۔۔۔۔ کیا حال ہے۔ سونہ داری کا دنیا نا تھ کے

لہجے میں مخصوص طنز تھا جو شہر سے آتے ہی لوگ سونہ داری کے ذکر پر
 عموماً استعمال کرنے کے عادی ہو گئے تھے۔ جیسے سونہ داری کشمیر

دینا ناتھ سے عبد السلام کی حالت پھٹی نہ رہی۔ عید السلام کی سوچوں
میں آج وہ پہلی سی اٹھان نہ سکتی رہی عبد السلام کا ہاتھ حسب معمول
سوچوں کو مروڑنے کے لئے بڑھا تھا کہیں عبد السلام بیمار تو نہیں۔ دینا
ناتھ نے ہمدردی ظاہر کی۔

”کیا بات ہے۔ تم مجھے سمجھے سے ہو۔ طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری“
”طبیعت تو ٹھیک ہے“ عبد السلام نے بہانہ گڑھ لیا۔ ”گھر
سے خبر آئی ہے۔ بچے بیمار ہیں۔ اس لئے صبح صبح شہر جا رہا ہوں“

دینا ناتھ شش و پنج میں پڑ گیا۔ لانے کو تو وہ رحمان کو شہر سے لے آیا تھا
لیکن اس کے رہنے کے لئے جگہ حاصل کرنی مشکل تھی۔ مکان لاکھ کوشش
کرنے پر بھی نہ ملتا تھا۔ اور خود اس کے پاس صرف ایک کمرہ تھا۔ سوا دہائی
ساتھ کتنی ظاہر تھا کہ رحمان اس کے ہاں رہ نہ سکتا تھا۔ سوچا تھا
عبد السلام پاس ہی ایک مکان میں اکیلا رہتا ہے۔ کچھ دنوں کے لئے
رحمان کو وہیں رکھے گا۔ جب تک اور کوئی بندوبست ہو جاتا۔ لیکن
کیا معلوم عبد السلام اپنی غیر حاضری میں کسی درجنے بھی دے۔ بہر حال کوشش
تو کرتی تھی۔

”بھئی تمہاری تھوڑی سی مدد کی ضرورت تھی۔“ دینا ناتھ نے
ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ”وہن اتنا پریشان ہو گیا تھا کہ رسماً عبد السلام
کے بیمار بچوں سے ہمدردی بھی ظاہر نہ کی۔“

”کہو۔۔۔۔۔ کہو“ عبد السلام نے کہا۔ بس جانے میں ابھی کچھ دیر
تھی اور اکیلے بس میں بیٹھ رہنے کی اس میں اب سکت باقی نہ تھی۔
”بھائی تم تو جا رہے ہو۔ تمہارا کمرہ خالی ہے۔ اگر ہرگز نہ ہو تو“

میں ایسے ہی خدشات پیدا کر کے وہ غلطی کر بیٹھا تھا اور اپنا سامان بٹورے بغیر
 بس کے اڑے پہلا آیا تھا۔ اب کے اناج کے کچھ دانوں کی خاطر اُسے اتکار
 کرنے کی غلطی نہ کرتی چاہیے۔ گاؤں والوں نے حملہ کیا بھی تو دینا نا تنہا اُس
 کے سامان کا ڈروارہ ہو گا۔ ہنگامہ دہ جائے گا۔ تو سامان بٹوراجا سکتا ہے۔
 بڑی خوشی سے رہ سکتا ہے۔ نہ ہارا دوست۔ تم سے کیسے انکار کر
 سکتا ہوں۔ لو یہ کہنی۔ اور ہاں..... ذرا خیال رکھے۔“

”تم کوئی فکر نہ کرو۔ اپنا سامان سمجھ کر حفاظت کروں گا۔“

دینا نا تنہ کے کندھے سے جیسے بہت بڑا بوجھ سرک گیا۔

عبدالسلام چابی دینا نا تنہ کے حوالے کرتے کرتے رک
 گیا۔ اُسے یاد آیا کہ گورنمنٹ کی ناؤ بس اڈے کے پاس ہی گھاٹ سے
 بندھی ہے۔ یوں پھوڑ دے تو شاید بہہ جائے سمجھ تو ایک اور مصیبت نکلے
 بڑے کا خطرہ تھا۔ کیوں نہ وہ بھی دینا نا تنہ کے گلے باندھ دے۔

”بھئی تمہارا سامان ساتھ ہو گا۔ سرکاری ناؤ گھاٹ سے لگی ہے
 لے جاؤ اور وہاں کسی سگارڈ کے حوالے کرنا۔ ناؤ چلائی آئے گی اس بہاؤ
 میں۔“

دینا نا تنہ نے حامی بھر لی۔ رحمان کے ساتھ آنے سے اُس کی اپنی تقدیر
 کھل رہی تھی۔ سامان لے جانے کے روپے بچ جائیں گے۔ عبدالسلام ہاتھ
 ملا کر بس میں داخل ہو گیا۔ تو بس کی چھت سے کلینے آواز دی۔

”بابو جی یہ سامان ہے آپ کا..... اتارنا نہیں“ جب تک

دینا نا تنہ جواب دے رحمن یوں پڑا۔

”ہاں بھئی..... ہمارا ہی ہے۔“

کلینر نے دینا ناتھ کی اور دیکھا دینا ناتھ نیلے سوٹ میں بلوس کسی بابو کی طرح لگ رہا تھا۔ کلینر نے سپر رحمان کی طرف دیکھا۔ اُس کے لہجے میں خود بخود فرق اُبھر آیا تو اتار تے کیوں نہیں۔۔۔۔۔ کیا بابو جی خود اتار رہیں گے۔

کلینر کے لہجے پر رحمان نے کوئی دھیان نہ دیا۔ وہ گاڑی کی طرف بڑھا جہاں کلینر سامان اُلٹنے پلٹنے میں مصروف تھا لیکن کلینر کے لہجے نے سواماتی کے ذہن میں ایک نئی ترغیب کو جنم دیا۔ چشم زدنی ہیں رحمان کی نظر میں پتی کے دوست کی حیثیت سے گر کر نوکر کی حیثیت میں بدل گیا۔

گاڑی سے سامان اتار کر گھاٹ سے لگی کشتی تک سہ جانا تھا۔ قلی کو ڈھونڈھا گیا۔ گاؤں کے کچھ لوگ آمادہ ہو گئے۔ لیکن قلی دینا ناتھ کا سوٹ اور سواماتی کے سرسراتے کپڑے دیکھ کر کچھ قدم سامان لے جانے کے لئے آٹھ آنے مانگنے لگے۔

”دینا ناتھ نے بھت کی دو آنے ملیں گے۔“

”دو آنے بابو جی بہت کم ہیں۔ مزدوروں نے ہنسی اڑائی۔“

”اچھا بھئی چار آنے دوں گا۔۔۔۔۔ ایک پیسہ زیادہ نہیں۔“

دینا ناتھ نے مزدوروں کا تسخیر جھٹلانا چاہا۔ اس سے پہلے کہ مزدور

حالی سمجھ پیتے سواماتی نے جل کر کہا۔

”کسی مزدور کی ضرورت نہیں ہم سامان خود اٹھا بیٹے گے۔۔۔“

”بد تمیز کہیں گے۔“

دینا ناتھ پیس و پیش میں پڑ گیا۔ گو سامان کچھ زیادہ نہ تھا

دینا ناتھ کا مکان، ہاجن گاؤں سے ڈیڑ میل دور پاری بل میں تھا
 پاری بل بھی ہاجن گاؤں سے ہی منسلک سمجھا جاتا ہے۔ مکان گاؤں کے باہر
 واقع تھا۔ مکان کیا تھا۔ مٹی کی چار دیواری پر گھاس بھوس کی پھت ڈال
 دی گئی تھی۔ مکان میں صرف دو کمرے تھے۔ اور دونوں کمروں کے بیچ
 ایک تنگ راسہداری تھی جس کے آخری سرے سے سیڑھیاں کہیں اوپر
 جاتی تھیں۔ سوداقتی اپنے بیٹے میں پڑ گئی۔ باہر سے تو مکان صرف ایک مندر
 دکھائی دیتا تھا۔ سیڑھیاں کہاں جاتی ہوں گی۔ وہ غور نہ کر سکی۔ مکان
 کے آس پاس گندہ انگن دیکھ کر اس کا جی متلانے لگا۔ مکان کے چاروں
 طرف ناہوار زمین پر گوبر۔۔۔ گھاس بھوس کے ڈھیر بکھرے پڑے
 تھے۔ بارش نے انگن میں دلدل سی اُبھاری تھی۔ سوداقتی کی نئی سنہری
 اونچی ایڑھی کی سینڈل کی پٹ سے لت پت ہو گئی۔ کچھ تپڑ چل میں بھی
 گھس آئی تھی۔ اور بڑی بڑی لگ رہی تھی۔ پتی کا سہارا نہ ہوتا تو وہ
 کئی دفعہ گر گئی ہوتی۔ گاؤں کا عام تصور مثلاً گاؤں شہروں سے زیادہ
 صاف سمندرے ہوتے ہیں۔ مکانوں کے ارد گرد بڑے بڑے میدان
 ہوتے ہیں۔ میدانوں میں کھل پھول اُبلھاتے ہیں۔ ہوا پھولوں کی بھینی

دی اور وہ بے دلا سے رہا میں کمرے میں گھس گئی کہنے کے اندر تار کی سٹی
فضا میں دھوئیں کی کڑواہٹ تھی۔ وہ ڈر سی گئی۔ اندھیرے میں کسی
کی پوچھی آواز نے اُسے جلاسا دیا۔

”آ جاؤ بیٹی۔۔۔۔۔ اندر آ جاؤ۔ بالو جی سے روز کہتی تھی کہ
ہمیں کبھی گھر والی دکھاؤ۔“

کمرہ بے حد غلیظ تھا۔ ایک طرف چولہا تھا۔ جس میں انگارے
دہک رہے تھے۔ دوسری طرف گھاس کی کھڑدری پٹائی بچھی تھی۔
پٹائی کے ایک طرف دو عورتیں پاس پاس بیٹھی تھیں۔ ایک عورت کی گود
میں بچہ تھا۔ بچے کا آنکھیں بہت نیلی تھیں۔ انگاروں کی روشنی میں کسی
درندے کا آنکھ کی طرح دہک رہی تھیں۔ اور بڑی ڈراؤنی محسوس
ہو رہی تھیں۔ سو ماؤتی کو نیلی آنکھیں بہت پسند تھیں۔ لیکن اس ماحول
میں نیلی آنکھیں دیکھ کر اُسے نیلی آنکھوں سے نفرت سی ہو گئی۔ صبح صبح
اٹھ کر دعائیں مانگتا کہ اُس کے اپنے بچے کی آنکھیں نیلی ہوں۔ بددعا
سی لگیں۔ بچے سے زبردستی نکالیں ہٹا کہ اس نے کمرے کے باقی حصے
کا جائزہ لیا۔ سارے کمرے میں گھاس بھوس بکھرا پڑا تھا۔ کہیں کوئی
پھٹا چیترا بھی گھاس بھوس میں اضافہ کر رہا تھا۔ سو ماؤتی کو
عجیب سا لگا۔ ہر کپڑے کا رنگ کالا تھا۔ شاید اس کاؤں میں گالے
رنگ کا رواج تھا۔ لیکن غور سے دیکھنے پر پتہ چلا کہ کپڑے کانے
نہ تھے۔ بلکہ میل نے سارے کپڑوں کو رنگ دیا تھا۔ گندے لوگ
۔۔۔۔۔ کمرے میں ایک بھی کھڑکی نہ تھی صرف دیوار کے ایک کونے
میں پھوٹا سا چھید تھا۔ شند ان تھا۔ جس میں ٹپکے جا رہے، کالک

میں لٹھڑے ہوئے کالے ساتپوں کی طرح لشک رہے تھے۔ کمرے
 کافر شہجھوٹے چھوٹے گڑھوں سے پُر تھا۔ کوئی کوئی گڑھ پانی
 سے پُر دکھائی دے رہا تھا۔ شاید بچے کا پیشاب تھا۔ احمد نے
 سوالیہ نگاہوں سے پوچھا کیا کی طرف دیکھا۔ پوچھا ساہنے
 رکھے پیارے میں سے اپنے آٹے جیسی کوئی چیز انگلیوں سے نکال
 نکال کر چاٹ رہی تھی۔ سارا ہاتھ لٹھڑ گیا تھا۔ سوما واتی اور
 زیادہ برداشت نہ کر سکی۔ اُسے اُبلائی آئی۔ وہ اندھا
 دھند کمرے سے باہر نکلی۔ راہداری کی دہلیز تک پہنچ نہ
 پائی تھی کہ قے شروع ہو گئی۔ دینا ناتھ بھی دوڑتا ہوا بیوی
 کو سہارا دینے کے لئے پہنچ گیا۔ خالی پیٹ اُبلکیوں سے سوما واتی
 کا بُرا حال ہو گیا۔ مالک مکان کی بیوی بھی دوڑی دوڑی مدد
 کے لئے آئی۔ لیکن دینا ناتھ کو بیوی کے پاس دیکھ کر دور
 ہی کھڑی رہی۔ سوما واتی کی آنکھوں میں آنسو ابل آئے۔ سالن
 ٹکڑک کے آ رہا تھا جیسے کوئی ٹکا دبا رہا ہو۔ بے حال ہو
 کر وہ پتی پر گر گئی۔ بچکیوں سے اُس کی گھگھی بندھ گئی۔ مالک
 مکان کی بیوی نے گہری نگاہوں سے سوما واتی کے صدمہ کا جائزہ لیا۔
 اور زاپس لوٹ کر پوچھا کیا سے کھسکے پھسکے کر نے لگی۔

رحمان گھاٹ سے سامان لے کر تپ پہنچا۔
 جب سوما واتی کچھ سنبھل گئی تھی اور اپنے کمرے میں کوئی اوڑھے
 چٹائی پر آرام کر رہی تھی۔ دینا ناتھ نے اسٹوڈ جلا کے قبوہ
 بنایا تھا۔ ایک پیالی قبوہ سوما واتی کے پیٹ میں جا چکا تھا اور

دینا ناسحقہ اصرار کر رہا تھا کہ دوسری پیالی بھی پی لے۔
 رحمان نے کہا "ہاں سہجائی۔ صبح کھانا بھی نہیں کھایا ہے
 پی لو دوسری پیالی۔ طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔"
 سومادتی کو گھر کی تلخ باتیں یاد دلانی اچھی نہ لگیں۔ اُس
 نے کہا۔ "نہیں نہیں۔ اب میں ٹھیک ہوں۔ ابھی کھانا پکاؤں گا
 تو کھاؤں گی۔" دینا ناسحقہ کو تسکین سی لی گئی کہاں تو وہ سمجھ رہا تھا
 کہ بیوی بیمار ہو گئی۔ اور نہ معلوم کتنے دن اُسے سہانا پڑے گا
 اور کہاں اب کھانا خود پکانے کے لائق ہے۔ اُس نے بیوی کو
 ہمت دلائی۔

"ٹھیک ہے۔ کھانا کھانا ہی اچھا رہے گا۔ تو برتن سنبھال
 میں پکڑنے کا بندوبست کرتا ہوں

"پانی کس سے منگا دو گے..... سومادتی نے پوچھا
 "مالک مکان سے۔ کمرہ لیتے وقت فیصلہ ہوا تھا کہ پانی
 وہی لایا کرے گا۔"

"نہیں..... نہیں..... سومادتی کو سمجھ سے اُبکائی سی
 آئی۔" میں ان گندے آدمیوں سے منگایا پانی استعمال نہیں
 کروں گی۔"

"اچھا بھئی اچھا۔ پر آہستہ تو بولو۔ یہ لوگ سنتے ہوں
 گے۔ کیا سمجھیں گے۔" دینا ناسحقہ نے غصے سے کہا۔
 "میں کوئی جھوٹا بول رہی ہوں جو آہستہ بولوں۔ سومادتی
 نے لہجے نے ثابت کرنا چاہا کہ اس گھر کی مالک وہ رہے گی۔"

سوداوتی منہ چھلا کر خاموش رہی لیکن دینا نا تھا سے نہ رہا گیا نہیں
بھئی رچھاں میں ہتھیں پانی ہتھیں لانے دوں گا۔ تم کیا میرے نوکر
ہو؟

لیکن رحمان ایک نہ مانا۔ اُس نے مٹی کے گھڑے کو اٹھا یا اور
باہر نکل آیا۔ آہٹ مرتے ہی دینا نا تھا بیوی پر برس
پڑا۔

”دیکھو ذرا سی بات کہاں پہنچا دی تم نے رحمان کو پانی
لانا پڑا۔ سب تمہاری جھجکت سے ہوا۔“

”نو کیا بُرا ہوا۔ ایک گھڑا پانی لانے سے رحمان تھک تو نہیں
جائے گا۔ سوداوتی دینے والی نہیں سکتی“ ان لوگوں کو
ایسے کاموں کی عادت ہے۔

”نو تم میرے دوستوں کو اپنا نوکر سمجھتی ہو۔۔۔ دینا نا تھا
دھاڑا۔“

”ان پڑھ جاہل ہانچی منہارے دوست ہوں تو میرا کیا قصور؟
سوداوتی نے دھیرے سے کہا۔ ویسے وہ بڑی خوش ستمی کہ اُس کا
حربہ کا سیاب ہو رہا تھا۔ دینا نا تھا ایک ایک کو کسے ہتھیار ڈالتا
جا رہا تھا۔ لیکن دینا نا تھا کو بیوی کی سرگوشی سانپ کی پھنکار
سی محسوس ہوئی۔ جی چاہا ہاتھ اٹھا کے لڑا ایک دے مارے۔ وہ
مرگ گیا۔ پہلا دن تھا۔ پہلے ہی دن لوگ میاں بیوی میں جھگڑا
ہوتے دیکھ لیں تو اُس کے عزت کی دھجیاں اڑ جائیں گی۔ اس
لئے وہ خاموشی سے اٹھا اور بغیر کچھ کہے سننے کے سے باہر
نکل آیا۔“

غلام محمد بانڈے سنگار میز کے سامنے کرسی
 پر براجمان تھا۔ یوں تو سنگار دان کو کمرے کے کسی کنارے
 ہوتا چاہیے تھا لیکن کمرے کی کچی دیواروں میں پیوستہ دو
 چھوٹی چھوٹی کھڑکیوں سے بہت کم روشنی اندر آتی تھی۔
 غلام محمد بانڈے نے کبھی سوچا تھا کہ سنگار میز کو کھڑکی کے
 پاس رکھ دے۔ لیکن جس خاص کام کے لئے اس نے یہ
 سنگار میز شہر کے ایک کباڑیے سے خریدی تھی۔ وہ کھڑکی کے
 سامنے پورا نہ ہو سکتا تھا۔ کھڑکیوں کے سامنے راست تھا
 اور ہر آنے جانے والوں کی نگاہیں اسے دیکھ پائیں اور
 بات کا تبنگو بن جاتا۔ ویسے ہی کیا کم دکھ اٹھانے پڑے
 تھے اس کو نگاہوں والوں کے ہاتھوں سے۔ اس لئے کمرے
 میں بچھے نئے قالین کی پرواہ کئے بغیر اس نے سنگار میز کو
 کمرے کے وسط میں کھڑا کیا تھا۔ حتیٰ کہ قالین میں سہاری
 سنگار میز کے پایوں نے گھر سے ڈال دیئے تھے۔ ویسے

کی پٹیں۔ اس جھوٹی سی یوتل کی قیمت ساڑھے آٹھ روپے دیتے ہوئے وہ ہیکپا یا عزور ستھا لیکن خریدے بغیر چارہ بھی نہ ستھا۔

_____ کرے گا دروازہ بند ستھا دروازے کی گڈی پڑھی ہوئی سستی رہی بھی ہر آہٹ پر وہ چونک اٹھتا کہ کہیں کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے کوئی زمانہ ستھا جب وہ گاؤں کے چوراہے پر بیٹھ کر لوگوں سے بے پرواہ گنج پیر تیل کی مالش دن دھاڑے کیا کرتا ستھا اور دھوپ سیکا کرتا ستھا۔ لیکن جب سے اُس کا نام گاؤں کے ٹھیکہ داروں کے زمرے میں آیا ستھا تب سے یہ گنج اُس کے دل میں کھٹکنے لگا ستھا۔ اور اب تو یہ کھٹک تشویش کی حد کو چھونے لگی تھی۔ دہلی سے کچھ ماہر کام کا جائزہ لینے کے لئے آ رہے تھے۔ ظاہر ستھا ایسے موقوفوں پر اُسے خود موجود رہتا پڑے گا۔ تاکہ یہ ماہر سیسٹ میں بیجا ملاوٹ یا ناقص اینٹوں کی طرف دھیان نہ دے سکیں۔ روپے پیسے سے بات ٹل جاتی تو وہ بے دریغ خرچنے پر آمادہ ستھا۔ سونا داری کے کئی امیروں کی قیمت اُس کے سامنے ٹکوں میں چمک گئی تھی۔ لیکن کون جانے یہ ماہر کسی اور ہی مٹی کے بنے ہوں۔ اس لئے اُس سے دل میں ایک اسبابا سا خوف اسیر رہا ستھا۔ جس کو وہ اپنے شخصیت سے جھٹلانا چاہتا ستھا۔ ویسے اُس کی شخصیت کچھ کمزور ذات نہ تھی۔ بڑی بڑی آنکھیں، موٹے موٹے بازو، ہلکیا

سخت جسم۔ سجاری ٹیل ڈول۔ سر پر گپڑ رکھنے پر وہ پٹھان
 سا لگتا تھا۔ لیکن یہ سالانچ اس کی شخصیت پر ڈھال کی طرح
 چھایا ہوا تھا۔

مالش کرتے کرتے اُس کا ناخن کسی زخم کو کھینچ گیا۔ اور
 اس کی سوچ کو ٹھٹکا سا لگا۔ اسے محسوس ہوا۔ ٹھیکیدار بن کر
 رہن سہن کے ساتھ ساتھ اُس کی سوچ بھی بدل رہی ہے
 اب وہ خود سے بھی دھوکہ کر رہا ہے۔ جیسے ٹھیکیداری میں
 کرنا پڑتا ہے۔ اصل میں اُسے گنج سے پر خاش نہ ہونی چاہیے
 گنج کی بدولت ہی وہ اتنا بڑا آدمی بن گیا۔

————— جب سے وہ پیدا ہوا تھا۔ اُس کے گنج پر پھینچاں
 کسی جاتی تھیں۔ تھپتھپ اڑائے جاتے تھے۔ اُسے کوئی پاس
 بٹھانے کا بھی روادار نہ تھا۔ مجبوراً وہ سخت جان بن گیا۔
 کسی نے پھینچی کس لی اور اُس نے لہا سچے جڑ دیا۔ کوئی ہنسنا تو
 وہ بھگدڑ پڑا۔ پورا گاؤں ایک طرف اور وہ ایک طرف کسی کی
 ہمت نہ تھی جو اُس سے ٹکے لیتا۔ کیا دن تھے وہ بھی۔ بے تاج بادشاہ
 تھا گاؤں کا۔ اُس کا لفظ قانون تھا۔ کہیں کوئی سید لگا تو انتقام
 اُس کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ کہیں کوئی شادی بیاہ ہوتا۔ تو وہ
 پیش پیش رہتا۔ حتیٰ کہ حکومت کو بھی اُس کی عزت محسوس
 ہوئی۔ وہ ٹھیکیدار بننا تو وہ گاؤں کا خدا بنتا جا رہا تھا
 جو لوگ پہلے نفرت کے مارے اُس کو اپنے پاس بٹھانے کے
 روادار نہ تھے۔ اب کچھ مکوں کی خاطر اُس کی خوشامد کرتے

سفا کہ وہ مالک کے سامنے ہے۔ اور مالک چاہے تو نوکری سے
برطرف کر سکتا ہے۔ اس لئے اُس کو مالک کے سامنے سگریٹ
بہنیں پینی چاہیے۔ لیکن کامیابی کی خوشی میں نشہ کی طلب بڑھ
گئی تھی۔ اس لئے اُس کا ہاتھ غیر ارادی طور پر اپنے کوٹ
کی جیب کی طرف بڑھنے لگا۔ ٹھیکہ دار نے اُس کے ارلے
کو سجا نہ لیا۔ دینا ہاتھ کی دیدہ ویری اُسے بالکل اچھی نہ
لگی۔ اُس نے حکم دیا۔

اب بیٹھے بیٹھے کیا کر رہے ہو۔ تین دن کے بعد آئے
ہو۔ جاؤ۔ ذرا کام کی سدد لو۔

دینا ہاتھ نے ٹھیکہ دار کے لمبے میں گھلی کڑوا ہٹ
محسوس کی۔ اور اُس نے کوئی پرواہ نہ کی۔ اپنا داد تو کامیاب
ہو گیا تھا۔ گتا۔۔۔۔۔ چلاتا ہے تو چلاتا رہے۔ اب مزید کتنا فضول
سفا۔ وہ خاموشی سے کھڑا ہو گیا۔ اور ہر جانے لگا۔ رحمن بے چارہ
اُس کا بے تابی سے انتظار کر رہا ہو گا۔

دینا ہاتھ کے جانے ہی ٹھیکہ دار کا چہرہ نفرت کی شدت
سے گھٹنا دانا ہو گیا۔ دروازہ بند کر کے اس نے کلاہ کو بے احتیاطی
سے سنگار میز پر پھینک دیا۔ دراز میں سے دوا کی بوتلی نکال لی۔
ہتھیلی پر تیل انڈیل دیا۔ اور گینچ پر زور زور سے الٹش کرتے
لگا۔ ہر رگڑ کے ساتھ منہ سے نکالی نکلتی گئی۔

تھراپی۔۔۔۔۔ سالانہ۔۔۔۔۔ کام چور۔۔۔۔۔ بدتمیز۔۔۔۔۔

رحمن چوہلے کے سامنے دو زانو بیٹھا چوہا جلد نے
 کی کوشش کر رہا تھا۔ لکڑیاں گیلی سٹیں۔ اوپے سختے نہیں اس
 لئے خالی لکڑیاں آگ نہیں پکڑ رہی سٹیں۔ گو چوہا پیو نکلتے
 پیو نکلتے اس کے سارے بدن میں آگ لگ چکی تھی۔ دھوئیں
 کے کڑوے مرغوں نے اس کے سینے میں جن پیدا کر دی
 تھی۔ گلا سوکھ گیا تھا۔ آنتوں ایسے گر رہے تھے جیسے آتش
 وہ بے دم ہو گیا۔ لیکن اس نے ہمت نہ ہاری۔ شاید اس
 لئے کہ لکڑیاں کبھی کبھی اس کے سانس کی تہذیب سے بھڑک
 اٹھیں۔ پر جوں ہی وہ دم سنبھالنے لگتا۔ آگ کی لپٹ لہرا
 کر دھوئیں میں تبدیل ہو جاتی۔ اور کمرے کے اندر پھیلے
 کڑوے دھوئیں کی دیر تہ میں اضافہ کرتی۔ کمرے میں اتنا
 دھواں بھر گیا تھا۔ کہ سامنے پڑا عبدالسلام کا لیٹا بسترا
 کونے میں رکھی مٹی کی بانڈیاں اور بانڈیوں سے ذرا اُدھر
 مٹی کے تیل کا چمکہ کنستہ بھی نہ دکھائی دیتا تھا۔ اس نے ٹپوں کو
 پانی کے گھڑے سے نکال کر پانی نکالا۔ چہرے اور آنکھ پر

کو لہو میں جوتا پھرے اس کو..... بوڑھا..... خبیث..... یکایک
 رجنی کو محسوس ہوا کہ باپ کے متعلق سوچنے سے نہ ہی اُس کی سبھوک کم ہوئی
 اور نہ ہی سینے کی جلن۔ اُسے چاہیے۔ ذہن کو لگام دے کر۔ چوبیس
 کی فکر کرے اور کچھ کھا پیا کر آرام سے سو جائے۔ صبح صوبیدے
 کام پر جانا سہیا۔

_____ اُس نے کمرے کے اندر جھانکا۔ دعوٰاں کچھ کم ہو
 چلا تھا۔ اور چو لہا بچھا پڑا تھا۔ غیر ارادی طور پر اُس کی نگاہیں
 مٹی کے تیل کے کنستریس ٹکرا گئیں۔ ذرا سا تیل چوبیس میں پھلنے
 سے لکڑیاں بھر دکا اٹھیں گی۔ اور وہ چائے بنا سکے گا۔ نہیں۔
 وہ چائے نہیں بنائے گا۔ چائے کا وقت تو گزر گیا تھا
 اب تو اُسے رات کا کھانا بنانا چاہیے۔ انتڑیاں سوکھ جا رہی
 تھیں۔ صرف چاول بنائے گا۔ منبری بنالے کی سکت نہیں۔ نمک
 اور پیاز سے گزارہ ہو سکتا ہے۔ اُسے چاہیے۔ تیل کے کنستریس
 سے کچھ قطرے نکال کر لکڑیوں پر چھڑکے۔ وہ
 سٹھٹھک گیا۔ کمرے کا دروازہ کھل رہا تھا۔ اور کوئی اندر آ رہا
 تھا۔ بڑی بڑی سونچیں..... سر پر کالا پگٹ جمائے کوئی آ رہا
 تھا۔ سبھلا کافی پگڑی بھی کوئی پہنتا ہے۔ اندھیرے کی وجہ سے
 کافی لگ رہی ہوگی۔ رحمان تو دار کو پہچان نہ سکا۔
 "کون ہو جی تم....." رحمن کا بدن تن سا گیا۔ جیسے
 چوری کرتے کرتے پکڑا گیا ہو۔
 "میں ہوں عبدالسلام....." تو وارد نے ایک بڑا سا

بھی ویسے ہی لپٹا پڑا تھا۔ جیسے وہ چھوڑ گیا تھا۔
 میرے پاس راشن ہے صاحب۔ آپ آرام کر لیں۔
 میں چوہا چلائے دیتا ہوں۔ ٹوٹیاں ذرا گیلی ہیں۔ رجن نے
 بر خورداری غلامی کی۔ لیکن دل میں نئی تشویش ابھر رہی تھی۔
 عبدالسلام داپس آگیا تھا آج نہیں تو کل کہیں اور ڈیرا
 لگانا پڑے گا۔ نہ معلوم اب کس در کی کھڑکی کھائی
 پڑیں۔

اے رجن شکر کرو کہ گیلی کڑیاں مل گئیں۔ سردیاں
 سر پر آنے دو۔ سچہ دیکھو گے کہ یہاں کتنا بڑا حال ہو جاتا
 ہے۔ عبدالسلام نے اپنی واقفیت کا ثبوت دیا لیکن دل میں
 خیال آیا کہ اسے رجن سے مزید واقفیت حاصل کرنی چاہیے۔ کہ
 اس کے جانے کے بعد کوئی ہنگامہ تو بپا نہیں ہوا۔ جانے کو تو
 وہ شہر چلا گیا تھا۔ لیکن یوی بچوں کے پیچ رہ کر بھی اُس کا
 ڈر ذرا کم نہ ہوا تھا۔ ہر آہٹ پر گمان ہوتا کہ پولیس اُسے
 لینے آ رہی ہوگی۔ ہر کھٹکے پر جان بیکل جاتی۔ راتوں کی نیند
 حرام ہو گئی تھی۔ اُس کی حالت دیکھ کر گھر بھر پریشان ہو گیا۔
 سوچتے ہوں گے سو نہ دی کی آپ دوسرا اس نہ آئی ہوگی
 پتہ چلے اس کی کہ تو لوں کا تونہ معلوم کیا ہو لیکن اتنے دن کوئی
 پتہ نہ چل۔ تو اب کیا خاک چیلگا شاید مچھولی نے بدنامی کے ڈر
 سے رائے نہ دی کہ دیا ہے نہ معلوم کرن سائیک کام آٹے
 آگیا۔ جو اتنے بڑے گناہ کا سزا سے بچ پایا۔ عبدالسلام نے

نے تو بہ بڑھی اور خدا کے لڑکے پر واپس چلا آیا۔ اور اب
اسے یقین نہ آ رہا تھا کہ وہ اپنے کمرے کے بیچ، اپنے سامان
کے دُشمن، اپنے بستر سے ویسے ٹیک لگائے بیٹھا ہے۔ جیسے
پہلے بیٹھا کرتا تھا۔ اس نے اپنے وجود میں اطمینان اور
خوشی کا ایک لہر ہی محسوس کی۔

”ارے سمجھتی لکڑیاں گیلی ہیں تو وہ مٹی کے تیل کا کنستریٹر
ہے۔ ٹپکا دیکھ تیل لکڑیوں پر۔ مٹیوں میں آگ پکڑ لیں گیں۔
”جی بہت اچھا۔۔۔۔۔ جی“ رحمن کے ذہن پر بھی جیسے کسی
نے مٹی کا تیل ٹپکا یا ہو۔ ”ابھی ڈالتا ہوں صاحب۔۔۔ ابھی
ڈالتا ہوں“ رحمن کو یقین نہ آیا کہ عبدالسلام نے ایسی پیش
کش کی ہو۔ اس نے کسی بار عبدالسلام کی غیر حاضری میں کنستریٹر
تیل نکال کر روشنی کی کپڑی جلائی تھی۔ سوچا تھا۔ مزدوری۔
ملنے ہی وہ تیل مزید کے پورا کر لیگا۔ پر اب تک اُسے کوئی
پیسہ نہ ملا تھا۔ شاید اسی لئے اُس نے عبدالسلام کی راشن
میں سے بھی کچھ راشن پر ہاتھ مارا تھا۔ عبدالسلام کو اپنا
سامان جانچنے کا خیال ہوتا تو آتے ہی جانچ لیتا۔ اب ناپ
بھی لے کنستریٹر تیل کی سطح کا صحیح اندازہ لگانا مشکل تھا
رحمن کے بہت سارے ڈروور ہو گئے۔ اس کی نگاہوں
میں عبدالسلام کی وقت بڑھ گئی۔ اب عبدالسلام کی لمبی لمبی
موتھیں بھی اس کے دل میں نفرت کو نہ سمجھ سکیں۔
لکڑیاں سمجھ کر اٹھیں۔ تو اس نے چاول ابا سے لے

ہانڈی چولہے پر چڑھادی۔ عید السلام نے کھیلے میں سے کچھ تانہ زئی
 سنبری نکال کر کاٹنی شروع کی تو رعن کے دل میں ہوک سی اٹھی۔ ایک
 عید السلام تھا جو بغیر جان پہچان کے اتنی خاطر داری کر رہا تھا۔ اور
 ایک اگلا اپنا دوست تھا دینا تا تھا جس کے گھر جانا بھی اب اس کو گوارا نہ تھا۔ یہ ٹھیک
 تھا کہ دوست دوست کا کام کرے۔ تو شرم کی کوئی بات نہیں۔ لیکن یہ تو سٹھیک
 نہیں تھا کہ خدمت گار کی طرح کام میں جوتے۔ کبھی پانی لانا۔ کبھی سنبری عید نے
 بازار پہنچو۔ کبھی راشن کی بوری اٹھا لانا۔ اور کبھی بھاڑ و دینے کی فرمائش۔ اور
 جیسے کوئی کام نہ ہو تو سوماتی حساب کرنے بیٹھ جاتی تھی۔ مگر اس نے
 کتنا روپیہ لیا ہے۔۔۔۔۔ پہلے دینا تا تھا کو کبھی یہ فکر نہ رہا کرتی
 تھی۔ اس کا اپنا پسینہ خرچ ہوتا ہے یا دینا تا تھا کا۔ لیکن جب سے
 سوماتی آئی تھی تو دینا تا تھا کا روپیہ بدل گیا تھا۔ اب کبھی کبھار
 ہی ملتا تھا۔ کاش وہ یہاں نہ آتا۔ دینا تا تھا نے اسے نوکر کی کیا
 دی تھی جیسے خرید لیا تھا۔ اسے مزدوری کے پیسے لی جائیں
 تو وہ دل میں چلا جائے رہ جائے تو کم از کم دینا تا تھا کا فرض نہ تو اتار
 دے دفعتاً اسے محسوس ہوا کہ وہ اپنے دوست کے ساتھ زیادتی
 کر رہا ہے۔ دینا تا تھا نے کبھی پیسے کا تقاضا نہ کیا تھا۔ نہ ہی کبھی
 اس نے کسی کام کے لئے کہا تھا۔ سارا قصور سوماتی کا تھا۔ عورت
 نہ تھی مصیبت تھی۔ شہر میں ساس سسر کی وجہ سے کچھ نہ چلا کر نہ تھا۔ لیکن
 یہاں آکر دینا تا تھا کو ٹھٹھی میں بند کر لیا ہے۔ دینا تا تھا بچارہ کرے
 تو کیا کرے۔ و اتنی کیا کرے۔ دودھ پیتا بچہ ہے۔۔۔۔۔ بچلا
 بیوی پر دوست کو کیسے تریح دے۔۔۔۔۔ ہوں!

اور ہاں۔۔۔۔۔ میرے جانے کے بعد گاؤں میں کوئی جھگڑا وغیرہ
 تو نہیں ہوا۔۔۔۔۔ یہ گاؤں کے لوگ بڑے کلمتے ہیں۔ ان سے بچ کر
 رہا کرتا۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔

”ایسی تو کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی صاحب۔۔۔۔۔ ہاں سنائیے
 کہ۔۔۔۔۔ رحمن کو کہتے کہتے رکت پڑا۔ سنری پتیلے پر چڑھ ہی تھی۔
 مریچ مصالحہ ڈالنا پڑا۔ جواب دینے میں مشغول ہو جاتا تو سنری ابل
 جل جاتی۔ پانی ڈالتے ہی تڑپ تڑپ کی آواز سارے کمرے میں گونج
 گئی۔ عبدالسلام بے صبر ہو کر مہجھلا اٹھا۔ یہاں تو اس کی جان پر
 بن آئی تھی۔ اور رحمن سنری بنانے میں مشغول تھا۔ بکا بکا ایک
 عجیب سی ترغیب اس کے ذہن میں کود گئی۔ لیکن پیٹے کی تڑپ تڑپ
 اسے کچھ سوچنے کی مدت تو دے۔ کہیں اس کا ذہن آوارہ نہ
 تھا۔۔۔۔۔؟

رحمن نے پتیلے میں گڑھی لٹائی تو پتیلہ بج اٹھا اور عبدالسلام
 کا آوارہ ذہن ہوش میں آگیا۔ رحمن کہہ رہا تھا۔
 ”ماہر سے کچھ ماہر کام کا جائزہ لینے آ رہے ہیں۔ امسر
 دوڑے دوڑے پھر رہے ہیں۔ جسے دیکھو دوسروں کو ڈانٹتا
 پھرتا ہے۔ جان الجھن میں پھنس گئی ہے۔“

چاہے رحمن کی جان الجھن میں پھنس گئی تھی یا کسی اور کی
 لیکن رحمن کی وساحت نے عبدالسلام کی الجھن دور کر دی
 اسے خسوس ہوا کہ اس کا ذہن آوارہ نہیں ہے۔ بلکہ اجمعی طرح
 سے کام کر رہا ہے۔ اس نے آنکھیں بند کر کے پچھلے واقعات

پر پھر سے سوچا۔ شاید کہیں کوئی موڑ ملے جس سے حالات کا رخ پلٹ گیا ہو۔ مزدور کہیں کوئی ایسا موڑ ہو گا ورنہ بھولی خاموش نہ رہتی۔ نگاہوں والوں سے نہ کہتی پر اپنی ماں سے مزدور کہتی۔ مزدور کوئی وجہ ہے۔ یہ لوگ اتنے حساس نہیں۔ کہ بدنامی کے ڈر سے خاموش رہیں گے۔ کہیں بھولی کو اُس سے کچھ..... وہ سوچتے سوچتے رک گیا۔ اُسے یقین نہ آیا۔ کہتی

مضحکہ خیز سوچ مٹتی اُس کی..... اُس نے ایک بار۔ سپر بیتی واقعات کو تو لٹا شروع کیا۔ بھولی کا اُس سے دور دور رہنا..... اُس سے گتہ چرانا..... سپولی کے بدن کی کپکپاہٹ..... بصر کے مارے..... بھولی بھلائی لڑکی ہے۔ بنا..... شہری لڑکیوں کی طرح بے یاک نہیں جو اپنی خواہش عیاں کر دے۔ اُسے چاہیے تھا، ان اشاروں سے صحیح مطلب اخذ کر لیتا۔ اس کی اداؤں کا مداح بنتا۔ یہی کیا کم ہے کہ بھولی نے کسی سے ذکر نہ کیا۔ مزدور بھولی کو اُس سے..... اُسے

نہیں..... ہو سکتا ہے۔ کوئی ادراکات جو دیے ہو اپنے میں کیا فرق ہے۔ اُس کو ایک بار سپولی کا سامنا کرنا چاہیے جیب ایک بار اُڑکھلی میں سے سر بیچ سلامت باہر نکلا آیا تو دوسری دفعہ سر اُڑکھلی میں ڈالنا خطرناک نہیں ہو سکتا..... اُسے مزدور ایک بار بھولی کا سامنا کرنا چاہیے..... ایک بار

مزدور..... سوچتے صاحب..... رحمان تے اٹھ جگا یا۔ کیا ناتیار

ہو گیا تھا۔ اور اسے خود بڑی سمجھوتہ محسوس ہو رہی تھی۔
 "میں تو عبدالسلام نے لیٹے لیٹے ہی جواب

دیا۔
 "تو کھانا کھا لو صاحب ٹھنڈا ہوا جا رہا ہے۔"
 رحمن نے کہا۔

"پروں کو بیٹھے پروں کو عبدالسلام
 نے پٹھانوں کے لینے کے انداز میں کہا۔ لیکن اٹھ بیٹھنے کی کوئی
 کوشش نہ کی۔ اس کا ذہن اس گھر کی چار دیواری سے آزاد
 دُور کے کنارے کچھوٹی کے کنارے صہم کو یاد کر کے لذت
 لے رہا تھا۔

..... سچوٹی نے اس واقعے کا ماں سے کوئی ذکر نہ
 کیا۔ کرتی بھی تو کس ماں سے کرتی۔ ماں اب پہلی سی ماں نہ رہی تھی
 جو اسے دن دن سہر گو دینے اٹھائے پھرا کرتی تھی۔ کاتبیہ
 جاتا تھا تو ہر دن پچکارا کرتی تھی۔ موقع بے موقعہ دل بہلایا
 کرتی تھی۔ حتیٰ کہ اس کی غلطیوں پر اپنے آپ کو ہی گناہگار ٹھہراتی
 تھی۔ ماں تو بالکل بدل گئی تھی۔ وہ اس واقعہ کا ذکر ماں سے
 کرتی بھی تو جھیم جھگھاڑ کے بغیر کیے نہ ہوتا۔ اور سارے گھروں
 میں بات پھیل جاتی۔ اس کا گھر سے باہر نکلتا دوسرا ہو جاتا
 اور گھر سے باہر نہ نکلتے تو سب کو کئی سریں گے دونوں۔ ویسے
 اب اس دیتا میں تھا بھی کیا اس کے لئے۔ موت ہی بہتر تھی
 اس زندگی سے۔ پر پوڑھیا مرنے بھی دے اسے۔ بستر مرگ

سے واپس کھینچ لے گی تاکہ وہ کما سکے اور بوڑھیا کھا سکے۔ اس لئے چھوٹی نے اس واقعہ کا ذکر ماں سے نہ کیا۔ لیکن ماں آخر ماں ہوتی ہے۔ وہ اپنے خون کو نہ پہنچا۔ تو کون پہنچانے اور نہ دینا کے جتنے رشتے تاطے ہیں ان کی تاریخ قلمبند نہ ہوتی۔ اور دینا کی تاریخ ادھوری رہ جاتی۔ اس لئے جوں ہی بوڑھیا نے چھوٹی کو آتے دیکھا تو چھوٹی کی چال ڈھال میں اُسے فرق سمجھوس ہوا۔ چھوٹی کے پیر سیدھے نہ پڑ رہے تھے۔ پوٹلی اٹھانے کا بھی انداز ایسا نہ تھا۔ جیسے روز ہوا کہ تانتھا۔ سارا۔ کھاؤں جانتا تھا۔ کہ ان کے پاس ہنگھاڑا کا لائیس نہیں اس لئے پوٹلی ہر حالت میں کھاؤں کی ٹٹولتی نکالوں سے چھپا کے لائی جاتی تھی۔ لیکن آج چھوٹی ٹٹولی کھلم کھلا لئے چلی آ رہی تھی۔ اُسے معلوم تھا چھوٹی نے ایسا بھی نہیں کیا۔ تب بھی نہیں جت چھوٹی اس سے لڑ پڑتی تھی۔ یا مار کھاتی تھی۔ پوٹلی میں ہنگھاڑے ہونے تھے۔ ہنگھاڑے کو سکھا کر پیسا جاتا تھا۔ اور پے ہوئے سڈنگ مارچوں سے سوئی سوئی روٹیاں بنائی جاتی تھیں۔ جو کھوک کے خنق میں ٹھونس دی جاتی تھیں۔ اور کھوک کچھ دیر کے لئے مرس جاتی تھی، بوڑھیا کو بہت کھوک لگتی تھی۔ شاید زمانے بھر کی کھوک اس کی سس لس میں رہے گی۔ تھی۔ اس لئے جوں ہی چھوٹی نزدیکی پہنچ گئی۔ تو وہ برس پڑی۔ کیا بات ہے۔۔۔۔۔ کسی سے نہ جھگڑائی ہو یہ

کر۔ سنگاڑے کی روٹی کا خیال آتے ہی اس کے ذہن میں دلہا
 کنارہ ابھرتا تھا۔ تاریک ذہنی میں کسی بھیانک ناؤ کی ڈک پہنچ
 جاتی۔ کسی کے کھر درے بے رحم ہاتھ اس کے جی کو ڈالنا ڈل
 کرتا۔ زکلوں کے پتیز دھار پتے بدن میں چبھ چبھ جاتے۔ کبھی
 نفرت کی آگ جلانے لگتی۔ اور کبھی بے نیازی کی بریلی موسیقی
 کرتی۔ آنکھوں سے بے بسی اور بے کسی کے دھارے رواں ہوتے
 لگتے اور وہ کچھ وزیر کے لئے سب کچھ بھول کر آئینوں پہنچنے لگتی
 اسے بھوک محسوس ہوتی۔ انٹریوں میں بھوک ایک نئے درد کو
 جنم دیتی۔ بدن ٹھکن سے جیسے ٹوٹ رہا ہو۔ سارا ماحول تھکا
 تھکا سا محسوس ہوتا۔ اس کا جی چاہتا کہ اٹھ کر اپنے انگ انگ
 کو جھنجھوڑ دے۔ تھکے ماحول کو توڑ سمجھوڑ دے۔ اور کد کد گھیرا ڈال
 ہوئی دیواروں کو نوچ دے۔ نوچ نوچ کر زخمی کر دے۔ دیواروں
 جیسے خاموش لٹکا ہوں سے اس کی تعزیک کر رہی تھیں۔ ان کی بے
 وقوفی پر ہنس رہی تھیں۔ شاید وہ واقعی بے وقوف تھیں بے وقوف
 نہ ہوتی تو بھوک کی کیوں رہتی۔ پیٹ میں بھوک نے غلام چا رکھا
 تھا۔ اور وہ تھی کہ نہ ہر دستی بھوک سے بے نیاز ایسے واقعات
 کی سوچ میں سرگرداں تھا۔ جنہوں نے اس سے بدن پر کوئی ایسی
 چھاپ نہ ڈال دی تھی جس کے سہارے اُس اس الجھن میں سہارا ملتا
 دن میں کئی بار بدن کو ٹٹول ٹٹول کر..... ایک ایک انگ کو ٹٹول کر
 وہ بے حال ہو چکی تھی۔ لیکن کچھ نتیجہ نہ برآمد ہوا تھا۔ رنجی کہ بعد وہ
 کا کوئی نشانہ تک نہ ملا اور دن صاف ہو گیا۔

بارش ہوتی تھی۔ لوگ الجھا سے قیاس آرائیاں کرنے لگے تھے۔ شاید
 فیصلہ یہ موقع بارش سے شراب ہو جائے اس لئے اناج کی قیمت روز
 بروز بڑھ رہی تھی۔ لیکن گاؤں والوں کو اتنی الجھی نہ تھی جتنی
 پہلے ہوا کرتی تھی۔ اس لئے گاڑھ آنے کا خطرہ ٹل گیا تھا۔ دُلر
 کے کنارے دو بڑے باندھ بنائے گئے تھے اور تیسرا باندھ
 بن رہا تھا۔ سرکار نے دریا کے پھیت کنارے اونچے کسے
 کا کام بھی شروع کیا تھا۔ لیشبی علاقوں سے پانی کے
 محاس کے لئے بجلی کے بڑے بڑے پمپ بھی کہیں کہیں لگائے
 گئے تھے جسے دیکھو مشغول نظر آتا تھا۔ افسردہ رات جیوں اور
 گاڑیوں میں دوڑتے رہتے تھے۔ گاڑھ کے خطے سے
 نجات محسوس کر کے لوگوں میں بھی کافی تبدیلی آگئی تھی۔
 ان کی مرجھائی اُمیدوں پر ہریالی آنے لگی تھی۔ برسوں جھوٹے
 دیران کھیت پھر سے انسان کا جدوجہد کا مرکز بن رہے
 تھے۔ روپے پیسے کی ضرورت پڑی تو کچھ ساہوکاروں نے
 بھی سر اُٹھانا شروع کیا۔ زمینوں کی نئی حد بندی نے پٹواریوں
 کی قیمت کئی گنا بڑھا دی۔ آپس میں تنازع جنم لینے لگے۔ ایک
 آدھ خون بھی ہوا۔ سونہ داری میں زندگی بہار کی آمد کا شور
 مٹا کر ہڑبڑا کر جاگ رہی تھی۔

چھوٹی کمی ماں کے پاس کمیت نہیں تھی مرن مکان
 کے سامنے وسیع آنگن تھا۔ جو برسوں کی گندگی تلے سگڑ سا
 گیا تھا۔ گندگی کے ڈھیر بجا ہییب پھوڑوں طرح سامنے

آنکھوں میں بھرے پڑے تھے۔ جیسے آنکھوں نے ہو کوڑھ کا کوئی مریض ہو۔ بوڑھیا کے دل میں بھی خواہش پیدا ہوئی کہ آنکھوں کو صاف کر کے چھوٹی چھوٹی کیاریوں میں بدل دے۔ اناج نہ سہی کچھ پھل سبزی تو آگ آئے گی۔ بوڑھیا کے دل میں جوش تھا۔ دلوں تھا۔ لیکن بدن میں سکت نہ تھی۔ دو قدم چلنے سے کمر میں درد ہونے لگتا اب تو اُس کے مرنے کے دن تھے۔ سہا وڑا اٹھاتا تو درکنار سہارے کے لئے لکڑی تھامنے کو بی چاہتا تھا۔ کبھی گر گئی تو اٹھنا مشکل ہو سکا۔ لیکن بدن کی کمزوری کے باوجود لکڑی تھامتا اُسے منظور نہ تھا۔ بچوں ابھی سے خود سر ہوتی جا رہی تھی۔ ماں کو ناکارہ جان کر ہاتھ سے بالکل نکل جائے گی۔ کاش.... بچھوئی کچھ کام کرے نہ معلوم کیا ہو گیا ہے۔ حرامزادی کو.... بوڑھیا کو غصہ آگیا اور وہ پھر کمرے میں پڑھ دوڑی۔

_____ کرے میں بچھوئی بے سدھ گھاس کے ڈھیر پریشانی سو رہی تھی۔ بال پریشان گھاس کے تنکوں میں اُلجھے پڑے تھے۔ فرن ٹانگوں سے بے پردہ راتوں تک پڑھ آیا تھا۔ شلوار ٹانگوں پر پردہ کسنے کے بجائے کھڑکی پر پڑی تھی۔ کھڑکی میں سے دھوپ ٹانگوں پر پھیل گئی تھی۔ اور بچھوئی نگہ بے داغ ٹانگوں کو چاندی کی چمک سنسن رہی تھی۔ بوڑھیا رُک گئی۔ اُسے یقین نہ آ رہا تھا کہ سامنے پڑی لڑکی اُس کی بیٹی ہو سکتی ہے اُس کی اپنی کو کھ سے نکل آئی ہے۔ جب کبھی اس نے بچھوئی کو دیکھا تو کیچر سے اٹی منتظر گندی سی ایک سوکھی سوکھی سی لڑکی کو دیکھ پائی جو اُس کی بیٹی کم تھی۔

بھولی نے کروٹ بدل دی، اور بوڑھیا کی سوچ نے بھی کروٹ بدل دی وہ جھجھلا اٹھی۔ اکیلی بھکارن کیا کر سکے گی۔ کہاں سے زیور کپڑے لائے گی۔ براتیوں کے لئے اناج پیدا کرے گی۔ خود تو دانے دانے کو محتاج تھی۔ کاش بھولی مر جائے یا وہ خود مر جائے۔ تو اس کے بہت سارے دکھ کم ہو جائیں... کاش... کاش... کرے کے وسط میں کھڑے کھڑے اس کو بھولی کے بڑھتے ہوئے جسم سے نفرت سی ہو گئی۔ یہ بھولی کا جسم نہ تھا۔ بیچر کی ایک بڑی سمجھاری سیل تھی۔ جو اس کے وجود کا کج مورخہ رکالنے پر تیلی تھی وہ آگے بڑھی اور بے دردی سے بھولی کو جھجھوٹنے لگی۔

”اگھتی ہے کہ دوں ایک جھانپڑ... کاٹا کیا چھ گیا ہے جیسے لقوہ جاٹ گیا ہے۔ بہانے کرتی ہے۔ چل اٹھ“

بھولی گھبرا کر جاگ پڑی ”نہیں مارو... میری طبیعت ٹھیک نہیں، بھولی کی آنکھوں میں آنسو ٹھلنے لگے۔

”کیا ہو گیا ہے طبیعت کو۔ اچھی بھلی تو ہے، نہ سباز نہ کیچی۔ آخر بات کیا ہے“ آنسو دیکھ کر بڑھیا ذرا ہنس گئی۔

”میرا کسا کام میں جی نہیں لگتا۔ نہ معلوم کیا ہو گیا ہے مجھے۔ کسی کام میں جی نہیں لگتا۔ بھولی نے بے بسی سے کہا۔ اور بڑھیا کے دل پر ایک اور چرکا لگا۔ واقعی بھولی بڑی ہو گئی تھی۔ اس کی شادی مزدور کرنی چاہئے۔ چاہے بھولی کو بیچنا پڑے یا اپنے آپ کو۔ وہ کتنا ہی روکے بھولی کو لیکن زندگی

کہیں رک سکی ہے جو اس کے روکے رکے گی۔ خود بھی تو اس کی حالت شادی سے پہلے ایسی ہو جایا کرتی تھی۔ برسوں پہلے۔ بیٹی۔ ایسے کام تو نہیں چلے گا۔ جب تک مجھ میں سکنت عتی میں نے گھر بنایا۔ اب ان بوڑھی بڑیوں میں طاقت نہیں جو کما سکاں۔ اب تو تم ہی سب بوجھ اڑا ہے۔ چاہے اپنی ماں کو مار جا ہے رکھ لے۔ مختار سے بغیر اس دینا میں میرا کوئی ہے۔ اور بوڑھیا کی آنکھوں سے بے تماشائو سینے لگے۔ آج بہت دن بعد اسے اپنا خاندنہ یاد آیا۔

_____ بچھو نے بڑھیا کو کئی بار روئے دیکھا تھا۔ جب کبھی بوڑھیا اس سے اٹھتی تو جھگڑت کی آخری حد بوڑھیا کچھ آنسو بہا کر ہی پوری کر دیتی تھی۔ لیکن اس روئے میں رونا کم ہوتا تھا اور غصہ زیادہ۔ ہر آج بڑھیا کے آنسوؤں میں غصہ نہ تھا۔ نفرت نہ تھی بلکہ زندگی بھر کی نکلنی اٹھی چلی آ رہی تھی۔ اس کی آہ و زاری میں بے بسی تھی۔ بے کسی تھی۔ بچھو نے ہر اس تبدیلی کا بہت اثر ہوا۔ وہ سوچنے لگی کہ اس کی ماں کا کوئی قصور نہیں کہ وہ بھوک سے نڈھال ہو کر چیختی ہے۔ سردی گرمی محسوس کر کے چلاتی ہے ماں کو وقت پر کھانا نہ دے۔ وہ گرمی سردی سے بچی رہے تو ان کبھی جھگڑا نہیں کرے گی۔ کوئی وجہ نہ ہوگی جھگڑنے کی واقعی یہ اس کی زیادتی تھی۔ جو وہ سارے الزام ماں کے سر تھوپ رہی تھی۔ وہ کام کرنا چھوڑ دے گی تو یہی ہو گا کہ ماں مر جائے گی۔ ماں کے مرنے سے مشکلیں مٹیں گی تو یہیں۔ خود اس کا اپنا پیٹ

کھڑا۔ اپنی بھوک تھی۔ اپنے آپ کو تو نہیں مار سکتی۔ مرنا ہوتا
 تو وہ دریا کے کنارے بجا مرنی ہوتی۔ وقت کے دھارے
 پر بندھ ہاندھا مشکل تھا۔ اسے چاہیے رونا دھونا بھول جائے
 وہ ولر جائے اور سنگھاڑے اٹھے کرنا شروع کر دے۔ سردیاں
 سر پر آرہی تھیں۔ گھر میں کچھ ہو گا نہیں۔ تو بھوک سے اترھیا
 رگڑ رگڑا کر مرنا ہو گا۔ اور وہ ابھی مرنا نہ چاہتی تھی۔

_____ وہ آگے کو تھکی اور ماں کی آنکھوں سے آنسو

پونچھنے لگی۔ ماں نے فرخ محبت سے اسے گلے لگایا۔ اور وہ
 بچہ مانا کی محو دہی منہ چھپا کے رونے لگی۔ ... زار و قطار
 رونے لگی۔ کبھی کبھی بے سہارا ہونے کی بجائے کرم حور وہ
 ماری کا سہارا بھی بہت ہوتا ہے۔

_____ عبدالسلام منہ اندھیرے میں جاگ پڑا۔ سر ہانے لگی
 جس کی ڈیلا کوٹھڑا اور تیلی جلائی۔ تیز روشنی میں اس کی بے
 خواب آنکھیں سسک سی اٹھیں۔ ٹھٹھانی روشنی میں رحمان دکھائی
 دیا اور وہ بے سقارشہ ہنس پڑا۔ رحمان کے سونے کا ڈھنگ عجیب
 تھا۔ ایک ٹانگ کہیں تکتی اور دوسری کہیں۔ ایک ہاتھ میں سر کے
 بال جکڑے ہوئے تھے اور دوسرا ہاتھ ننگے پیٹ پر اونڈھا پڑا
 تھا۔ شاید منہ بھی کھلا ہوا تھا۔ عبدالسلام اچھی طرح سے نہ دیکھ
 پایا۔ دیا سلائی بجھ گئی اور کمرہ سہرا اندھیرے میں ڈوب گیا۔ پر
 ابجے عبدالسلام کو اندھیرے سے کچھ ڈرنہ لگا۔ رات بھر جوتاؤ
 اس نے انگ انگ میں رچ گیا تھا۔ وہ رحمان کے قرب کو محسوس
 کر کے ٹوٹنے لگا۔ پر آنکھوں کی جلن بدستور قائم رہی۔ وہ تمام
 رات بلا سہرا نہ سو سکا تھا۔

عجیب عجیب سے سپنے رات اس کی آنکھوں میں مچلج میند
 لاپچھا کرتے رہے۔ عجیب سے سپنے دیکھے اس نے کبھی عموں

والے اسے مارنے کو جڑھ دوڑتے۔ اور بھولا اس کو بھرنے کے دامن میں چھپائیے پھرتی۔ تبھی دُور کی تاریک گہرائیاں ^{جھلنے} لگتیں اور بھولا اُسے اپنی زلفوں کے جال میں پھنسا کر تڑپتی پھنسی کی طرح کنارے پھینک دیتی۔

_____ جان ہٹا کر وہ آہستہ سے اٹھا۔ آہستہ سے دروازہ کھولا اور باہر نکل آیا۔ آسمان پر تارے ابھی ٹٹہرا رہے تھے۔ جو انم سکتی اور آہستہ آہستہ چل رہی تھیں۔ حتیٰ کہ دروازے کے پتوں میں بھی حرکت تھی۔ کہیں دور کوئی ستا بھونک رہا تھا۔ لیکن ظالمش دُفا میں گئے کی آواز بھی کوئی دھنچا رہنا ش پیدا نہ کر رہی تھی۔ ساری کائنات پر سکون کی چادر ملبہ تھی۔ جس کی پر چھایاں اُس کے اپنے ذہن میں بھی سکون پھیلانے لگیں۔ گادوں سے دور ہوتے ہوئے اُس نے بید کی ایک ٹہنی توڑی۔ بہت دنوں بعد تازہ مسواک کرنے کو ملا سکتی۔

_____ جوں جوں دُور قریب آتا گیا اُس کے ذہن کا سکون برہم ہونے لگا۔ جی تو بہت کرتا تھا کہ واپس لوٹ پڑے۔ ایک دفد اٹھانے میں اُس نے غلطی کی تھی۔ شاید اُس دن وہ جذبات سے اندھا ہو گیا تھا۔ لیکن آج وہ جذبات سے عاری پھر ہی غلطی دہرانے جا رہا تھا۔ اسے بھولا کے سن کا خیال کرنا چاہیے۔ چودہ پندرہ برس کی معصوم کلی اور وہ خود ادھیر عمر کا آدمی۔ تین بچوں کا باپ۔ ... عمر میں دُور کا فرق تھا۔ کپٹیوں کے گرد تو بال بھی سفید ہونے لگے تھے۔ ویسے اُسے حق بھی کیا ہے جیوری کے ہوتے ہوئے کسی دوسری لڑکی

سے پینگیں بڑھانے کا۔ بیوی بھی کسی اور سے پینگیں بڑھا دے تو کیا ہو۔ وہ شاید بیوی کے سر پھوڑ دے گا۔ وہ یقیناً بیوی سے دھوکہ کرا رہا ہے۔ ابھی کچھ زیادہ نہ بڑھا تھا۔ اسے چاہئے اپنے قدم واپس موٹے ... قدم واپس موٹے ... واپس موٹے ... لیکن قدم واپس نہ موٹے۔ شاید بیوی پاس نہ ہونے کی وجہ سے کسی کشش کا موجب نہ بنایا شاید وہ پارسا نہ بننا چاہتا تھا۔ پارسا بن جائے تو بھوکوں مرے۔ چوری کرنا گناہ تھا۔ اور دھوکہ دینا بھی۔ وہ ان گناہوں کا مرتکب دن میں کئی بار ہوتا تھا۔ ابھی ہوتے رہتے ہیں جیسے کہ اس کے دفتر کا اکاؤنٹ بھی جس کی ڈاڑھی کسی سر فقیر سے کم نہ تھی۔ اور جو پانچوں وقت سنا پانڈی سے ادا کرتا تھا ہوں ... پر سبز گاری کرے تو بیوی بچوں سمیت بھوکوں نہ مرے۔ ہینے کے پچاس روپے بیکار میں کس کس کا پیٹ بھرے۔

— عبدالسلام اپنی کشمکش میں غلطیاں پہچان انہماک سے آگے بڑھتا جا رہا تھا لیکن اس کا لاشعور اس کے بدن کو ارد گرد پھیلی جھاڑیوں اور نرگسوں کے سہارے ویر کے گرد پھیلا انتہائی نڈیوں کو چھوڑا اسی پگڈنڈی پر لئے جا رہا تھا۔ جس کی حد اس کے خیالات کی معراج تھی۔ لیکن وہاں پہنچ کر جدی سارا ماحول اس پر عیاں ہو گیا۔ وہ بوکھلا سا گیا۔ سچ اس پر واضح ہو گیا کہ اس دن کسی نے بھڑکی کی چیخ دیکھا سن پائی تھی تو اس کا یہ مڑتا تازہ جسم ولہ کا مچھلیوں کی حذر اک بن گیا ہوتا۔ یہ احساس ہوتے ہی اس کی نگاہیں چاروں طرف اس انداز سے پھرنے لگیں جیسے سارا گاون سرگزشت کے پیچھے تاک لگائے

بیٹھا ہو۔ سر کندھوں کے جھنڈ پریشان تھے اور ایک گھنے جھنڈ
 کے پاس رومال پڑا تھا۔ رومال اسی حالت میں زمین پر پڑا تھا۔
 جیسے وہ خود پھیلا گیا تھا۔ لیکن سنگھاڑوں کا نام نشان نہ تھا
 رومال کا رنگ دھوپ اور بارش نے گڈا گڈا کر دیا تھا۔ اگر کہ
 وہ کورے کاغذ کی طرح کرکرا ہو گیا تھا۔ اسے تشویش سی ہوئی۔
 شاید بھولی نے رومال کو چھوا بھی نہ تھا۔ جھوٹا نہیں تو سنگھاڑے
 گئے کہاں۔ چند ہند کھا جاتے تو رومال اسی حالت میں نہ بڑا
 رہتا۔ گھنے سڑنے کا تو سوال ہی نہیں۔ سنگھاڑے برسوں تک
 سڑنا جاتے تھے۔ اور سنگھاڑے بھولی لے گئی۔ تو رومال کیوں چھوٹ
 گئی۔ اس کی جان تھکے میں بعض گئی۔ جتنے کہ وہ رومال اکٹھا نہ بھی
 بھول گیا۔

_____ ایک ایک وہ چونک پڑا۔ نرکلوں میں سرسراہٹ
 سی ہو رہی تھی۔ شاید پاؤں کی چاپ بھی آ رہی تھی۔ کوئی آہا تھا۔
 اُسے منہ اندھیرے یہاں دیکھ لیا تو گھبراہٹ میں وہ اتنا بھی
 نہ سوچ سکا کہ جو کوئی اُسے یہاں دیکھ لے گا تو سمجھ لیگا۔ رکھوالی
 کا کاڑھ قانون کی حفاظت کر رہا ہے۔ دل میں جیسے چور نے اُسے سوچنے
 کی مہلت ہی نہ دی۔ اُس نے نیک جھپٹے ہی جست لگائی اور نرکلوں کے
 گھنے جھنڈ کو چیرتا سکتا جھپٹ گیا۔ تیزی میں نرکلوں کی چھن بھی محسوس
 نہ ہوئی بلکہ اپنے آپ کو جلدی سے سنبھال کر اس نے نرکلوں کی درز میں سے
 بگڑ بگڑی پر نکالیں جما دیں۔ چاپ کی آواز بڑھتی جا رہی تھی یا شاید دل
 کی دھڑکن بڑھی جا رہی تھی وہ فیصلہ نہ کر سکا۔ چاپ کی آواز دھیمی پڑ گئی اس

کے دل کی دھڑکن دھیمی ہو گئی۔ چاب بڑھنے لگی اور دن دھک دھک کرنے لگا۔ وہ سانس روکے منتظر رہا۔

_____ سامنے بگڑ بڑی پر بھولی بچپاتی خبراتی چلی آ رہی تھی۔ چلنے کے انداز میں ٹھٹھک سے زیادہ خوف عیاں تھا۔ وہ رومال کے پاس آ کر رک گئی اور عبدالسلام کے سینے میں اسید انگریزیاں لینے لگی۔ بھولی نے اِدھر دیکھا۔ اِدھر دیکھا۔ جیب کی سکہ دیکھنے کا ڈر ہو۔ عبدالسلام نے اپنے بدن کو سیکڑ لیا۔ بھولی نے کہتے ہوئے بازوؤں سے رومال اٹھایا۔ رومال کا غز کے ورق کی طرح اُڑا رہا۔ عبدالسلام کا دل لمبیوں اچھیل گیا۔ غزور کی ایک تندرہ اس کے بدن کو جھونک گئی۔ وہ محکمہ سنگھاڑ کا نامی گارڈ تھا اس کے سامنے ماہی گیر مہر مہر بید کی طرح کا نیا کرتے تھے۔ اس نے بڑے بڑے مجرم گرفتار کئے تھے۔ اس کا ہر لفظ قانون ہوا کرتا تھا۔ اب شخص غلط اندازہ نہیں دگا سکتا۔ بھولی اس کی شخصیت سے واقعی مرعوب ہو گئی ہے اس کے حال میں اچھ گئی ہے۔ اس کی ہو چکی ہے اب مزید رکنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ زنگوں کی چیمیں واضح ہو رہی تھی۔ وہ بے دھڑک کھڑا ہو گیا۔

_____ بھولی کسی کو ریکایک سامنے پا کر بوکھلا گئی۔ لمبے بے اختیار رومال کو چھپانے کی کوشش کرنے لگے۔ جیسے رومال بند ہو۔ لمبے اس کی زندگی کی کتاب کا کوئی اہم ورق ہو۔ عبدالسلام کے حذو خال پہنچاتے ہی وہ شرم کے مارے دیہری ہو گئی۔ چیخ حلق مینا رہی بھینسی رہی۔ چہرہ جلنے لگا اور ٹانگوں نے جواب دے دیا۔ وہ اکڑنا بیٹھنے پر مجبور ہو گئی سرخو بخود گھٹنوں پر گرنا چلا گیا۔

_____ عبدالسلام احتیاط سے زرکلوں کو ہٹاتا ہوا آگے بڑھا۔
بھولی کو دیکھ کر اُس کی خواہش بڑی طرح جاگ اٹھی تھی۔ جی چاہ رہا تھا۔
دوڑ کر جائے اور بھولی کو گود میں اٹھا کر بیچ لے۔

_____ بھولی منہ چھپائے کٹھنری کی طرح سسڑائی مٹی۔ جھکے سر کی
دھب سے گردن کا دو دھیارنگ صاف عیاں تھا اور عبدالسلام کو قریب
دے رہا تھا۔ وہ قدم بڑھا کر بھولی کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔
بھولی۔۔۔ تجھے سات کردو۔ سات کردو بھولی۔ میں نے تم
سے زیادتی کی۔ مہمان کردو تجھے۔

آواز دھیمی رہ گئی تھی میں عبدالسلام کو کافی جدوجہد کرنی پڑ رہی
تھی۔ جذبات اندھے کو محال رہتے تھے۔ لیکن وہ بھولی کو بھر دکانا نہ چاہتا تھا
ایک دفعہ وہ بھولی کی زندگی میں پتیاں سرکش زندگی سے دوچار ہوا
تھا اور بھولی.... ایک سو لکھی دھڑکی کو سر کرنے میں اُس کا اتنا لمبا
جوڑا جسم جوڑ جوڑ ہو گیا تھا۔

_____ بھولی کو یقین نہ آ رہا تھا کہ عبدالسلام یوں پیش
آ سکتا ہے۔ وہ تو اسے درندے سے بدتر سمجھتی تھی۔ جسے اسے بے رحمی
سے کھل دیا تھا۔ اُس کی انگلیوں کو سل دیا تھا اُس کے وجود کو لہو
لہاں کر دیا تھا۔ وہ بے طرح گھبرا رہی تھی۔ آج وہ ایک بار پھر اُس
درندے کے چنگل میں تھی۔ یہ مسلم اب کے کیا حشر ہوگا۔ اُن کے
رونے دھونے نے اور بے درد زمانے نے اُسے بھر سنگھڑا ہے۔ اُسکے
کونے پر مجبور کر دیا تھا۔ لیکن اُسے اس جگہ نہ آنا چاہیے تھا۔ کیا ضرورت
تھی اس جگہ آنے کی۔ اس جگہ تو وہ لوٹ لی گئی تھی۔ اب خود دوبارہ

لٹنے کو آئی۔ پھر اُسے بارنا نہ چاہئے۔ بلکہ اپنی بوکھلاہٹ پر قابو رکھنا چاہئے۔ عبدالسلام کا رویہ بوکھلاہٹ کے لئے کافی سمجھا۔ کہیں عبدالسلام اُسے چوپایا سمجھ کر بی کی طرح تو نہیں بکھلا رہا ہے۔ سر اٹھا کر اپنی تکی کرنے کو جی چاہ رہا تھا۔ لیکن سر اٹھائے کیے۔ شرم کے مارے دب سا گیا تھا سر.....

کوئی کشمکش نہ دیکھ کر عبدالسلام کا دل بڑھ گیا اُس نے آہستہ سے بچھولی کو چھوا۔

”واقعی میں بہت شرمندہ ہوں۔ مجھ سے غلطی ہوگئی۔ مجھے معاف کر دو سچھولی۔ مجھے معاف کر دو۔“

سچھولی کو عبدالسلام کی نیت فراموشی عجیب سی لگی۔ کہاں وہ عبدالسلام جس نے سچھڑ مار مار کر اُس کو بے حال کر دیا تھا۔ اور کہاں یہ عبدالسلام جو اُس سے معافی مانگ رہا تھا۔ سچھولی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ عبدالسلام کے ہاتھ اُس کی پیٹھ سے ہٹا رہے تھے۔ لیکن آج ان ہاتھوں میں کوئی کھتی نہ تھی یا شاید وہ ان ہاتھوں کے لمس سے بے خبر تھی۔ سارا ذہن تو عبدالسلام کے منہ سے نکلتے الفاظ کے گورکھ دھندے میں الجھ رہا تھا۔ عبدالسلام کی زبان بدلتی رہی الفاظ کو اُگل رہی تھی۔

”سچھولی تم جو سزا دو گی مجھے منظور ہے۔ میں نے غلطی کی۔ گناہ کیا۔

بہت بڑا گناہ۔ تم مجھے سزا دو یا معاف کر دو۔ بہتاری مرضی؟“

سچھولی جواب دینے سے قاصر رہی۔ گناہ کا لفظ عبدالسلام

کے منہ سے بار بار اُسی کردہ سوچ میں پڑ گئی۔ عبدالسلام کا دست دراز تھا

گو اُس نے کبھی گناہ کے معنی نہ پہنائے تھے۔ عبدالسلام کی زیادتی گناہ ہوتی تو آسمان نہ ٹوٹ پڑتا۔ زمین نہ بھٹ جاتی۔ بھونچال، آندھی، طوفان نہ آتے۔ نہ بھی آتے تو کم سے کم اُسے خود تو کچھ محسوس ہوتا۔ کہیں اُس کا ایسا دل تو گناہ کا نہیں۔ جو وہ عبدالسلام کی زیادتی کو گناہ کے معنی نہ پہناسکی۔ کہیں اُس کی تخلیق ہی تو قدرت کا گناہ۔

نہیں۔ ورنہ عبدالسلام یوں بار بار گناہ کا لفظ نہ دہراتا۔ شاید مرد گناہ نہیں۔ اور عورت گناہ ہے۔ بچی شاید ماں اُس پر کڑی نظر رکھتی ہے عذر دہکاتا ہے۔ عورت گناہ ہے اور وہ عورت ہے۔ کیا عورت کتنی اسے پیدا کرنے کی یا کوئی عورت نہ سکتی۔ اُسے رونا آگیا۔

بھولی کے رونے نے عبدالسلام کو حیرت میں ڈال دیا وہ تو ڈر رہا تھا کہ بھولی شاید پھر مگر اُس کا منہ نوج لے گی۔ چیخ کر دینا کو اکٹھا کر کے اُس کے کمر تو توں کا سہانڈا بھونڈ دے گی۔ لیکن بھولی کے غیر متوقع طرز عمل نے اُس کے سارے ڈر دور کر دیئے۔ بھولی کچھ دیر رونے تو شاید بخش آسوں بن بن کر بہہ نکلے۔ پھر وہ آسانی سے اُس پر قابو پائے گا۔ گنوارن جو ٹھہری۔ بھولی بھالی۔ موقعہ نازک تھا اُسے جلد باز ہی نہ کرنی چاہیے۔ بلکہ احتیاط سے آگے قدم بڑھانا چاہیے۔ بھولی کے دل میں اُس کے تہیں رحم آ بھر گیا تو سمجھو کام ہو گیا۔ اُس نے آگے بڑھ کر بھولی کے پاؤں پکڑ لئے اور آواز میں بے انتہا رقت پیدا کر لی۔

بھولی تہیں میری قسم نہ... نہ رو بھولی... مجھ سے تمہارا رونا سہا نہیں جاتا۔

وہ عبدالسلام کے یوں پاؤں پکڑنے سے گھبراسی گئی۔ پاؤں پکڑنے کے بہت
 سارے مطالبہ تھے۔ لیکن عبدالسلام کے لیے نے اسے سہارا دیا۔ بہت درد
 سقا عبدالسلام کی آواز میں پھوٹی کے دل کو گھٹیں سی لگی۔ ایک اپنی مانتی۔
 جو اسے گھٹنوں روتا دیکھ کر کبھی بھیج نہ جاتی تھی۔ اور ایک یہ عبدالسلام
 سقا جو اس کا ذرا سارو نا بھی نہ سہہ سکا۔ آج پہلی بار کسی کو اپنے
 متعلق متفکر محسوس کر کے اسے عجیب لذت کا احساس ہوئے لگا۔ دل
 میں جتنی کچھ کدورت تھی وہ دھل گئی۔ جی چاہنے لگا۔ عبدالسلام
 پاؤں پکڑنے کے بجائے اسے پکڑ کر گلے سے لگائے۔ بھینچ بھینچ کر
 پیار کرے۔ یہاں تک کہ اس کی ہڈیاں چٹخ جائیں اور جسم میں بے تپاؤ
 کے پر خچے اڑ جائیں۔ جس تناؤ کو عبدالسلام نے اسی جگہ جنم دیا تھا۔ اور
 جس تناؤ نے تب سے اس کی راتوں کی تیندھرام کر دی تھی۔

پھولی کا بدن ڈھیل پڑتے دیکھ کر عبدالسلام نے اپنی کوشش
 تیز کر دی۔ پیر چھوڑ کر اس نے پھولی کے چہرے سے بازو اٹھانے شروع کئے۔
 زبان بدستور چل رہی تھی۔ جسے کہ باقی کرتے کرتے گلا سوکھ گیا۔
 لیکن اس نے رخصت کی جرات نہ کی۔ ستائے کے لیے رک جائے
 تو شاید پھولی کا ذہن پھر سے بدھک جائے۔

پھولی کا سر جھکا تھا۔ اس نے گدگدی شروع کر دی۔
 پھولی کی آنکھوں میں آنسو سوکھ گئے۔ گدگدی تیز ہونے لگی اور اس
 کے منہ پر مسکراہٹ پھیلنے لگی۔ سارا وجود فور جذبات سے ڈانڈول
 ہونے لگا اور جب عبدالسلام نے اسے سینے سے لگا لیا۔ تو وہ شرم اور خوشی
 کا لہروں میں بری طرح سے جھکے کھانے لگی تھی کہ عبدالسلام کے چوڑے چکلے سینے
 لینے پر مجبور ہو گئی۔

رحمان جاگ پڑا تو عبد السلام کو کمرے میں موجود نہ پایا ۔
 عبد السلام شاید سُنہ یا سُنہ دھوئے گیا تھا رحمان اٹھا کہ اُس کی واپسی
 تک چائے تیار کرے عبد السلام کو وہ بچال میں خوش رکھنا چاہتا تھا
 تاکہ اُسے کچھ اور فحش کا آسرا ملے عبد السلام کے تھیلے سے کچھ
 نانوائی کی روٹیاں بھی برآمد ہوئیں اُس نے ایک روٹی کا کنارہ
 توڑ کر منہ میں ڈالا روٹی بہت سیٹی لگی بہت دن ہو گئے تھے
 اُسے شہر کے نانوائیوں کی بنی روٹی چکھے ہوئے اس سکاؤں
 کے نانوائی تو پورے تھے نہ معلوم کیا الالامیلا دیتے تھے آئے ہیں
 اُس نے اندازہ لگایا اور اُس کو یقین نہ آیا صرف پندرہ دن
 ہو گئے تھے یہاں آئے اور لگتا تھا جیسے شہر سے آئے ہوئے
 پندرہ مہینے ہو گئے ہوں جی چاہتا تھا کہ اٹکے شہر واپس چلا
 جائے نئی نئی فلمیں ، یار دوستوں کی گپ شب ، بازاروں
 کی چہل پہل ان چیزوں کے لئے اُس کا جی ترس رہا تھا
 اب کے موقع ملا تو وہ سر نیگہ ضرور جائے گا باپ کا سُنہ دیکھے

جیسے عذیاں گزر گئیں تھیں کیا معلوم باپ اُس کے بغیر کتنا
 اور بوڑھا ہو چلا ہو گا مزدوری ملے ہی وہ باپ کے لئے ایک
 اچھا سی ٹوپی بھی خریدے گا خرید و فروخت کا سوال اُٹھتے
 ہی اُس کا ذہن کئی بازارک خیالوں میں اُجھ گیا کزنائی کی لڑکی سے
 اُس کی شادی طے ہونے جا رہی تھی اُس کے باپ نے بیٹے
 کی شادی کے لئے بہت سارا سامان اکٹھا کیا تھا اب کے جو
 وہ بنائے تھا شہر تو پختہ نہ کچھ اپنی ہونے والی پوی کے لئے بھی
 خریدے گا کوئی خوبصورت سارواں یا خوشبودار تیل کی بوتل
 ضرور کچھ لے جائے گا سسر کے دل میں عزت بڑھ
 جائے گی۔

انہیں خیالات میں مست اُس کو وقت کا کوئی حساب
 نہ رہا نہ ہی عید السلام کی غیر موجودگی کا کوئی خیال رہا وہ مزے
 مزے سے کھانا بنانا رہا حتیٰ کہ خود چائے پینی بھی سنبھول گیا کھانا
 بن چکا تو اُسے چوتے کی گرمی برسی محسوس ہوئی اُس نے کھڑکی
 کھول لی سورج کافی اوپر چڑھ آیا ستھار کر نین روشندان تک
 پہنچ گئی تھیں تب اُسے احساس ہوا کہ عید السلام کمرے میں نہیں
 ہے اور اُس کے پاس اتنا وقت نہیں کہ انتظار کرے چائے
 پینی بھی دشوار تھی جلدی سے اپنا کھانا پوٹلی میں باندھ کر وہ
 گھر سے باہر نکل آیا کام کی جگہ پہنچنے تک اُس نے قریباً
 ڈیڑھ میل راستہ اپنا ستھار دوڑ لگا کر تو وقت پر پہنچ
 جائے گا شاید.....

گلی کے ٹکڑے پر اُسے عبد السلام ملا، رحمان نے جلدی میں
مکان کی چابی ستمادی تو عبد السلام نے پوچھا۔

”یوں بھاگے کہاں جا رہے ہو.....“
”صاحب کلام پر جانا ہے۔ دیر ہو گئی ہے۔ کھانا بنا لیا ہے
اوپر چائے بھی بنا رکھی ہے۔ ہاں..... گرم کرنی پڑے گی۔“
”کوئی بات نہیں..... میں گرم کر لوں گا..... تم
نے چائے تو پی لی“

”سہیں صاحب..... بھلا آپ کے بغیر چائے کیسے پی لیتا
.....“ رحمان نے برخور داری نگاہ کی۔ کسی طور عبد السلام کو
خوش رکھنا سنا۔

”ارے بھئی چائے پی لی ہوتی۔ انتظار ناخکی کیا۔ میں ذرا پیہ
علقہ کو جانچ رہا تھا“ عبد السلام خواہ مخواہ شہس پڑا۔
”کوئی بات نہیں صاحب..... آج نہ سہی تو کل سہی...
..... کام پر جانے میں دیر ہو رہی ہے“ رحمان بے صبر
ہو گیا۔

”ہاں..... ہاں جاؤ.....“ رحمان جانے لگا تو عبد السلام
نے دو روپے کا نوٹ جیب سے نکال کر اُسے پکڑا دیا۔ ”دیکھو
..... رات کو آتے وقت آدھ سیرگوشٹ لیتے آنا..... اچھا
گوشت خرید لانا۔“

رحمان کا دل جھوم اٹھا۔ مدتیں ہو گئی تھیں گوشت کھائے
ہوئے عبد السلام کی دریاوی کے مقابلے میں اُس نے نیچی جتائی۔

کو بھی عرصوں ہو نوکیلے جوتے کی نوک موٹے بدن میں اندر
 کتنی دور کتنی تنگ کھب سکتی ہے، اور کھب کر کتنی آن
 گنت درد کی لہروں کو جنم دیتی ہے، لیکن اس کے پاس چمچ
 کرتا ہوا نوکدار بوٹ نہ تھا اور ٹھیکہ دار کے بدن کو چربی کی
 دہیزتوں نے ڈھک رکھا تھا، شاید اسی لئے مزدور کی چیخ
 و بچار ٹھیکہ دار کے دل تک نہ پہنچ سکی تھی، ویسے رحمان خود
 ایک مزدور ستھار، جھگڑ پڑتا تو مزدور مایا جاتی رہتی، ظاہر ستھا دینا
 ناتھ پر بھی نزلہ گرتا جس کی وساطت سے وہ اس کام پر لگ گیا
 تھا، چپ رہنے میں سب کی بہتری تھی، اور وہ چپ رہا تھا
 ————— یہ تب کی بات تھی جب رحمان نیا کام پر آگیا تھا
 شہر کا آدمی ہونے کی وجہ سے وہ اتنا کام نہ کر پاتا تھا جتنا گاؤں
 والے کر سکتے تھے، میٹھ نے حسب معمول ڈانٹ دیا تھا پر
 دینا ناتھ کے کہنے سننے سے اب میٹھ کی زبان بھی خاموش
 رہتی، لیکن مزدوروں پر اٹا اٹر پڑا، مزدور اس کو ٹھیکہ دار
 کا جاسوس سمجھنے لگے، نہ اس سے زیادہ بولتے تھے نہ اس
 کے پاس بیٹھتے تھے، رحمان نے پہلے پہل مزدوروں کے رویے
 کی طرف کوئی دھیان نہ دیا، وہ اسجانے میں اپنا کھانا لے کر
 رات کے پاس بیٹھتا، ٹھیکہ دار کی ڈیل ڈول کا تسمسرا اٹاتا،
 گنجی نانکا مذاق اڑاتا اور کبھی کبھی ان کے گنوار پن کا مذاق اڑاتا
 لیکن مزدوروں نے کبھی اسے شہ نہ دیا، اس نے سارے
 آدمیوں کے پیچ ہوتے ہوئے بھی وہ اکیلے رہ گیا، وہ لاکھ سمجھاتا،

پھرے کہ وہ ٹھیکہ دار کا آدمی نہیں صرف دینا نامتھ کا دوست ہے۔ لیکن کسی مزدور کو یقین نہیں آیا۔ بلکہ آخری رشتے کو بیان کر دہ اور بھی بدک گئے۔ نوبت یہاں تک آگئی کہ وہ اندر ہی اندر مزدوروں۔۔۔ رکھنے لگا۔ وہ دل ہی دل میں گڑھتا مزدوروں کو کھتا اور سنا سنا کے کھتا۔

آج جب وہ دیر سے بیٹھ کے سائے پہنچ گیا۔ تو ہر مزدور کی نگاہ اس پر مرکوز ہو گئی۔ رحمان کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ کاش..... بیٹھ اسے ڈانٹ دے۔ یا عیرف ٹوک دے۔ کم از کم مزدوروں کی بچا ہوں میں نفرت کی شدت تو کچھ سرد پڑتی۔ لیکن بیٹھ مستری سے ڈرتا تھا۔ مستری کے دوست کو ڈانٹ دے تو ناراض ہو جائے۔ مستری ناراض ہو گیا تو وہ مزدوروں سے اپنا کمیشن وصول نہ کر سکے گا۔ اس لئے بیٹھ نے رحمان کو ڈانٹا نہیں بلکہ ذرا الگ لے جا کر سمجھانے لگا۔

”بھئی رحمان۔ میں جانتا ہوں“ تم مستری صاحب کے آدمی ہو۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میری پرواہ ہی نہ کرو۔“
”میں حاضر ہوں۔ حضور۔۔۔۔۔۔ کوئی کام ہے“
رحمان نے انکساری ظاہر کی۔

”ایسا تو کوئی کام نہیں ذرا وقت پر آیا کرو۔ دوسرے مزدوروں کو تم غیب مٹی ہے“ بیٹھ اپنا مطلب واضح کرنے سے ہچکچایا۔

میل کا چکر لگاؤں کی دوکان تک کھانٹے پر آمادہ ہو گیا۔ تاکہ
شکریت لائیک اور سگریٹ پھونک پھونک کر ان مزدوروں
کا دل بھی پھونک دے جنہوں نے نفرت بھری نگاہوں سے اُس
کے دل کو پھونک کے رکھ دیا تھا۔

شام کو کام بند ہونے سے پہلے آسمان پر گھن گھور
بادل اُہرائے۔ ٹھنڈی ہوا کے ٹوکے رونا روتے اور سفید
کے درخت جھوٹے لگے دھڑکی خاموش سطح پر لہروں کے
تہتہ کھل اُٹھے۔ دن کی گرمی ماند پڑ گئی۔ مٹی کے ٹوکے
اُٹھاتے اُٹھاتے اُس کا مجسمہ احوال ہو گیا تھا۔ پسینے سے تر
بدن میں ٹھنڈے جھونکوں نے جان سی ڈال دی۔ وہ دن
سبحر کی ساری شمع کو بھول گیا۔ اپنے ساتھیوں کی سردھری بھول
گیا۔ سواماتی کی تلخ کلامی بھول گیا۔ اور نرنگ میں آکر ایک پیارا
سافلی گیت گنگنانے لگا۔ گیت کی لے پر اُس کے پیر ناچنے
لگے۔ کمر بتر کھینے لگی۔ اور سر پر رکھی مٹی سے بھری ٹوکری
بھی چلنے لگی۔ اُس نے داد طلب نگاہوں سے ارد گرد مڑوڑا
کی طرف دیکھا۔ مزدور اُسے ایک ٹک گھوڑے جا رہے تھے۔
اُس کے حلق میں گنگناہٹ مرسا گئی۔ اُس نے ایک مزدور سے
پوچھا۔

کیا بات ہے، تم میری طرف ایسے کیوں گھور رہے
ہو۔ کیا پہلے کبھی نہیں دیکھا ہے مجھے؟
مزدور رحمان سے تنویر مندا تھا۔ اُس نے گرفت لہجے میں

جواب دیا۔

”بڑے خوش نظر آ رہے ہو۔ جو گانا گایا جا رہا ہے۔“
رحمان کو مزدور کے لہجے سے چڑسی ہو گئی۔ اُس نے فلمی انداز
میں جواب دیا۔

”دیکھتے نہیں۔ کیسا سہانا موسم ہے۔ خواہ مخواہ گانا
گانے کو جی چاہتا ہے۔“

مزدور نے فلمی انداز سے موعوب ہوئے بغیر پہلے
’جیسے کہ سنت لہجے میں کہا۔
’فصل کپ رہی ہے۔ بارش آگئی تو ساری فصل خراب
ہو جائے گی۔“

تب رحمان کو پتہ چلا کہ اُس کے گانے پر مزدوروں کو
کیوں اعتراض ہے۔ لہجے بعد مزدوروں کی نگاہیں آسمان کی
طرف اٹھ جاتیں۔ جیسے اپنی نگاہوں سے بادل کو پھیلنے سے
روک لیں گے۔ لیکن بادل کتنے کہ بڑھتے ہی جا رہے تھے۔
واقعی یہ سہانا موسم مزدوروں کے لئے کسی طوفان سے کم
نہ تھا۔ اُن کا اعتراض بجا تھا۔ بے چارے غریبوں کی سال
بھر کی محنت برباد ہونے کا خطرہ تھا۔ واقعی اُسے گنگنا ناہ
چاہیے بلکہ ہمدردی جتنی چاہیے۔ لیکن مزدور کا کمرخت
لہجہ بجا نہ تھا۔ اُن گانوں والوں نے شاید اسے شہر کا آدمی
سمجھ کر ہمدردی سمجھ لیا ہے۔ کیا پڑی ہے اُسے اِن مزدوروں
سے ہمدردی کرنے کی ہوا سے پرایا سمجھتے ہیں۔ ٹھیکہ دار

کا آدمی سمجھتے ہیں۔ اُس سے نفرت کرتے ہیں۔ وہ کائے غم
 اور ضرور کائے غم۔ خلق بھاڑ بھاڑ کے کائے غم
 میری مرضی ہے کائناتوں یا چپ رہوں۔ میرے
 نہ گانے سے بادل تھوڑی ہٹ جائیں گے۔ وہ پھر گیا
 "تم نہیں سکا سکتے۔۔۔۔۔" "مزدور ایک قدم آگے
 بڑھ آیا۔ رحمان نے چاروں طرف دیکھ لیا۔ ہر مزدور کی
 نگاہ اُس پر جمی تھی۔ دور ایک درخت کے نیچے بیٹھ بیٹھا ہوا
 تھا۔ شاید سو گیا تھا۔ اکیلے بیٹھا پڑے گا۔ ان سب
 مزدوروں سے۔ آج وہ بگیا تو عمر بھر دبتا رہے گا۔ یہ
 شہر کی عزت کا سوال تھا۔ فیصلہ کر کے اُس نے بھی ایک
 قدم آگے بڑھایا۔ ہمارے مزدوروں نے کام رک دیا۔
 رحمان اور مزدور لڑائی کی شروعات پر آ کر آئے۔ ایک
 دوسرے کو ناپ ناپ کر گالیاں دینے لگے۔ شور مچا
 کر بیٹھ کی آنکھ کھل گئی۔ "مُر کا دیکھ کر وہ دوڑا دوڑا آیا
 اور ڈانٹ ڈپٹ کر دونوں کو الگ کر دیا۔ کام پھر شروع ہوا
 بین رحمان کا موڑ بالکل بگڑ گیا۔ اُس نے گنگنا چھوڑ دیا۔

_____ رات کو جب رحمان دینا نامتھ کے گھر پہنچ گیا۔ تب بھی اس کا موڑ خراب تھا۔ آنگن میں مالک مکان کی بوڑھی اسے سنکھا رہی تھی۔ چھانٹ رہی تھی۔ رحمان نے حسب معمول آج اس کے ساتھ کوئی بات نہیں کی۔ بلکہ سیدھا دڑاتا ہوا دروازے تک گیا۔ مکان کے اندر سے سو مواتی کی اونچی آواز سنائی دی۔ شاید سو مواتی بیمار تھی یا شاید دینا نامتھ بیمار تھا۔ آج دن بھر نہ دیکھا تھا۔ موسم خراب تھا۔ بادل چاروں طرف چھائے ہوئے تھے۔ پہاڑوں پر شاید روز بارش ہوا کرتی ہے۔ دریا کا پانی بھی چڑھا چڑھا رہتا تھا۔ یا کہیں سو مواتی کی دروازہ نہ ہو۔ حاطہ تو تھی۔ کہیں... بچہ بے دھڑک اندر جانے سے بچ گیا یا۔ اس نے آواز دینی مناسب سمجھی۔

بھی دینا نامتھ... دینا نامتھ اس کی آواز لگانے کی دیر نہ کھا۔ کہ کوئی سایہ اندھیری راہداری سے الگ ہو گا۔ زینہ چڑھ گیا اور سب اسے محسوس ہوا کہ مالک مکان کی بیوی جیسے پیسے کان لگا کر دینا نامتھ اور سو مواتی کی باتیں سن رہی تھی۔ رحمان کو متحہ آگیا۔ واقعی اس گاؤں کا ہر آدمی کہتا ہے۔

ان پر بالکل رحم نہ کرنا چاہئے۔ دینا ناسخہ کی آواز سے اسے مزید
سوچنے کی ہمت نہ دی۔

”اندر آؤ مگھئی... اندر آؤ۔ باہر کیوں کھڑے ہو۔“

سوماتی بیمار نہ تھی۔ اپنے بڑے بھائی کو کھولے بیٹھی پڑے
الٹ پلٹ رہی تھی۔ اور ساتھ ساتھ روتی جا رہی تھی۔ دینا ناسخہ بیوی
سے غافل دیوار سے پیٹھ لگا کر بیٹھوں میں سر پیٹے دابے سوماتی کے
آنسوؤں سے بے نیاز اپنے پیروں کو پلاسے جا رہا تھا۔ رحمان شش و
ہفتج میں بڑی گی۔ میاں بیوی کے جھگڑے میں بون مناسب نہ تھا۔ وہ کسی
سے مخاطب ہو۔ دینا ناسخہ نے اس کی مشکل آسان کر دی۔

”بیٹھ بھئی رحمان... تم ٹھک کیوں گئے۔ یہ تو روز کا در دوسرا ہے۔“
”میں کھتا رہے لئے در دوسرے ہوں تو بیباک کر کیوں لے آئے تھے۔“
”... سوماتی چیخ پڑی اور رحمان گھبرا گیا۔ اس کے منہ سے بے اختیار
نکل گیا۔

”سجائی آہستہ۔ باہر لوگ سن رہے ہیں۔ وہ سن لیں گے تو
کی سمجھیں گے۔“

”ہاں ہاں تم بھی اس کی طرف داری کرو۔ میں تو اس کے مدارے
خاندان کی دشمن ہوں۔ سوماتی اور زور سے روئے لگی۔
”پر ہوا کیا... رحمان نے پوچھا۔

”پوچھا کیا تھا...“ دینا ناسخہ نے وضاحت کی ”یہاں
کی کثرت ہے کہیں سے ایک جوہر ٹھک میں گھس گیا اور کپڑوں کا
مٹیناں کر دیا۔ کہا تو سمجھاؤں میں میری محنت کی عزت نہیں چاہئے

کپڑے ساتھ لے آئے تھے۔ لیکن صاحبزادی نے کسی کا کہنا مانا ہو
اس خادم کا مان لیتی

”ہاں بھابی دینا نامتھ نے کھٹیک کہا تھا۔ ویسے اس سال چوبیس
بہت بڑھے ہیں، گاؤں والے کہتے تھے کہ جس سال چوبیس زیادہ ہوتے
ہیں اس سال خوفناک بارش آتی ہے اور موسم کے اتنا فرق نہ دیکھ
ہی پاتی ہو۔ دریا کا پانی بھی رحمان نے اپنی دانست میں بات بدلتی
چاہی لیکن میاں بیوی راہنی بھی ہو جاتے۔ دینا نامتھ نے بات پھر اُسی
لکھتے پر لاکھڑی کی۔

”بھئی۔ تمہاری بھابی مجھ پر الزام دے رہی ہے کہ میں نے بڑنک
جان بوجھ کر کھلا جھوٹا۔ اس کی عقل کی داؤد دو“

”تم تو چاہتے ہو کہ میں پھٹے پرانے چیتھڑوں میں سڑا کر دوں۔ نورانی جو
مٹھری سوماقی نے الزام کی وضاحت کی۔

رحمان جھنجھلا گیا۔ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے سے رٹنے
پر اُدھار کھائے بیٹھے تھے تو وہ کیا کر سکتا تھا۔ پھر سچی دوستی کے نامے اُسے
دینا نامتھ سے زیادہ ہمدردی تھی اس لئے اُس نے ایک وقفہ اور بات
بدلتے کی کوشش کی۔

”میرا مطلب ہے بھئی کہ میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ دریا میں بارش
اس میں کسی کا کیا قصور“

دینا نامتھ نے اس کی بات کاٹ کر فیصلہ کن لہجہ میں کہا ”جھوٹ و
بھئی رحمان۔ تم بھی کسی کے منہ لگتے ہو“

خادم کی بات سن کر سوماقی کھڑکی شیرازہ کو مڑتے مڑتے ”ہاں ہاں

غیروں کے سامنے مجھے بے عزت کر دو۔ اپنا مکینہ بن سب کو دکھاؤ۔
 ————— حنا سمجھا "کالی کا لٹا سن کر دنیا نامتھ نہ معلوم کیا کر بیٹھے
 تھا اب تک دنیا نامتھ کے گھر آسنے کسی عورت کو ایسی زبان استعمال کرتے
 نہ سنا تھا۔ لیکن شاید سراقے لگا لیاں دینے کی پہل بہت دنوں سے کر رہی
 تھی کیونکہ دنیا نامتھ کو غصہ بالکل نہ آیا بلکہ سمجھنا رحمان کی طرف سے متنازعہ
 رنگا ہوں سے دیکھنا "رحمان کو کاشمیر آئی ہے کیا بچپن سے ساتھ بڑے ہیں۔
 سارے کہتے ہیں"

"بھئی تریہ مکینہ بن بیچھ گئے ہو۔ جیسی روح ویسے فرشتے" ساقی
 کے الفاظ سن کر رحمان کا چہرہ لال ہو گیا۔ اب باقی کیا رہا تھا اس
 گھر میں۔ اس سے برقی بھڑائے گئے۔ حباب دیوانی لگی اور نوکروں جیسا
 برتاؤ کیا گیا۔ آج گالیاں بھی دی جا رہی ہیں۔ جیسے وہ دنیا نامتھ کا
 دوست نہ تھا بلکہ کوئی گنا تھا۔ جو اس گھر کے چکر دگ رہا ہو۔ اب اس
 گھر میں کتنا فضول تھا۔ بہت پہلے ہو ا کا رخ بھانپ لیا چاہئے تھا اسے۔
 وہ چپکے سے اٹھا اور باہر جانے لگا۔ دنیا نامتھ نے روکنا چاہا۔ تو ساقی
 گرج پڑی۔

"یاد دوستوں کی خاطر بیوی کو ہی چھوڑ دو۔۔۔" اور کیا سکھ لیا ہے
 تم نے دوستوں سے۔"

"بکومت۔۔۔" دنیا نامتھ سمجھ بڑا "تم بہت آگے بڑھتی جا رہی ہو۔"
 "اوہو۔۔۔" اب میں کب اس بھی گھر کرنے لگی ہوں "سوہا نے فوٹو میں
 مار مار کر دنا شروع کر دیا۔ نوڈی کی طرح کام کر دو اور جو منہ کھولو تو
 منہ نہ چیتے ہو۔"

رحمان تے جوتے پہن لے تھے۔ میاں بیوی کے جھگڑے میں بنیا موڑ پا کر اُس کے قدم بغیر
 ادا دی طور پر رُک گئے۔ رحمان جانتا تھا کہ دینا نا تھ پین سے خود سر ہے کہیں غصے کے
 زیر اثر سوما دتی پر ہاتھ اٹھا دے تو برا ہو گا۔ سوما دتی حائل تھی۔ چوٹ لگی تو جان پر بن آنے
 کا خطرہ تھا۔ اُس نے مداخلت کی تو بھی دینا نا تھ۔ مرد ہو کر تم ہیں برداشت کا مادہ زیادہ
 ہونا چاہیے۔ تم ہی ذرا نرمی برتنو۔۔۔۔۔“

نرمی ہی تو دکھائی اب تک جو یہ دن دیکھ رہا ہوں ”دینا نا تھ نے بیوی کو قہر
 آلود نگاہوں سے گھورتے ہوئے کہا۔

”اب پُرانی باتیں بھول جاؤ۔ مکان والے سُن رہے ہیں۔ کیا سمجھیں گے وہ۔“ رحمان
 نے دینا نا تھ کو غیرت دلا دی اور بوکھلا گیا۔ سوما دتی اُسے برس پڑی۔

ہم میاں بیوی چاہے ایک دوسرے کو ماریں۔۔۔ بیٹیں۔ غیرتوں کو کیا جو مسئلہ
 ہے تو سُنا کرے۔ میری جوتی کو نہیں پر داہ“

رحمان کی زبان اب کے رُک پائی۔ سوما دتی کے ہاتھوں وہ کافی بے عزت ہو گیا
 تھا۔ اُس نے صاف صاف کہہ دیا۔

”بھابی میں تب سے اس گم میں آیا کرتا ہوں جب تم بیاہی نہیں گئی تھی۔ کبھی بھابی
 ۔۔۔۔۔ میں کوئی غیر نہیں۔“

سوما دتی نے خاندان کی اور دیکھا اور طنز بھرے لہجے میں کہا ”مرد ہو تو تم
 جیسا۔۔۔۔۔ بیوی کا بھی مذاق اُڑاؤ۔۔۔۔۔ کھنڈک پڑ رہی ہوگی کیلچے پر۔۔۔“

دینا سرا سیدھا۔ رحمان کی خاطر بیوی سے لڑ رہا تھا۔ کیا ضرورت تھی رحمان
 کو جواب دینے کی۔ سوما دتی بڑی سہی لیکن اُس کی بیوی تو ہے۔ اور دوست ہونے
 کے ناطے رحمان کو اُس کی بیوی کا کچھ تو ملاحظہ کرنا چاہیے۔ کچھ نہ سوچ کر اُس نے رحمان
 کہا ہنہ پکڑ لی سلیپر پہن لیا اور یا ہر محل آیا تا شمع میں مالک مکان کی ماں اور بیوی

ہوتا جا رہا ہے۔ شاید دیر ہو رہی ہے جی تو چاہتا تھا رحمان کے سامنے اپنا دل ہلکا کر دے۔ بچہ اپنی کہنے کچھ اُس کی سنے۔ لیکن رات روکی تو بہتیں جاسکتی۔ اور سوماوتی گھر پر اکیلے تھی۔ ڈر گئی تو ایسی حالت میں سنبھالنا مشکل تھا۔ کاش رحمان اُس کی چھوڑیاں کچھ سکے۔

گھر پر ماں بی ناراض ہے۔ بہنارا با پ ناراض ہے۔ رشتہ دار ناراض ہیں۔ تم بھابی کو سمجھاتے کیوں نہیں۔ تم مڑو ہو۔ گھر کی باگ ڈور تمہارے ہاتھ میں ہے۔“
رحمان دینا ناتھ کے دھودیں پھیرے ایسے پھوڑوں کو چھو رہا تھا۔ جن کا احساس دینا ناتھ کو تھا۔ پر اُن کی حدیں واضح نہ تھیں۔ نہ ہی اُس کا جی کرتا تھا۔ کہ اُن پھوڑوں کی حدود کبھی واضح ہوں۔ اتنے برس بیکار رہ کر اُس کی عزت پر ایک کی نظروں میں گر گئی تھی۔ اب سو فائدہ مل گیا تھا۔ کہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے۔ اور پیار دوست سے ملنے کے آگے آ رہے تھے۔ اُس نے رحمان کو روکا۔

”رحمان... میں یہ سب باتیں سمجھتا ہوں۔ لیکن سوماوتی میری بیوی ہے۔ اُس نے میرے ساتھ گھر بسایا ہے۔ میں اُسے چھوڑ نہیں سکتا۔“
”میں پھوڑے تو کب کب رہا ہوں۔“ رحمان ناراض ہو گیا۔ ”بھلا مجھے کیا حق ہے ایسی بات کرنے سے۔ وہ تو میری بھابی ہے۔ بہن کے برابر ہے۔ ایسی بات کہتی نہ چاہیئے تھی۔ خیر۔۔۔۔۔ چھوڑاں پاؤں کو۔ دیر ہو رہی ہے مجھے اجازت دو۔ کھانا بھی بنانا ہے۔“

جب کبھی وہ ایک دوسرے سے ناراض ہوتے تھے تو ایک دوسرے کو منا بھی لیتے تھے۔ دینا ناتھ نے رحمان کی ناراضگی سے جانپ لی۔ اس لئے اُس کی چاہا رحمان کو گھسیٹ کر گھر لے جائے۔ اور دونوں اکٹھے کھانا کھائیں۔ مدین ہو گئی تھیں ایک ہی تھالی میں کھانا کھائے۔ لیکن گھر پر سوماوتی جتنے بھلائے بیٹھی

ایک ایک پیٹھے سے زور اور طاقت کا اظہار ہو رہا تھا۔ چوکھٹے کے
 سہارے کھڑی پھوٹی کی ماں کو ایسے لگا جیسے اس کے سامنے
 رحمان نہیں بلکہ اپنا مرحوم خاوند بنو یا بڑا ہو۔ وہی
 گور گور اکسرتی بدن۔۔۔۔۔ وہی مضبوط مضبوط د لڑکی ٹھیلیوں
 جتنے پیٹھے۔۔۔۔۔ وہی تین تین کمان جیسی لڑکھکی بڑی۔ یاد آتے
 ہی اُس کی آنکھیں دھندلا گئیں۔ اُس نے آنکھوں کو بے دردی
 سے مسلا اور شانے بے نیازی سے جھٹک دیئے۔ جیسے
 شانے جھٹک دینے سے کوئی اپنے ماضی کو جھٹک سکتا ہے۔ کبھی!
 جیسے رحمان اُن کے ہاں رہنے کو آیا تھا۔
 اُسے اپنا خاوند بار بار یاد آتا تھا۔ رحمان کی آواز بھی اُس کے
 خاوند جیسی بھاری بھاری لگتی تھی۔ یا شاید اُس کا آوارہ ذہن
 رحمان کی بھاری آواز کو زبردستی مرحوم خاوند کی آواز میں ڈھال
 لیتا تھا۔ مَدَنیں بیت گئی تھیں خاوند کی آواز سننے ہوئے۔ بھلا
 اب آواز کہاں یاد رہی ہوگی۔ اتنے برس بعد کسی مرد کی بے تکلف
 آواز کو اپنے مکان کی چار دیواری میں سن سن کر اُس کے ذہن نے
 غیر ارادی طور پر اس آواز کو اپنے ارمانوں کے ساتھ منسلک
 کر دیا تھا۔ اپنے مرحوم خاوند کی آواز سے منسلک کر دیا تھا۔
 جس کی آواز کبھی اس مکان کی چار دیواری میں گونج چلاتی تھی۔ بلکہ
 اُسے محسوس ہوا وہ ناحق اپنے آپ کو ہلکان کر رہی ہے۔ رحمان
 کسی وقت بھی یہ گھر چھوڑ کے جا سکتا ہے۔ جو اپنے ہفتے وہ
 ساتھ نہ دے سکے تو پرانے لوگوں کا کیا ؟

وہ دروازے کی چوکھٹ سے ذرا آگے بڑھی۔

تو رحمان کا سر بھی نظر آنے لگا۔ رحمان کی آنکھیں نیم دائیں
منہ تکیے کے دباؤ سے کھل گیا تھا۔ اور منہ میں سے رال بہہ
کرتی تھی۔ پر گہری سستی رہا۔ سنا کے فطری جذبے نے اسے آگے
بڑھتے پر اکتفا دیا۔ کہ پھر کے کنارے سے رال پونچھ دے
لیکن وہ آگے نہ بڑھی۔ رحمان کہیں جاگ گیا تو شاید کھینچا
ہو جائے۔ بھلا اس عمر میں بھی کسی کی رال گرتی ہے۔ بہت
محنت کرنی پڑتی ہوگی۔۔۔۔۔ تبھی بے حال پڑا ہے۔

”رحمان۔۔۔۔۔ رحمان بیٹا۔ اسٹوڈیو پر ہی ہے۔۔۔۔۔“
بوڑھیانے کمرے کے وسط میں کھڑے ہو کر بیٹے کی طرف
لہجے میں پکارا۔ لیکن رحمان نہ جاگا۔ بوڑھیانے چاہا
ہاتھ بڑھا کر جھنجھوڑ دے۔ دن بہت چڑھا آیا تھا۔ اور
رحمان نے رات کو تاکید کی تھی کہ اس کو صبح سویرے جگا یا جائے
کچھ بڑے افسر کام دیکھنے آرہے تھے۔ لیکن وہ کیسے چھوئے
پرائے سرو کو۔ تین تین ہو گئے تھے رحمان کو اس گھر میں
رہتے ہوئے۔ اور اس نے رحمان کے کسی انگ کو آج تک نہ
چھوا تھا۔

عبدالسلام کا بھلا ہو جس نے اُن کی عزت پر
ترس کھا کر رحمان کو اُن کے گھر کرایہ دار بنادیا۔ بہت بھولا
تھا رحمان۔ ہر دم اُسے مان کہہ کر پکارا کرتا تھا۔ دل کا کھوٹا
ہوتا تو اپنا رشتہ ہم سے نہ پھواتا۔ شک کرتا کہ ہم رشتہ میں

ڈال دیتی ہے اُسے راکھ کر دیتی ہے۔ محسوس ہوتے ہی
 اُس سے کمرے میں نہ رہا گیا۔ وہ اُلٹے پیر واپس لوٹ آئی۔
 بیٹھیاں اتر کر وہ باوپی خانے میں گھس گئی
 پھولی نے سٹی کی رکابی میں سنگھاڑے کے آٹے کی دو موٹی
 روٹیاں بروس رکھی تھیں اور پتیلے میں بغیر دودھ کے
 نمکین چائے کھول رہی تھی۔ رحمان نے پہلے کبھی سنگھاڑے
 کے آٹے کی روٹیاں نہیں کھائی تھیں۔ اس لئے یہ روٹیاں
 ہضم کرنا اُس کے بس کا روگ نہ تھا۔ لیکن چاول نام کو بھی نہ
 ملتے تھے۔ بارش نے فصل کو نقصان پہنچایا تھا۔ جس کی وجہ سے
 قحط کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ جو کچھ چاول بن پانا تھا وہ
 کو اپڑھ سو سائیٹ نے برائے نام قیمت پر کسانوں سے زبردستی
 شہر کی آبادی کے لئے خرید لیا تھا۔ طوعاً کرہاً رحمان کو بھی
 روٹی کھانی پڑتی تھی۔ جہاں گاؤں کے لوگ چار چار روٹیاں کھا
 کر بھی ڈکار نہ لیتے تھے۔ وہاں وہ پوری دو روٹی بھی ہضم نہ
 کر پاتا تھا۔ ویسے سنگھاڑے کے آٹے کی روٹی بنانا بہت
 مشکل تھا۔ خاص خاص لوگ ہی اس آٹے کی روٹی ٹھیک سے بنا
 سکتے تھے۔ اس لئے بوڑھیا رحمان کا کھانا خود بنایا کرتی تھی۔
 بوڑھیا کو اکیلے آتے دیکھ کر پھولی نے پوچھا "بگایا امیں
 ماں۔۔۔۔۔ چائے ابل کر کڑی ہو رہی ہے"

بوڑھیا نے پھولی کی اور دیکھا پھولی کی آنکھوں میں عجیب
 سا حمار لہرا رہا تھا۔ گالوں پر دو لال لال نشان سے اُبھر آئے

تھے۔ اور سبب بھی سمجھ لگتا تھا۔ پھولی تیزی سے عورت
 بنتی جا رہی تھی۔ بوڑھیا کے دل میں ایک نئے فتنے نے سر اُبھارا۔
 "میرے اٹھائے نہیں اٹھتا۔ جا چٹی تو ہی جگا دے۔"
 "ہیں۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔" پھولی پریشان سی ہو گئی۔ جسم
 اور صورت چھوڑ کر وہ شرم سے سمٹ سی گئی۔ اور بوڑھیا کے
 دل میں کسک سی اٹھی۔ شاید وہ خود بھی شادی سے پہلے کسی غیر
 مرد کے ساتھ جانے سے ایسے ہی شرم کر سکھ جاتا کرتی تھی
 لیکن رحمان غیر کہاں تھا۔ اپنا گھر جان کہ یہاں رہنا تھا۔ ایک
 اکیلے نے مکان کے سامنے گندے سرے، کچن کو لہلہاتی کیا رہنا
 میں بدل دیا۔ لڑکا ہوا نہ تھا۔ کماؤ تھا۔ محنتی تھا۔ پھولی کی شادی
 رحمان سے ہو جائے تو۔۔۔۔۔ تو اسے بھی بوڑھیا نے یہ بتا
 ملے گا۔ کاش رحمان مان جائے۔ اس نے شہہ دی۔
 "گم گم کیوں کھڑی ہو، مجھ سے نہیں جاگتا۔ رحمان غیر تھوڑی
 ہے جو تو شرماتی ہے۔ جانیٹی۔ دیر ہو رہی ہے۔" بوڑھیا اپنی
 دانت میں پھولی کو کھلی ڈھیل دے رہی تھی۔
 پھولی نے غصے سے سر جھٹک کر ماتھے پر ہتھ
 بال پیچھے کو پھینک دیے۔ سپرن کے بازو سے ماتھے پر ہتھ
 پسینے کے قطرے کو مٹا دیا۔ اور پیر پختی ہوئی باد پچی خالے
 سے باہر نکل گئی۔ بڑھیا سٹھیا گئی تھی۔ جو اسے بار بار رحمان
 کے پاس بھیج دیتی تھی۔ کھلا وہ کیوں کر ماں سے کہے کہ جب
 کبھی اس کا رحمان سے سامنا ہوتا ہے تو رحمان اس کو ایسے

ہونٹ کا خم بڑا خوبصورت لگتا تھا۔ جیسے کسی دودھ پیتے پے
 نے ہونٹ سیکڑ لئے ہوں۔ اور اوپری ہونٹ کے اوپر خوبصورت
 سے تراشی ہوئی ہلکی ہلکی مونچھوں نے سارے چہرے کو مردانگی
 بخش دی تھی۔ پھولی نے سوچا کہ وہ آج صبح نور عبدالسلام سے
 مونچھوں کا ذکر کرے گی۔ عبدالسلام کی لمبی لمبی گھنی مونچھوں سے
 وہ کبھی مانوس نہ ہو سکی۔ عبدالسلام کی مونچھیں دیکھ کر ہر بار
 پھولی کا ذہن دُور کے کنارے اُگی غوفناک جھاڑیوں کی طرف
 منتقل ہو جاتا تھا۔ جہاں پہلی بار اُس کی مڈ بھٹڑ عبدالسلام سے
 ملا تھا۔

وہ بھٹڑ شک گئی۔ رحمان کی آنکھیں آپ ہی آپ
 دھیرے دھیرے کھل رہی تھیں۔ شاید جان بوجہ کر نیند کا ہانہ
 کئے تھا۔

”صبح صبح تم پر نگاہ پڑی۔ آج کا دن اچھا گزرتا ہے گا۔“
 رحمان نے اپنے کمال پوچھتے ہوئے کہا یا شاید اُس کا منہ چڑا یا۔
 وہ شش و پنج میں پڑ گئی۔ رحمان کی نیند سے بوجھل آنکھیں خمار
 آلود تھیں۔ منہ ہلکی مہنی کا بادل پہنے زیادہ جاڑ ب لگ رہا
 تھا۔ وہ فیصلہ نہ کر پائی کہ اُسے ڈانٹ دے یا مہنیں دے۔
 ”زبان میں تالا پڑا ہے کیا۔۔۔۔۔۔“ رحمان اُٹھ کے
 بیٹھ گیا۔ اور انگلیوں سے بالوں کو سنوارنے لگا۔ بال کالے ریشم
 کے لچھوں کی طرح ملائم تھے۔ پھولی کا دل چاہا۔ رحمان کے بال اپنی
 نوکیلی انگلیوں میں اُلچھا کر جھنجھوڑ دے۔۔۔۔۔۔ زور زور سے جھنجھوڑے

گیا اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کون سا قدم بڑھائے چیکے سے نکل جائے یا سامنا کرے عجیب عورت سے پالا پڑا تھا، ابھی اُس بھروسہ رہی تھی اور اب خود ہی چائے پلاتے کے لئے بلارہی تھی، شاید ڈانٹ دے۔ وہ ہنسی خوشی ڈانٹ برداشت کرے گا خود ڈانٹ دے تو شاید بوڑھیا سے تشابہیت نہ کرے۔ اُس نے قدم باورچی خانے کی طرف بڑھائے۔

ندامت کے مارے اُس کا سر جھک رہا۔ جلدی جلدی اُس نے ردی کا ایک چھوٹا ٹکڑا اکھا لیا۔ پھولی سے نکالیں مانی شکل ہو رہی تھیں نکلیں پیائے کا صرف ایک پیالہ پلا کر اُس نے اپنا ہتھ روک لیا۔ بھوک غائب ہو گئی تھی۔

”اور روٹی کھا لو۔۔۔“ پھولی نے پھر سہل کی۔ رحمان بوکھلا گیا۔ وہ کچھ جواب دیے بنا ہی باہر نکل آیا۔ اُسے سُوس ہوا کہ عورت ذات کو سمجھنے کے لئے اُس میں ذرہ بھر بھی صلاحیت نہیں۔ انکُن میں اُس سے پھولی کی ماں علی۔ اور وہ نکالیں چراتے ہوئے کام پر روانہ ہو گیا۔

— بڑھیا انکُن میں پھیلی کیار یوں ہیں مہنک تھی۔ بیگن کے پودوں میں بڑے بڑے سبزی لگا۔ سب سے تھے۔ وہ ایک ایک بیگن کو ٹٹول رہی تھی۔ جیسے یقین کرنا چاہتی ہو کہ پودوں سے واقعی بیگن نکلا ہے ہیں۔ برسوں بعد تو اُس کا انکُن ہلکا اٹھا تھا۔ ایک طرف بیگن ڈال دیا۔ کھیتیں کھیتیں دوسری طرف کدو کی سیلیں اپنا جال پھیلائے، مریچ کی کیار یوں پر بیٹا رکھے ہوئے تھے۔ مریچ کی کیاریاں ہری ہری لمبوتری مریچوں سے بھری پڑی کھیتیں۔ کہیں کہیں کوئی لال مریچ اور گرد بکھری ہریالی بے بیچ چمکتے ستارے کی طرف لگ رہی تھی۔ کدو کے پودوں میں پیلے پیلے پھول سونے کے کٹوروں کی طرح پھوٹ رہے تھے۔ اور بڑھیا بستاروں اور سونے کے کٹوروں کے بیچ اتنی مہنک تھی کہ اُسے عبدالسلام کے آنے کی بھی خبر نہ ہوئی۔

— عبدالسلام نے بوڑھیا کو دیکھا۔ کیار یوں پر بھرپور نگاہ ڈال

دی اور اعتراف کرنے پر مجبور ہو گیا کہ رحمان اس گھر کا ایک فروتن یا جبار تھا۔ کہیں رحمان کا اس گھر میں گھل مل جانا اُس کے لئے نقصان دہ نہ بن جائے چھوٹی ہاتھ سے بھگتی تھی۔۔۔۔۔ لیکن بہنیں چھوٹی بھلی تھی بھلی ماں سے رام کر لینا ہر کسی کے بس کی بات نہ تھی۔

”کارڈ بیٹا۔۔۔ توڑ مھیا نے شاید اُسے دیکھ لیا۔ اور اُسے بڑھیا سے نفرت سی ہو گئی وہ جانتا تھی کہ کارڈ بیٹا ”پچھلے رتے سے ٹھٹھکا کو برتری کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اس لئے ہر کسی موقع پر یہ لفظ استعمال کرتے ہیں چوکی“ کیا دیکھ رہے ہو کارڈ بیٹا“

”باغیچہ دیکھ رہا ہوں ماں۔۔۔“ عبد السلام نے زبردستی منہ پر ہنسی پھیلانے ہوئے کہا۔ ”بہت سبزی اُگ آئی ہے“

”سب تھاری تھری ہوتی ہے کارڈ بیٹا۔ توڑ مھیا نے اُس کی بلا میں لیتے ہوئے کہا۔“ تم رحمان کو اس گھر میں کیا لئے مجھے میرا بیٹا لادیا۔

عبد السلام چوکتا ہو گیا۔ بڑھیا ذہنی طور پر بہت اُگے بڑھ آئی ہے۔ اُسے چوکیا چھوڑنا کہ قدم رکھنا چاہیے۔ ماں پر جادو کر کے کیا معلوم رحمان کا جادو چھوٹی پر بھی چل گیا ہو۔ ضرور چھوٹی پر اثر ہو رہا ہے۔ کچھ دنوں سے چھوٹی کے جذبات میں اتنی شدت نہ تھی جتنی پہلے جو کرتی تھی۔ اُسے چاہیے کہ بات بڑھنے سے پہلے تھلا رک کر۔ اُس نے بوڑھیا سے کہا۔

”چھوٹی سے کہنا میں آیا تھا۔ میری ڈیوٹی کا ٹائم بدل گیا ہے سو چاہتا ہوں کہ دراب کس وقت جانا چاہیے۔“

چھوٹی کو دُر جانے کنہدایات دینے کے بہانے وہ چھوٹی کے گھر بے روک ٹوک جایا کرتا تھا۔ اور اسی بہانے کے تحت مفرک جاتا۔

”کہدوں کی کارڈ بیٹا۔۔۔۔۔“ بوڑھیا نے کہا پچھلے کہاں۔۔۔ چائے تو پلایا“

”بہنیں ماں۔۔۔ دیر ہو رہی ہے۔ کھلیان نکس جانا ہے۔ پھر دفتر جانا ہے۔“

گاؤں سے کافی دور کھیتوں کے بیچ زمین کا ایک چھوٹا سا چر کور
 قطعہ تھا۔ ارد گرد ہریا لے کھیتوں میں وہ مٹیالے جزمیرے کی طرح
 لگتا تھا۔ اور بہت اچھا لگتا تھا۔ فصل کاٹنے کے موقع پر یہ قطعہ سارے
 گاؤں کا کلیان بن جاتا۔ قطعے کے ارد گرد چنار کے درخت تھے۔ درخت
 اتنے گھنے تھے کہ تیز بارش میں بھی زمین نہ بھیگ پاتی تھی۔ چناروں
 کی ٹہنیاں جالی کی طرح اس قطعے پر پھیلی ہوئی تھیں۔ چنار کی جڑوں
 نے بھی کہیں کہیں زمین سے سر اُبھار کر کلیان کے بیچوں جالی سا
 بن دیا تھا۔ جس کے تانے بانے میں گاؤں کے بچے اپنا مخصوص
 کھیل سمٹا کر کھیل کر رہے تھے۔ اور بڑے بوڑھے چنار کے تنوں سے
 ٹیک لگائے دیکھ سکھ کی باتیں کیا کرتے تھے۔ لیکن آج کوئی بچہ کوئی
 کھیل نہ کھیل رہا تھا۔ نہ ہی کوئی بڑا بوڑھا چنار کے تنے سے پیٹھ لگائے
 سوتا رہا تھا۔ اس سال ارد گرد پھیلے کھیتوں میں فصل گر کی بارش
 سے الجھ رہی تھی۔ اور خراب ہوئی جا رہی تھی۔ اس لئے سبھی گاؤں والے
 اس کلیان سے بے خبر گاؤں کے مصافات میں سرگردوں تھے کہ کہیں

سے کچھ کام لے تو وہ سروریاں گزار سکیں۔ فصل ہونی ناممکن تھی۔ اور
 کھلیان سونا پڑا تھا۔ کھلیان کے چاروں طرف پھیلے ماحول پر وحشت
 سی ٹاری تھی۔ لیکن عبدالسلام اس وحشتناک ماحول سے بے پرواہ ایک چنار
 کی اٹھری جڑ پر بیٹھا پھولی کا انتظار کر رہا تھا۔ انتظار کی گھڑیوں کو بھلانے
 کے لئے وہ ایک ٹہنی سے جوتے کو صاف کرنے میں لگن تھا۔ جوتوں سے
 منوں کیچڑ جھٹ گئی تھی۔ کھیتوں کی منڈیر کے بغیر اس قطعے پر آنے جانے
 کے لئے کوئی مخصوص راستہ نہ تھا۔ اور بارش نے منڈیروں کو اتنا
 خستہ حال بنا دیا تھا کہ عبدالسلام کے پیر کئی دفعہ منڈیر پر سے پھسل
 کر کھیت کی کچی گیلی مٹی میں دھنس گئے تھے۔

شاید ایک گھنٹہ ہو گیا تھا عبدالسلام کو کھلیان پر آئے ہوئے۔
 یا شاید دو گھنٹہ ہو گئے تھے۔ وہ اندازہ نہ لگا سکا۔ کیونکہ کھلیان پر
 پھیلے چنار کے پتوں سے سوزج اچھی طسرت سے نہ دکھائی دیتا تھا۔
 کاش یہ بارش رُک جائے تو کھلیان میں آنے کے بجائے وُہر کے
 کناروں پر پھولی سے ملاقات ہو سکتی تھی۔ جہاں پر کسی کی کڑیدی لگا ہیں
 نہ پہنچ پائی تھیں۔ کھلیان میں آکر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ہر چنار
 چنار کی ہر جڑ غیر مرئی نگاہوں سے اُس کی ہر ایک حرکت کو جانچتی رہتی
 ہو۔ جی تو چاہا واپس چل دے۔ پھولی سے آج ملاقات نہ ہوئی تو نہ سہی
 کبھی اور سہی۔ لیکن بدن دھن کا ساتھ دینے کو تیار نہ ہوا۔ آج اُسکے
 بدن کو پھولی کی ضرورت تھی۔ بڑی سخت ضرورت تھی۔ پھولی کے بدن
 میں وہ سب دُکھ اور جبن بھلا دینا چاہتا تھا۔ دفتر میں بڑے صاحب
 کے ساتھ جھگڑے نے خطرناک صورت اختیار کی تھی۔ راز ایک ایک

کر کے انتہا پہنچ رہے تھے۔ دفتر کے آدمیوں کو پتہ چل گیا تھا کہ وہ پوری چھپے کئی اسامیوں سے روپے بٹور رہا ہے۔ اور دفتر والوں کا حصہ صاف ہڑپ کر جاتا ہے۔

عبدالسلام کو اعتراف تھا کہ ساتھیوں سے دغا کر کے وہ بہت بُرا کر رہا ہے۔ لیکن حالات کچھ ایسے تھے جن کے سامنے وہ بے بس تھا۔ شہر میں بیوی بچوں کو خیر خرچ بھیجنا پڑتا تھا۔ یہاں اپنا گھر چلانا پڑتا تھا۔ اور پھولی کی بھی مدد کرنی پڑتی تھی۔ مکان کے کرائے پر ہی تنخواہ کا ایک بہت بڑا حصہ اٹھ جاتا تھا۔ اتنا خرچ آئے لوگہاں سے آئے۔ گذر کرنی مشکل رہ رہی تھی۔ وہ جوتانک نہ خرید پایا گو جوتے کی ایڑھی گھس گھس کر ختم ہونے کو آئی تھی۔ کہیں کہیں سلائی بھی اڑھڑ گئی تھی۔ اُسے محسوس ہوا سو نہ داری آکر وہ بھی اُس جوتے کی طرح گھسا جا رہا ہے۔ اُس کے ذہن کی سلائی بھی اڑھڑ رہی ہے۔ وہ اپنے آپ سے لاپرواہ ہوتا جا رہا ہے۔ اُسے چاہیے کہ جوتے صاف کر کے گھر نہ اپس لوٹ پڑے۔ اب اور انتظار بے کار تھا۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ جوتے صاف کر لے کی کوئی ضرورت نہیں۔ گھر پر دسوں ہانجی ماہی گیر اُس کے جوتے صاف کرنے کے لئے ترستے رہتے تھے۔ واقعی جوتے صاف کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ لوٹتے وقت پھر کچھڑ میں ٹھکر جائیں گے۔ پھولی آئی نہیں اب تک کہیں پھولی اُسے بھی کسی پرانے جوتے کی طرح نہ بھلا بیٹھی ہو۔

اُس نے سرائی کے گاؤں کی طرف دیکھا۔ اُس کے ہتھ پھر پھڑپھڑانے لگے۔ پھولی کیفیت کی سندھیروں پر تلاخچیں بھرتی آ رہی تھی۔ پھولی کی تیزی دیکھ کر وہ حیران سا ہو گیا بھلا پھولا جیسے چھتی لہر اُس کے قابو میں کیونکر

آگئی۔ کیسے اُس کے بڑھے بدن کا گرویدہ ہوئی۔ کینڈیوں کے پاس بال
سفید ہو چکے تھے۔ جوانی اور بڑھاپے کا میل کبھی ٹکڑا ہوا۔ شاید سنگھارے
کے کچھ دالوں کے لئے یا شاید کچھ روپیہ کی چمک سے۔۔۔ پھولی
اور اُس کی قیمت۔۔۔۔۔ یا بڑھا چلا اور اُس کی قیمت۔۔۔۔۔ اُس نے
اپنی سوتھ کو لگام دی۔ پھولی آ رہی تھی۔ یہی کافی تھا۔ اُس کے
اشاروں پر پھولی کا ناچنا بہت تھا۔ جی چاہا۔ دوڑ کے جائے اور
پھولی کو گمرو میں اٹھا لائے۔۔۔۔۔ اب رُکنا نہ جاتا تھا۔

پھولی پاس پہنچ گئی۔ ہانپتے ہانپتے وہ بے حال ہو گئی تھی۔ چہرہ
لال سرخ ہو گیا تھا۔ بال کی لٹیں ماسے پر آ رہی تھیں۔ اور سینے کا زیر
بم قیامت خیز تھا۔ عبدالسلام پر سکتہ طاری ہو گیا۔ فرط جذبات
سے اُس کے ہاتھ پیرسٹن ہو گئے۔ منہ کھولے وہ بیوقوف کی طرح سُن
کے اس پشیمور کو دیکھتا رہا۔

پھولی بہانے بنا کر یہاں پہنچ پائی تھی۔ رحمان نے آنکھ میں
باغ کیا لگایا تھا جیسے بڑھیا کی دیران زندگی کو باغ بنایا تھا۔
بڑھیا بیٹی کو موقع بے موقع بھیجتی۔ کبھی ملائی کرنے کو کہتی۔ اور کبھی
گوڑائی کرنے پر مجبور کرتی۔ آج بڑھیا مرتج جمع کرنے کی فکر میں تھی
بڑھیا کا اصرار اتنا زیادہ تھا کہ وہ رُک جاتی ہے آج وہ عبدالسلام
سے بے بغیر نہ رہ سکتی تھی۔ کہیں عبدالسلام انتہا سے اُکتا کر
واپس نہ جائے اس لئے پیٹ میں درد کے باوجود وہ دوڑ لگانے
پر مجبور ہو گئی۔ اور پیٹ میں جیسے کوئی اُودھم مچا رہا
تھا۔

میں تو ڈر گئی تھی کہ تم سے ملاقات نہ ہو سکے گی۔ مرچیں اکٹھا کرتی تھی۔ بڑے بہانے بنا کر آئی ہوں۔۔۔۔۔ تم کو زیادہ انتظار۔۔۔۔۔ پھولی ٹوک گئی۔ عبدالسلام اُسے ایک ٹک گھوڑے جا رہا تھا۔ عبدالسلام کے دیکھنے کا انداز اتنا تیز تھا کہ وہ سکوڑ سی گئی۔

کیا بات ہے۔۔۔۔۔ اُس نے شرما کر پوچھا۔ عبدالسلام سے کوئی جواب نہ پا کر اُس نے پھر عبدالسلام کو جانچا۔ عبدالسلام کی آنکھیں دُور جذبات سے پھٹنے کو آئی تھیں۔ منہ کھٹکے کا انداز۔ نتھنوں کی پھڑپھڑاہٹ اور گھوڑی پھیلتی آنکھیں۔۔۔۔۔ جیسے وہ اُسے کہا ہی جائے گا۔ شاید اُسے آج کچھ ہو گیا تھا۔ یا شاید عبدالسلام کو روز ہی کچھ ہو جاتا تھا۔ اور وہ خود اندر جذبات میں بہہ کر کچھ نہ کی بچھ پاتی تھی۔ پھر آج خود جذبات سے عادی اُسے عبدالسلام اپنے اصلی رنگ میں نظر آیا۔ عبدالسلام کے آنکھوں میں گھناؤنی بھٹک ننگی ناتج رہی تھی۔ اور وہ مکروہ سا لگ رہا تھا۔ اُسے اپنے آپ سے نفرت سی ہو گئی۔ یقین نہ آ رہا تھا کہ وہ سامنے کھڑے شخص سے پیار کرتی ہے۔ اُس کی ہر حرکت پر اپنے آپ کو گم کرنے کے لئے تیار رہتی ہے۔ اُس کی ہر جنبش، ہر خواہش میں مقید ہے۔ جی تو چاہا چیکے سے واپس چلی جائے۔ لیکن پیٹ میں درد کی ٹیسیں بدستور اٹھ رہی تھیں۔ اُس سے دُور نہ لگانی چاہئے تھی۔ کہیں راستے میں گر جاتی تو عبدالسلام سب کچھ سمجھ جاتا۔ اور وقت سے پہلے راز افشا کرنا اُسے منظور نہ تھا۔ اُس نے

نفرت کے باوجود کہا۔

”یوں گھبر گھبر کر کے کیوں دیکھ رہے ہو جی“

”پھولی کے لہجے نے عبدالسلام کو چمکا دیا۔ اُسے محسوس ہوا کہ وہ شاید بوڑھا ہوتا جا رہا ہے۔ ورنہ یوں بے قابو ہو کر پھولی کے سامنے بے جان نہ رہتا۔ بلکہ پھولی کو پاس پاتے ہی ریٹ پڑتا۔ پیار شروع کرتا۔ پیار ہی تو ایک گڑھے عورت کو قابو میں رکھنے کا۔ شاید بڑھیا نے پھولی کو ڈانٹا بھی ہے۔ پھولی کا چہرہ کچھ اوداس سا تھا۔ بڑھیا زیادتی کر رہی تھی۔ ویسے رونے سے پھولی کی آنکھیں مست کیڑوں کی طرح ابھر آئی تھیں۔“

”آؤ... آؤ... آؤ بیٹھو...“ عبدالسلام نے کہا اور چنار کی جڑ پر بیٹھ گیا۔ پھولی اُس سے ذرا دور بیٹھ گئی۔ عبدالسلام سے پھولی کا دور بیٹھنا چھپا نہ رہا۔ پھولی ناراض ہے کسی بات پر۔ پھولی کو منانا پڑے گا۔ منانے میں وقت گزرتا ہے اور اُسے دفتر پہنچ کر صاحب کے سامنے پیش ہونا تھا۔ آج اُس کی پیشی تھی۔ کیا معلوم صاحب تبدیل کر دے یا نوکری سے نکال دے۔ وہ پریشان ہو گیا۔

کیا بات ہے۔ آج تم پھر روئی ہو۔۔۔ کیوں۔ اُس کی آواز بھی پریشانی سے لبریز تھی۔

”میں روئی نہیں۔ چولہے کا دھواں آنکھوں میں گھس گیا اور آنسو نکل آئے۔ پھولی کے لہجے میں دھوپ کی کڑواہٹ تھی۔“

”تم جھوٹ بول رہی ہو۔۔۔۔۔۔“ عبدالسلام نے بے اعتباری

ظاہر کی اور ذرا نزدیک آ کے بیٹھ گیا۔

پھولی نے چاہا۔ اٹھ کے ذرا دور بیٹھ جائے۔ آج عبدالسلام کی قرب و محققانہ لگ رہا تھا۔ لیکن عورت کی مخصوص دور اندیشی نے اُس کے مشغول جذبات کو بھجا دیا۔ اُسے عبدالسلام کا رد عمل دیکھنے کا انتظار تھا۔ اپنے ہجے کو زبردستی معمول پر لانے کی کوشش کرتے ہوئے اُس نے جواب دیا۔ ”میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میں روئی نہیں۔ تمہیں وہم ہو گیا ہے۔“

پھر آج تم چپ چپ کیوں ہو۔۔۔۔۔ عبدالسلام پاس آ کر بیٹھ گیا اور اس کی پیٹھ پر ایسے ہاتھ پھیرنے لگا جیسے بدکتے ہوئے گھوڑے پر پھیرا جاتا ہے۔ جذبات کی شدت سے اُس کا سارا ہاتھ تھرتھرا رہا تھا۔ پھولی کی قربت اُسے پاگل کر دیتی تھی۔

”کچھ خاص باتیں کرنی ہیں۔۔۔ پھولی نے کہا۔ اب کے اُس کی آواز معمول پر آگئی تھی گو عبدالسلام کا لمس بڑ کر یہ لگ رہا تھا۔

”ہلو۔۔۔۔۔ جلدی ہلو۔۔۔۔۔ ہلو نا۔۔۔۔۔ عبدالسلام کی آواز شدت جذبات سے لڑکھڑانے لگی۔ اور لڑکھڑاتے ہوئے اُس نے پھولی کو اپنی طرف کھینچا۔

جب کبھی عبدالسلام کا منہ پھولی کو اپنی گردن کی طرف آتا محسوس ہوتا تو گرم گرم سانس کے بھیسکے گردن پر کیڑوں کی طرح رنگتے محسوس ہوتے۔ اور عجیب سی جھڑجھڑی کا احساس پیدا کرتے تھے۔ جھڑجھڑی میں عجیب سی لذت محسوس ہوتی اور وہ بے قابو ہو جایا کرتی تھی۔ بے قابو ہو کر وہ منہ پھیر کر عبدالسلام کی طرف جھک جایا کرتی تھی سارا ماحول

رینگتا محسوس ہوتا... پھیلتا محسوس ہوتا۔ اور اس کا سارا وجود
پھیلتے پھیلتے لذت کی میٹھی کڑوی لہروں پر ڈوبنے لگتا۔ ڈوبتے
ڈوبتے ڈوبنے لگتا۔ تب کہیں ماحول رینگنا بند کر دیتا تھا۔ اور گرد
کائنات کے خدوخال ٹھہر جاتے تھے۔ اور اس کے سارے وجود پر
ٹھکن اور تسکین سی مسلط ہو جاتی تھی۔ لیکن آتہ عبد السلام کا منہ
پاس آتے محسوس کر کے اسے جگر جھڑی تو آئی لیکن جگر جھڑی میں
لذت کا کوئی شائبہ نہ تھا۔ ساری لذت شاید سمیٹ کر پیٹ میں درد
بن گئی تھی۔ اور وہ عبد السلام کی طرف منہ پھیر نہ سکی۔

عبد السلام ٹرک گیا۔ اس کی ہانکی سی خواہش پھولی کے وجود میں
طلالہ پیدا کرتی تھی۔ اتنا طالہ پیدا کرتی تھی کہ کئی بار وہ خود گھبرا گیا
تھا۔ لیکن آج پھولی بالکل مردہ تھی۔ کہیں وہ واقعی بوڑھا تو نہیں
ہو رہا ہے۔ غیر ارادی طور پر اس نے اپنا ہاتھ پھولی کی پیٹھ سے
جدا کیا اور ہاتھ کی پیٹھ پر جھریاں تلاش کرنے لگا۔ پھولی کو موقع
مل گیا وہ کیسک کر ذرا الگ بیٹھ کر پھولی۔ "تم نے کہا تھا۔ مجھ سے
شادی کرو گے..."

ہاں... ہاں... عبد السلام کے دل سے جیسے بڑا بھاری
بوجھ سرک گیا۔ تو یہی غم پھولی کو کھائے جا رہا ہے۔ بدھو کہیں کا۔ ذرا
سی بے اعتنائی پر گھبرا نے لگا۔ ہاتھ پر تو پھر یوں کا نام و نشان نہیں
اتنے مضبوط تھے کہ بوجھ کو بھی توڑ مروڑ دیں۔ "میں نے شادی کا
اقرار کیا ہے۔"

عبد السلام نے کہنے کو تو کہہ دیا لیکن اس کا ذہن پھولی کے

پر نشان بالوں میں ڈھکی چھپی گوری گردی سے پھسل کر پھولی کے پھرن
میں گھس جانا چاہتا تھا۔

”چار پچھینے پھرنے کو آئے۔ اب اور کتنی دیر انتظار کرنا ہو گا“
پھولی نے اچی دلالت میں واضح کیا۔ لیکن عبدالسلام کا آوارہ ذہن
پھولی کے پریشانیوں میں بدستور الجھا رہا۔ ”پھولی مجھ پر بھروسہ رکھو“
عبدالسلام کے ہاتھ بے قابو پھرتے جا رہے تھے۔

”بھروسہ تو ہے۔ تبھی تو پوچھ رہی ہوں۔“ پھولی نے تکرار جارا
رکھی اور عبدالسلام کا ذہن کچھ کچھ سنبھل گیا۔ پھولی آج واقعی بدلی
بدلی سی تھی۔

”نہیں کچھ اور بات ہے۔ ذرہ تم یوں کرید کرید کر نہ پوچھتے، عبدالسلام
نے بے زاری ظاہر کی۔

”نہیں کوئی بات نہیں۔۔۔ لیکن تم طلاق تو دو بیوی کو۔ اب
انتظار نہیں سہا جاتا۔“ پھولی گھوم پھر کر پھر اُسی نکتے پر آ گئی۔ آج
وہ کسی طور فیصلہ کرنا چاہتی تھی۔

”تم جھوٹ کہہ رہی ہو۔ آج سیدھے منہ بات نہیں کرتی ہو۔
ضرور کوئی اور وجہ ہے۔“ بات کی ہیرا پھیری نے عبدالسلام کو بدکا
دیا۔

”کہہ تو دیا کوئی بات نہیں۔ تم بات کو ناحق الجھاتے ہو۔“ پھولی
کو بھی غصہ آ گیا۔ گھر پر ماں کی ڈانٹ سنو اور گھر سے باہر عبدالسلام
کی۔ وہ بھلا کتنا بدواشت کرتی رہے گی۔ جیسے وہ انسان نہ تھی۔ مٹی
کا ڈھیلہ تھی کہ جس نے چاہا ٹھوکر لگا دی۔ لیکن ڈھیلے غصے میں

حسین پرتا جا رہا تھا۔

وہیں کہہ دوں۔۔۔۔ میں کہہ دوں! عبدالسلام سے رہا نہ گیا۔ ٹھٹھے
میں پھولی حسین لگتی پھر تو اُس کی ملا سے۔ اگر پھولی اُس پر وار کرنے
سے نہیں چڑکتی تو وہ بھی چڑیاں پہنے نہیں بیٹھا تھا۔ اُس نے بھی
وار کیا۔

تم کسی اور کے ساتھ رنگ رلیاں مناتی ہو۔ اسی لئے آج
مجھ سے فیصلہ کرنا چاہتی ہو۔ آواز میں اتنا تیز طنز تھا جیسے پھولی
کے وجود کے پر نیچے اڑانا چاہتا ہے۔

پھولی کو یکایک محسوس ہوا کہ اُس کے پیٹ میں درد کی بڑی تیز
ٹیس ابھری۔ شاید پیٹ سکڑنے سے یا شاید عبدالسلام کی باتوں سے۔
باہن نہ تھیں۔ نشتر تھے۔ فیصلہ کرنے کی مہلت نہ تھی۔ درد کی شدت
چہرے پر ابھر آئی۔ اور عبدالسلام کو پھولی کے چہرے نے یقین دلایا
کہ وار ٹھیک نشانے پر بیٹھا۔ پھولی ضرور کسی اور کے ساتھ رنگ رلیاں
مناتی ہے۔ اُس نے اپنے شک کو الفاظ کے جامے میں ڈھال
لیا۔

رحمان بے تو گلا گھونٹ دوں اُس کا۔ میں نے اُسے کھلایا
پلایا۔۔۔۔ اپنے ساتھ رکھا۔ ہزار طرح سے مدد کی اُس کی؟

نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ تم غلط سمجھ۔۔۔ غلط سمجھ۔۔۔
پھولی کے منہ نے بمشکل عبدالسلام کے منہ کو بھر کے لئے روک لیا۔
نہیلنے کا وقت تو ہے۔

تم سمجھتی ہو۔ میں ناراض ہو کر تمہیں چھوڑ دوں گا۔ اس لئے
 چٹکارا حاصل کرنا چاہتی ہو تو سن لو میرا فیصلہ۔ تم اگر ایڑیاں
 رگڑ رگڑ کر مر بھی جاؤ تو میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔ ایک سوکھی
 بڈی کی طرح چچوڑتا رہوں گا چاہے میرے جیڑے کیوں نہ
 نہ مٹی ہوں۔ سمجھی..... تم مجھ سے چٹکارا حاصل نہ کر سکو گی۔
 عبدالسلام یاگل ہو رہا تھا اُس نے پھولی کو کندھوں سے
 پکڑ کر بُری طرح سے جھنجھوڑ دیا۔ پھولی کی چیخ نکل گئی۔

تم کتنے ہو..... کتیا کے بچے ہو۔۔۔ تم حرامی..... تم... تم...
 پھولی کے منہ سے گالیوں کی بوچھاڑ شروع ہوئی۔ غصے کے مارے
 اس کے منہ سے جھاگ نکلنے لگا۔ دونوں ہاتھ عبدالسلام کے
 چہرے کی طرف بڑھے جیسے عبدالسلام کو نوچنا چاہتی ہو۔ توڑنا
 چاہتی ہو۔ مسلنا چاہتی ہو۔ نفرت کی بیفار نے اُس کے چہرے کو
 ہینٹا بنا دیا۔ عبدالسلام ڈر کے مارے پیچھے ہٹ گیا۔ پھولی
 عورت نہیں تھی کوئی ڈائن تھی وہ تو شکر تھا اللہ کا کہ خود ہی
 بے دم ہو کر گر گئی۔ ورنہ نہ معلوم کیا ہوتا۔ شاید اس پر تھپٹ
 پڑتی۔ یا شاید چیخ چیخ کر سارے گاؤں کو اکٹھا کر دیتی۔ ان
 مال زادیوں کا کوئی بھروسہ نہیں۔ اُسے محسوس ہوا کہ
 کھلیان میں اُس کا اور کتنا خطرے سے خالی نہیں۔ کسی بھی
 وقت گاؤں کی نگاہیں اُن کو ٹیڈل سکتی ہیں۔ اُس نے جوتے
 ہاتھ میں اٹھائے۔ جوتے کیچڑ میں لٹھڑنے سے کوئی فائدہ نہ
 تھا اور جوتوں کے بغیر وہ جلدی سے اس کھلیان سے دور پہنچ

سکتا ہے۔ اُس نے آخری دفعہ پھولی کی اور دیکھا جو جڑ سے نیچے زمین پر مری پڑی تھی۔

عبدالسلام کا دل نہ چاہتا تھا کہ پھولی کو چھوڑ دے۔ پھولی سے قطع تعلق کرے۔ سونہ داری کی ویران زندگی میں پہا ایک دل بہلاوے کی چیز تو بیشر ہوئی تھی۔ جس کے سہارے دن بیت رہے تھے۔ لیکن وہ یہ بھی نہ چاہتا تھا کہ پھولی اُس کے جنگل سے نکل کر کسی اور کے ہاتھ چڑھ جائے۔ پھولی بھی ایک ایسی اسامی تھی جیسی دوسری اسامیاں۔ اور اپنی اسامیوں کو کسی حالت میں بھی دوسروں کے ساتھ مل بانٹنے کا قائل نہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ پھولی اُس کے بغیر ایک دن بھی نہیں رہ سکتی ہے۔ سنگھاڑے اکٹھے نہ کر سکے گی تو کھائے گی کیا۔ اس سال تو زمین والوں کے پاس فصل نہیں۔ بے زمین تو بے موت مارے جائیں گے۔ نہیں... بلکہ ڈوب جائیں گے۔ بارہر دیکھو پانی کے تالاب ابھر رہے تھے۔ پانی اس زمین کو چھوڑ کر جانے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ واقعی عجیب زمین تھی یہاں کی۔ آدمی کی جڑ کھوکھلی کر دیتی ہے۔ خود اُس کی جڑ کھوکھلی ہو گئی ہے۔ صاحب ناراض ہے۔ پندرہ برس کی نوکری ڈانوا ڈول ہے بتاؤ کہ کرے تو غنیمت ہے۔ اُسے یاد آیا کہ صاحب نے اُسے دس بجے دفتر بلایا ہے۔ اُس نے دیر کرنی مناسب نہ سمجھی اور گاؤں کی طرف بڑھنے لگا۔

دفعۃً پھولی چلائی۔ بھاگ کہاں رہے ہو۔ ٹھہرو۔ پھولی کی پیچ میں اتنی تیز گونج... گھر اُس کے قدم رُک گئے پھولی

یوں چنچی رہی تو گاؤں پہنچنا محال ہے۔ شاید ایسے ہی موقعوں پر
 کسی کی جان لینے کا خیال ذہن میں آ بھرنے لگتا ہے۔ وہ ٹھٹھک گیا۔
 "گاؤں والوں کو پتہ چلے گا تو تمہاری بوٹی بوٹی اڑا دیں گے۔"
 پھولی بڑی خوش ہوئی۔ اس کا سربہ ناکام نہ رہا تھا گاؤں والوں
 کا نام سن کر عبدالسلام کے چہرے پر وحشت کی پرچھائیاں چھائی
 لگیں اور اس کے قدم واپس لڑکھڑانے لگے۔
 "کیا کہہ گی گاؤں والوں سے... عبدالسلام کسی دزدے
 کی طرح قدم تول تول کے اٹھا رہا تھا۔

"کہہ دوں گی... کہہ دوں گی۔ پتھوں کا زبان لٹکھڑانے لگی۔ شرم
 کے مارے اس کا چہرہ لال سرخ ہو گیا۔

"ہاں ہاں۔ بھلا میں بھی سنوں کیا کہہ دوں گی گاؤں والوں
 سے۔ عبدالسلام کے اعضا غیر ارادی طور پر تن سے گئے۔ وہ
 شاید باز تھا اور سامنے زمین پر ڈھری پڑی پھولی تنفیسی چڑیا
 لگ رہی تھی۔ جس کو باز کی قیز آنکھوں نے مسرور کر رکھا تھا صرف
 جھپٹ پڑنے کی دیر تھی۔

پھولی عبدالسلام کے سپاٹ لہجے سے چڑسی لگتی۔ بھلا شرم و
 حیا کب تک ساتھ دے گی۔ شرم تو اسی دن مٹی میں مل گئی تھی
 جس دن وہ اپنے جذبات کے ہاتھوں مجبور ہو کر دوسری دفعہ
 دُور کے کنارے گئی تھی۔ دُور کے کنارے پڑے رومال کا حشر دیکھنے
 گئی تھی۔ یا شاید اپنا حشر دیکھنے گئی تھی۔ اب شرمانے سے فائدہ!
 چپ رہی تو عبدالسلام پر قابو نہ کر سکے گی۔

”کہہ دوں گی“

عبدالسلام کا بدن تن گیا۔

”کہدوں گی کہ تمہارا....“

عبدالسلام کی نگاہوں نے فاصلہ جات لیا۔

”کہہ دوں گی تمہارا بچہ میرے پیٹ میں ہے۔“

عبدالسلام کا توازن بگڑ گیا بدن غرقہ کا پنہ لگا سارے بدن

سے پینے کے آن گنت سوتے پھوٹنے لگے۔

”جھوٹ..... جھوٹ..... اس کا منہ بے اختیار ہو گیا

پھولی جھوٹ کہہ رہی ہوگی۔ جھوٹ کہہ رہی ہوگی۔ مال زادی...“

حرام زادی... کاش اُس کے ہاتھوں میں سکت پیدا ہو۔ کاش اُس

کی ٹانگوں میں طاقت آجائے... کاش وہ آگے بڑھ کر پھولی

کا منہ دبا سکے... کاش...“

”یقین نہیں آتا ہے تو ٹیوٹل کے دیکھ لو۔“ پھولی نے اُسے بول کھلا

دیا۔ اُس کا سارا وجود ٹیوٹل سا گیا۔ کہاں سیٹی سیٹائی۔ شرابی سی چڑیا

جو اس کے ہاتھوں میں جڑ جڑ کر ٹوٹ جھایا کرتی تھی اور اب یہ سامنے

بیٹھی ناگن..... زیریلی زیریلی سی..... پھنکاریں مارتی ہوئی ناگن۔

وہ لاکھ انکار کرنے کہ یہ بچہ اُس کا نہیں۔ لیکن ایک عورت کے

سامنے اُس کے انکار کی کوئی وقعت نہیں۔

کھلیان کے بچوں بیچ بظاہر وہ... تو لے باز کی طرح کھڑا

تھا اور پھولی ننھی ننھی چڑیا کی طرح اُس کے پاؤں کے پاس دھری

پڑی تھی۔ لیکن اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ دراصل پھولی باز کی طرح

کھڑی ہے اور وہ خود بے بس چڑیا کی طرح پھولی کے سامنے رحم کا طلبگار ہے۔ جال کس گیا تھا۔ ہاتھ پیر مارے تو شاید اور اُلجھ جائے۔ اُسے احتیاط سے قدم بڑھانا چاہیے۔ اُس نے پینٹر ابدل دیا۔

”تو یہ بات ہے جس کی وجہ سے تم اکھڑی اکھڑی باتیں کر رہی تھی۔ وہ دوزخ میں بیٹھ گیا۔ میں بڑا بے وقوف ہوں جب تمہیں رُلا دیا۔“

”میں یقین کرنا چاہتی تھی کہ تم شادی کرنے پر تیار ہو کر نہیں پھولی نے بمشکل جواب دیا۔ کاش اس کتے کے ساتھ اُس کے تعلقات نہ ہوتے۔ ابھی دستکار رہا تھا اور اب محبت جتا رہا ہے۔“
”میں تیار ہوں۔ تمہارے بغیر میرا جی نہیں لگتا پھولی۔“ عبد السلام نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا اور پھولی کسمسا کر رہ گئی۔ چرب زبانی کی بھی حد ہو جاتی ہے۔

پھولی کے چہرے پر ابھی آنسو کے قطرے بھرے ہوئے تھے۔ پتوں سے چمن چمن کر آتی ہوئی سوزن کی کڑیوں میں قطرے مٹیوں کی طرح چک اٹھے۔ عبد السلام کے جذبات دھنکے گئے۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کے آنسو پونچھنے چاہئے۔ پھولی نے اُسے روکا۔ ”تم جھوٹ کہہ رہے ہو۔۔۔۔۔“

”نہیں سچ۔۔۔۔۔ تمہاری قسم“ عبد السلام نے کہا لیکن وہ سوتھ رہا تھا۔ دفتر کا بڑا صاحب ناراض تھا۔ تبادلہ تو ضرور کرے گا۔ پھر پھولی اُس کی گرد بھی نہیں پا سکتی۔ بہت تار ہے۔ کچھ دن پھولی کو تو کوئی

راہ نکل ہی آئے گی! اب تو ناراض نہیں؟ عبدالسلام نے ہاتھ بڑھانا شروع کیا

”نہیں نہیں۔۔۔ پھولی نے رکھائی سے کہا۔ کیا فائدہ ناراض رہنے سے شادی کے بعد دن اسی شخص کے ساتھ گزارنے تھے۔ لیکن پھولی نے اس کے ہاتھ کو روکا۔ طبیعت خراب تھی۔ دل بھی افسردہ تھا سارے جذبات مر سے گئے تھے“ دیر ہو رہی ہے۔ اب میں چلوں۔۔۔“ تو تم اب بھی مجھ سے ناراض ہو۔۔۔“ عبدالسلام نے مصنوعی غصے کا اظہار کیا۔

”نہیں نہیں۔۔۔ پھولی نے ہتھیل چھوڑ دیے۔ کہیں اس کی سر دھری محسوس کر کے عبدالسلام پھر نہ بدھک جائے۔ چیخ چلا کے تو مشکل سے بھرنے پر مجبور کیا تھا اب کے چھوڑ جائے تو وہ گائوں والوں سے بھی فریاد نہیں کر سکتی۔ نہ ہی کسی اور سے کہہ سکتی ہے۔ رکھائی دکھانے سے سارا کیا دھرا اچھیٹ ہونے کا خطرہ تھا اور پھولی نے سوچا۔۔۔ مرد بڑے کینے ہوئے ہیں۔ عورت کا جان پرین آئے۔ ان کو اپنے مطلب سے کام ہے۔ ایک تو جمہوری کا نا جائز فائدہ اٹھاتے ہیں اور اوپر سے دھونس جاتے ہیں۔۔۔ اُف۔۔۔ عورت ہو نا بہت مشکل ہے۔۔۔ بہت مشکل۔۔۔“

رحمان اندھا دھند پھاوڑا چلا رہا تھا۔ مٹی بارشوں نے نرم کی تھی
 اس لئے آسانی سے کٹ رہی تھی۔ لیکن پھاوڑے سے چھٹ جاتی۔ پھاوڑا
 بھاری ہو جاتا اور وہ کام رنک کر پھاوڑے کو کوستانہ پھاوڑے کو
 کوسے کوسے ساری دنیا کو کوسے لگتا۔ پھاوڑے کو جھاڑنا اور جھاڑ کر
 اپنے گھٹنے کے ساتھ کھڑا کرتا۔ تاکہ پھاوڑا زمین پر نہ گر جائے اور
 جمع کر نہ اٹھانا پڑے۔ جبکہ اُس کے بس کی بات نہ تھی۔ مگر اگر کر
 دوسری ہو گئی تھی۔ بدن کا زانو یہ ذرا اور تیکھا ہو جائے تو سنبھلنا
 مشکل تھا۔

صبح سے وہ گھاتار پھاوڑا چلاتا آیا تھا۔ اور مزدور حیران
 تھے کہ یہ شہر کا آدمی جو اس کام سے بالکل مانوس نہ تھا اور نہ ہی
 کبھی اس کام کو اُن کی رفتار کے برابر کر سکا تھا۔ آج دم لیے پھونکے
 کسی دیو کی طرح کر رہا ہے۔ مٹی کے ٹیلے میں رحمان نے صبح سے مٹی کھود
 کھود کر ایک لمبی سڑنگ سی بنائی تھی۔ سڑنگ کے گلبے میں اُس کی تنگی
 گوری پیٹھ بجلی کی طرح چمک چمک جاتی۔ پیچ والے مزدور ٹوکریاں بھرنے

پاتے تھے کہ نئے سرے سے کھدی مٹی کا ڈھیر اُن کے سامنے آگرتا اور
 ٹوکری والے مزدور مٹی سے بھری پٹری یا ٹوکریاں تعمیر کرتے ہوئے بند
 پر مشکل ہی سے ڈال آتے تھے کہ اور ٹوکریاں بھری مٹی رکھی ہوئی
 تھیں۔ بیچ والے مزدور اور ٹوکریاں اٹھانے والے مزدور کھتے تھے۔ پر
 رحمان اکیلا اُن کے لئے لگاتار کام صہیر کر رہا تھا۔ مزدوروں نے چاہا کہ
 رحمان کو ٹوک دیں۔ اُن کی تو جان سپہ بن آئی تھی۔ بارہ بندہ
 آنے دن کی مزدوری کی خاطر وہ اپنی جان نہ دینا چاہتے تھے لیکن
 رستریوں اور اور سروں کی موجودگی میں وہ رحمان کو ڈانٹ نہ
 سکے رستری اور ادھر میر حتیٰ کہ ٹھیکہ دار بھی مزدوروں کے بیچ کبھی کی
 طرح بعضنا رہا تھا۔ بڑا انجینیر بھی اپنے ماتحتوں سمیت دو چار چکر
 لگا چکا تھا اور ہدایت کر گیا تھا کہ کام ٹھیک سے ہو۔ باہر سے کچھ ماہر
 کام کا جائزہ لینے کے لئے آ رہے تھے اُن کے استقبال کے لئے رنگین
 ڈلیہ بڑھیاں بنائی گئی تھیں۔ بچوں کے ہار تیار رکھے گئے تھے۔ میز
 کرسیاں لگائی گئی تھیں۔ دفتر کے بڑوں میں چینی کے پیالے۔ ریکاسیاں
 اور نہ معلوم کیا الہ بلا لاکھ رکھ دیا تھا۔ کچھ مزدور اس سامان کو بڑوں
 میں سے نکالنے پر مامور تھے۔ بہت خوش قسمت تھے یہ کچھ مزدور۔۔۔
 نہ کچھ کام۔۔۔ نہ کوئی کاج۔۔۔ نہ شام کو کام کی زیادتی کی بعد
 کمر میں درد ہو اور نہ رات کو بازوؤں میں کیک ہوتی رہے بس
 اپنی ہاتھ چلاتے جاؤ اور دن کی مزدوری کھری کر لو۔۔۔ سالے
 لانگری۔۔۔ بھانڈے مانجے والے۔۔۔

جلن کے مارے گالیاں دینے کے باوجود ہر ایک مزدور کا ذیل

چاہتا تھا کہ جا کر ان ملازم چکدہ اور برف جیسے اعلیٰ اعلیٰ پیالیوں
اور رکابوں کو چھو لے۔ جن پر ہیل بوٹوں کی بہار سی کھل اٹھی تھی
میز پر شیشے کا عجیب و غریب کپڑا بچھایا گیا تھا۔ مروڑ و تپ بھی
نہ بوٹے۔ کئی مزدور بہانے بنا بنا کر اس کپڑے کو چھو آئے تھے۔ نگاہیں
اس کپڑے کے آ رہی تھیں۔ لیکن چینی کے برتنوں کو چھونے کی کسی
نے ہمت نہ کی۔ کہیں کوئی برتن ٹوٹ گیا تو مہینہ بھر کی پکار چلی جائے
یہ سارا سامان شاید ٹھیکہ دار اپنی نئی موٹر میں شہر سے لایا تھا۔ نئی
رنگ برنگی موٹر۔۔۔۔۔ دور سے تو نئی نوپلی دھن کی طرح لگتی تھی
موٹر کے چاروں طرف لگے شیشوں میں صورت صاف نظر آتی تھی
بیٹھنے کی جگہ ذرا دباؤ تو دیتی ہی جائے۔ لیکن نہ معلوم رحمان کسی
مٹی کا بنا تھا۔ اتنی گھٹیا گھٹی کا کوئی اثر نہ ہو پایا۔ ایسے کام میں جتنا ہوا
جیسے عمر بھر کام میں جتا رہا ہے۔ پسینے سے شرابور بدن پر اتنی مٹی
جھم گئی تھی۔ جیسے ماں کی کونہ سے ہی مٹی میں لت پت نکل آیا
ہو۔

ماں کی کونہ سے ہی مٹی میں لت پت نکل آیا ہو یا نہ آیا ہو
رحمان کو کوئی فکر نہ تھی۔ اگر کوئی فکر تھی تو یہ کہ سترنگ بڑھتے بڑھتے
راتی لمبی ہو جائے کہ وہ اس اچھی دنیا سے بھاگ کر زمین کے اندھیرے
میں پناہ لے۔ زمین کی کونہ سے ہی سما جائے۔ صبح کے واقعات
پہچان نہ چھوڑ رہے تھے۔ جی چاہ رہا تھا۔ اپنے بدن کو گیتے گیتے
پسینہ بہا بہا کر غائب کر دے۔ ان عورتوں کا کوئی بھروسہ نہ تھا۔
چھوٹی ناراض سپردھکی دے سکتی ہے اور کچھ دیر بعد جائے پینے کے لئے

اصرار کر سکتی ہے تو وہ ایک کروٹ اور بدل کر ماں سے شکایت بھی کر سکتی ہے۔ سوچ سوچ کے اُس کا ذہن پھٹنے کو آیا۔ شاید بدن کو تکلیف دینے سے ذہنی تکلیف کچھ کم ہو۔ لیکن جتنا وہ کھودنے کھودنے سرننگ کے اندر بڑھتا جا رہا تھا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ لمحہ بھی نزدیک آتا جا رہا تھا۔ جس کی سوچ اُس کے سارے بدن میں مقرر تھی کامر جب تھی۔ وہ شام کو گھر کیونکر جاسکے گا! عبدالسلام کے پاس بھی آسرا نہ مل جائے گا۔ عبدالسلام کی وساطت سے ہی وہ بڑھیا کے گھر میں رہتا تھا اور دنیا ناتھ کے پاس رہتا اُس سے منسلک رہتا تھا۔ دنیا ناتھ کے پاس رہنے کے بجائے کھلے آسمان تلے ٹھٹھڑ ٹھٹھڑ کر مری جانے بہتر تھا۔ اب دنیا ناتھ سے اُس کا کوئی رشتہ نہ تھا۔ یہیں کام پر علیک سلیک ملے گی تو ہم گئی ورنہ دوبریوں کا رویہ ایسا تھا جیسے ایک دوسرے کے ساتھ بڑھتے نہیں۔ کھیلے کو دے نہیں دیتا۔

کوئی راستہ نہ سوچ رہا تھا اس اندھیرے میں۔ کاش اُس کے پاس کچھ روپے ہوتے تو سیدھا شہر چلا جائے کاش صرف بس کا کرایہ ملتا۔ کاش۔۔۔۔۔ وہ جھجھکا اٹھا وہ ناحق اپنے آپ کو ہلکان کر رہا ہے ذرا سی چھیڑ ہی تو کی۔ کوئی قتل تو نہیں کیا۔ بھلا کیا ضرورت تھی پھولی کو اُس کے کمرے میں آنے کا ایک جوان لڑکی کو کسی جوان شخص کے کمرے میں یوں بے دھڑک نہ گھٹس جانا چاہیے تھا۔ بڑھیا سے شکایت کرتی ہے تو کرتی پھرے۔ بڑھیا کوئی اُس کی سگی ہے جو وہ ڈر جائے گا۔ وہ کرایہ دار ہے وہاں

رہنے کے پیسے ادا کرتا ہے۔ اُس کا بستر وہاں ہے۔ سامان وہاں ہے۔ وہ جائے گا۔ ضرور جائے گا۔۔۔ بھلا کیوں نہ جائے۔۔۔!

پیسے کے قطرے اُس کی آنکھوں میں بہہ آئے اور بڑے کڑوے لگے۔ اُس نے بے خیالی میں آنکھوں کو مسل دیا۔ ہاتھوں میں لگی مٹی آنکھوں میں گھس گئی۔ آنکھوں میں شدت کا درد اُس کا دھڑکا دھڑکا ہوا ٹیڈل کمر سُرنگ سے باہر نکل آنے پر مجبور ہو گیا۔ اور تب اُس پر واضح ہو گیا کہ سُرنگ کے اندھیرے میں اُس نے جو کچھ فیصلہ کیا تھا۔ دن کے اُجالے میں اُس پر عمل کرنا دشوار ہے۔ دن کے اُجالے میں سُرنگ کے مردہ اندھیرے کے بجائے پچھوٹی کی ماں کا ہتیناک چہرہ ہو گا۔ بجلی کی طرح ترپتی آنکھیں ہوں گی۔ سانپ کی طرح لہرائی زبان ہوں گی اور نوکیلی کھردری انگلیاں ہوں گی جو اُس کو لوچنے کے لئے جھپٹ پڑیں گی۔ اُس کی آنکھیں نکالنے پر ٹل جائیں گی۔ آنکھوں میں بے انتہا درد محسوس ہوا۔ مزدور بھی کتنی کترا گئے اچھا ہوا کچھ دیر کے لئے ناکارہ ہو گیا۔ مہلت تو ملے گی۔ سانس لینے کے لئے۔ دور سے موٹر میں بھی آ رہی تھیں۔ سبوں کا اشتیاق بڑھ گیا۔ شاید ماہر کام کا جائزہ لینے کے لئے آ رہے تھے۔

موٹر میں ٹھیک سبھی سبھا کی میز کے پاس رُک گئیں۔ کچھ آدمی اُترے۔ کچھ جانے پہچانے لوگ اپنے افسر تھے اور کچھ لوگ بڑے بڑے ٹوپ پہنے انہما آدھی تھے مزدوروں کو یقین نہ آیا کہ یہ فتنے سے آدھی ہو سکے۔ سب کے سب جو راہ پڑے ڈھیلوں پر چلتے ہوئے لڑکھڑا جاتے تھے، ان مٹی کے پہاڑوں کے سامنے ہر دھڑکتے ہیں۔ ان کو دیکھ کر۔۔۔

ان کے ٹوپ دیکھ کر خواہ مخواہ ہنسی آ جاتی تھی۔ لیکن زیادہ ہنسی تو افسروں اور اود رہبروں کو دیکھ کر آ جاتی تھی جو ڈر کے مارے تھر تھراتے پھر رہے تھے اور گھبراہٹ ہوئی مرغیوں کی طرح لگتے تھے ٹھیکہ دار کی بڑی بڑی حالت تھی۔ کبھی وہ مہانوں کے پیچھے پھدکتا پھرتا اور کبھی چائے بنانے والوں کی جلدی سے چائے بنانے کے لئے ڈانٹتا۔ کبھی مسز یوں میٹھوں پہ بدشتا اور کبھی مزدوروں کو لکارتا۔ باولابو گیا تھا شاید اور مزدور خوش ہو رہے تھے۔ آج گنجے سارے کو پتہ چل رہا ہو گا کہ ٹھیکہ دار بننا آسان نہیں۔ سب لوگ سانس رو کے منتظر تھے کہ کس وقت ماہر بندھ کو جانچ لیں گے۔ پرکھ لیں گے۔ بندھ ٹھیک طریقے سے نہیں بن رہا تھا نہ مٹی ٹھیک سے بھائی جاتی تھی اور نہ دبائی جاتی تھی۔ مزدور گو اس کام کے ماہر نہ تھے پھر بھی وہ بچپن سے لے کر اب تک اس مٹی سے کھیلتے آئے تھے وہ اتنا تو جانتے تھے کہ سیلاب کا معیاری سار پلا اس بندھ کی کمزوری مٹی کو چشم ندون میں بہا لے جائے گا اس لئے مزدور ٹھیکہ دار کی پھٹکار سے بے نیاز اس گھردی کا انتظام کر رہے تھے جب ماہر سارے کام کو روک دیں گے۔

فوٹو گرافر تصویریں لے رہا تھا۔ بجلی کا کوئندہ لپکتا اور آنکھیں خیرہ ہو جاتیں۔ سُرنگ کے اندر رحمان کے ارد گرد آگ سیا لگ جاتی اور رحمان کچھ دیر اپنا ڈر بھول کر ان لئے لوگوں کی حرکات سکنت میں شہک ہو جاتا۔ دینا نا تھنے آج نیا سوٹ پہن لیا تھا۔ ٹھیکہ دار کی کلاہ میں کلاؤت چم چم چک رہا تھا۔ میز پر رنگ برنگی

میٹھا یوں کے ڈھیر لگے تھے اور ساری فضا تلے گوشت کے کبابوں کی مہک سے بوجھل سی محسوس ہوتی تھی۔ رحمان کو یہ خوشبو اچھی نہ لگی اس خوشبو نے اس کے پیٹ میں کھلبلی سی چاڑھی اور ذہن میں بھی کھلبلی مچنے لگی۔ صبح پھوٹی کے اصرار کے باوجود وہ کچھ نہ کھا سکا تھا۔ بے وقوف کہیں کا۔۔۔۔۔ کچھ کھا لیا ہوتا تو اس وقت آنتوں کا بُرا حال نہ ہوتا۔ کبابوں کا ہک نے مہنہ میں لعاب کے ان گنت سوڑوں کو جنم دیا۔ جی کرتا تھا کہ دوڑ کر جائے اور میز پر رکھی چیزوں کو کھا جائے۔ نہ کھا سکے تو کم از کم ان مٹی کے ڈھیلیوں کو ہی کھا جائے جو پیروں کے آس پاس بکھرے پڑے تھے پیٹ میں بھوک کیا مچل رہی تھی جیسے اس کی ساری زندگانی مچل رہی تھی۔ مجھ جھلا کر اس نے پھاوڑا لنبھالا اور اپنی جلن مٹی پر صرف کرنے لگا۔

ماسر چلے گئے۔ میز بٹالی گئی۔ استقبالیہ ڈپڑھیوں کو توڑ دیا گیا اور فضا میں بسی مہک بھر سے مزدوروں کے پسینے کی توبہ میں ڈوب گئی۔ سائے بڑھتے گئے۔۔۔۔۔ بڑھتے گئے تھی کہ ایک مخصوص نشان تک پہنچ گئے۔ بھکی سی سرگوشی فضا میں سرسرائی۔ اور مزدوروں نے ہتھیار رکھنے شروع کئے۔ چھٹی کا وقت ہو گیا تھا۔ لیکن رحمان بدلتے ماحول سے بے نیاز سرنگ کھو دتا رہا۔ کئی مزدوروں سے رہا نہ گیا۔ ایک نے ہتھیار کیا۔

ہم جانتے ہیں تم ٹھیکہ دار کے آدمی ہو۔ لیکن وہ لوگ

چلے گئے۔ اب کس کے واسطے یہ جوش و خروش۔ چھٹی ہو گئی ہے۔

رحمان چونک گیا۔ انگلیاں پھاوڑے سے ایسے جھکی ہوئی
 بھین جیسے گوند سے چپکائی گئی ہیں۔ پھاوڑا انگ ٹرنے سے
 انگلیوں میں پڑا اور دھونے لگا۔ انگلیاں سروڑتے ہوئے اُس
 نے سترنگ سے باہر نکالیں روڑا لیں۔ چھٹی کے وقت جتنا جوش
 و خروش مزدوروں میں پیدا ہوتا ہے وہ آج منقود تھا۔ سب
 مزدور بے دل ہو گئے تھے۔ کسی کو یقین نہ آ رہا تھا کہ شاید
 نے بندھ میں کوئی بھی خالی نہ پائی۔ شاید خامیاں نقصاں
 ہیں مہک تے ڈوب گئی تھیں۔ یا شاید بندھ میں کوئی خالی نہ تھی
 شاید بندھ ٹھیک ہی بن رہے تھے۔ مگر جو کچھ مزدوروں کا
 یقین ڈالنا اڑوٹ تھا۔ عمر بھر کا یقین ٹوٹ جائے تو دل ٹوٹ سا
 جاتا ہے۔ اس لئے مزدور آج خلاف معمول چپ چاپ ہتھیار والیں
 کر رہے تھے اور دُور دُور چار چار کی ٹولیاں بنا کر گھروں کی
 طرف جا رہے تھے۔ رحمان کے دل میں ایک ہلک سی اٹھی۔ سب
 مزدور گھر جائیں گے۔ مزے سے روکھی سوکھی کھائیں گے اور ٹانگیں
 پسار کر سوئیں گے۔ اور ایک وہ تھا کہ جس کا کوئی گھر نہیں۔ نہ
 زمین نہ منہ کھول کر اُسے چھپایا اور نہ ہی آسمان نے گر کر اُس
 پر پردہ تانا۔ اب کیا ہو گا۔ سترنگ میں رات بھر کا آسرا مشکل
 تھا۔ اس نے ایک لمبی سانس لی اور پھاوڑا اٹھانے کو جھجکا
 چونکیدار سامان جمع کرنے کے لئے چلا۔ یا تھا۔ یکا یک آسمان

اتنے زور سے آکر کہ سنبھل نہ پایا۔ صرپہ شدید جھٹکا محسوس ہوا اور زمین اُسے گود میں لینے کے لئے تیزی سے آگے بڑھی۔

جب اُسے بدش آتا تو سارا بدن جیسے ٹوٹ گیا تھا۔ سر میں درد پور ہا تھا اور دم گھٹا جا رہا تھا۔ کوئی اُس کے سینے پر ہاتھ نہ تھا شاید۔ سانس لینے کے لئے آہٹس نے چلنا چاہا۔ وہ کچھ حیران سا ہوا۔ حلق سے ذرا سی بھی آواز نہ نکل پارہی تھی۔ بلکہ آواز کی گونج.... اُس کا منہ چڑانے لگی۔ میں... میں

میرا سانس.... آف.... میرا....

منہ پہ کسی کا۔ محسوس ہوا۔ جیسے گھاس کے تنکے.. بکھرے بکھرے تنکے اُس کے ہونٹوں کو چھو گئے ہوں۔ یا کسی کی انگلیاں نہیں شاید....!

”بو نہ نہیں.... چپ چاپ پڑے رہو، میٹھی آواز جانی پہچانی سی لگی۔ شاید ماں کی آواز ہو۔ پرواں تو اُس کے پیدا ہوتے ہی مر گئی تھی۔ اور اُس نے ماں کی آواز کبھی نہ سنی تھی۔ پھر شاید اُس کی بیوی کی آواز ہو۔ پر نہیں.... نہیں... بیوی کی آواز بھی نہیں ہو سکتی۔ ابھی وہ دولہا بن کر کہیں نہیں گیا تھا۔ گو بوڑھے باپ نے سب تیار کر رکھی تھی۔ دُہن کے ہاتھوں کے لئے کرٹے۔ انگلیوں کے لئے انگوٹھیاں۔ گلے میں ڈالنے کے لئے مالائیں۔ پاؤں کے پازرب۔ اور... اور... افوہ نہ معلوم کیا کیا ابلا بوڑھے باپ نے جوڑ رکھی تھی۔ اُسے ہر چیز کا نام کہاں معلوم۔ وہ تو باپ سے چوری چھپ اُس نے بڑے صندوق

کا تالا کبھی کے بجائے کیل سے کھول کر سب چیزیں دیکھ لی تھیں۔ باب نے اپنی دانت میں بڑا مضبوط تالا صندوق میں لگا رکھا تھا۔ باب کو پتہ چل جائے کہ بیٹا چابی کے بغیر بڑے صندوق کا تالا کھول سکتا ہے تو مار مار کے بڑی پسلی ایک کر دے.... کہیں باب نے روز کی طرح آج بھی تو نہیں پیٹا ہے۔ انگ انگ میں درد ہو رہا تھا۔ یہ آواز باب کی آواز کی طرح کھردری نہیں... بھر بولا کون؟ اُسے چاہئے آنکھیں کھول کے دیکھے۔ بھلا آنکھیں موند کر کے دیکھ سکتا ہے۔ یہ کچھ دکھائی بھی دے۔ کہیں وہ اندھا تو نہیں۔ آخر اُسے کچھ دکھائی کیوں نہیں دیتا۔

”مجھے دکھائی نہیں دیتا۔۔۔ مجھے دکھائی نہیں دیتا۔“ وہ یہ اندھیرا.... مجھے دکھائی نہیں دیتا۔“

”نیل ختم ہو گیا ہے۔ دیا بچھا پڑا ہے۔۔۔ وہ چونک پڑا بڑھیا کی نیکی آواز نکلی۔ ضرور بھڑکی نے ماں سے شکایت کی ہو گی اور گاؤں بھر میل کر اُس کو پیٹا ہے۔ بڑھیا نہیں۔۔۔ تو اُن ہے کوئی۔ اُسے اٹھ کے بھاگ جانا چاہئے ورنہ یہ لوگ مار مار کر اُسے ادھ مٹوا کر دیں گے۔“

”بیٹا ہلو ہلو نہیں۔ آرام سے بیٹھو ورنہ تکلیف بڑھ جائے گی۔ اب کے کھردری انگلیاں شانوں میں کھبتی سی محسوس ہوئیں۔ اور درد کی تیز لہر اُس کے بدن میں رواں ہو گئی۔ شاید یہ لہر اُس کی ٹانگیں کوڑھکے ہیں۔ ہزار کوشش پر بھی مل نہ پاتی تھیں۔“

”لابیٹی... چائے کا پیالہ... چمکارنے کی آواز یا غصے کی

بچکار کوں جانے ؟ ے بیٹا۔ چائے پی ے۔ طبیعت ٹھیک ہو جائیگی۔
 چائے۔۔۔ ہاں۔۔۔ چائے چائے اُسے بہت بھوک لگی ہے۔ پیٹ
 میں چوہے روڑ رہے ہیں۔ صبح بھی اُس نے صرف ایک پیالہ چائے
 پی لی تھی۔ کیا وہ دن بھر چائے پر ہی گزار کرے گا۔ کھانا کیوں
 نہیں لادیتے یہ لوگ۔ شاید وہ بھوک سے بے حال ہو گیا ہے کہیں
 یہ لوگ اُسے بھوکوں کوں نہیں مار رہے ہیں۔ کیا بھروسہ ان کا۔
 میں چائے نہیں پیوں گا۔۔۔ مجھے کھانا دو۔۔۔ روٹی دو۔
 روٹی۔۔۔ نہیں روٹی نہیں چاہئے۔ سنگھاڑے کی روٹی نہیں
 چاہئے۔۔۔۔۔ چھوڑے نہیں چاہئے۔ پیوں۔ چاول چاہئے۔
 چاول۔۔۔ سفید سفید۔۔۔ اُجلے اُجلے۔۔۔ مرنی جیسے چاول۔۔۔
 نہیں بیٹا تم بیمار ہو۔۔۔ چائے پی لو۔۔۔ ٹھیک ہو جاؤ
 بڑھیا کی آواز تھی یا قہوے کا میٹھا سٹھی۔ بہت اچھی تھی بڑھیا
 اُسے اپنے بیٹے کی طرح پالتی تھی۔ چائے پینے کو کہہ رہی تھی۔
 زہر پینے کو بھی کہہ دے تو وہ پی جائے گا۔ شاید چائے میں
 زہر ہے۔۔۔ ضرور زہر ہوگا ورنہ بڑھیا اُسے چائے نہ پلاتی۔
 بھئی نے ضرور شکایت کی ہے۔ بھئی تو گنوارن سے گنوارن۔۔۔
 کھور۔۔۔ بے رحم۔۔۔ بغیر دودھ کے ٹھیک چائے سے بھی زیادہ
 کڑوی۔ اُسے چائے نہیں پینی چاہئے۔ چائے میں ضرور زہر ہوگا
 اس لئے اُسے چائے نہیں نہیں چاہئے۔
 میں چائے نہیں پیوں گا۔ چائے میں زہر ہے۔ تم لوگ مجھے
 زہر دے رہے ہو۔ میں چائے نہیں پیوں گا۔

"سر میں چوٹ آئی ہے۔ کہیں پاگل تو نہیں ہو اماں..."
 آواز پتلی اور سُریلی تھی۔ اتنی پتلی اور اتنی سُریلی کہ اچھے بھلے
 آدمی کو پاگل بنا دے وہ اس آواز کو سن کر سہی پاگل ہو گیا تھا۔
 کہیں وہ اُنٹھ کے کپڑے نہ بھاڑنا شروع کرے۔ سر کے بال
 نہ توتھ ڈالے۔ لڑنا نہ شروع کرے پھر تو رسیوں میں جکڑ کر پاگل
 خانے لے بنایا جائے گا۔ اور پاگل خانے میں بچے سلاخ دار کھڑکیوں
 میں سے پتھر پھینکا کریں گے اُس پر لوہے کی سلاخوں کی چار دیواری
 میں بند پاگل بھڑ بکریوں کی طرح حمیا کرتے تھے۔ ایک دوسرے
 کو کاٹ کھاتے تھے۔ پاگل خانے کے محافظ نہ تو پتھر مارنے
 والے بچوں کو منع کرتے تھے۔ نہ پاگلوں کو روک لیتے تھے
 شاید وہ بھی پاگل ہو گئے تھے۔ ورنہ پاگل خانے کی گند اور
 سڑاند میں کون زندہ رہے۔ اچھا بھلا آدمی تو مر جائے۔ وہاں
 لے گئے تو وہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کے مر جائے گا۔ کئی پاگل مر گئے۔
 وہ پاگل خانے کو اچھی طرح سے دیکھ چکا تھا۔ جب کبھی دینا
 نا تھا اور وہ سنگھاڑے کھانے اور بادام کے شگوفے دیکھنے
 ہاری پر بہت جاتے تو لوٹتے وقت ہاری پر بہت کے دامن
 میں پاگل خانہ دیکھنے ضرور جاتے تھے۔ پاگل خانے جانے سے بہتر
 ہو گا۔ زہریلی لے۔ واقعی زہریلیا بہتر ہے۔ پیٹ میں ہلکے سے
 مردہ اُنٹھیں گے۔ ہلکا سا درد ہو گا۔ ہلکے ہلکے بے سدھ ہو جائے گا۔
 یہی کچھ تو ہوتا ہو گا۔
 بیٹھے تھوڑے کے باوجود منہ کڑوا ہو گیا۔ زہریلی تو پی رہا تھا۔

جب یہ لوگ اس بات پر ہی مصر تھے تو یوں ہی سہی اب اُس کے لئے
 اس دنیا میں رہا ہی کیا تھا پھر لی ناراض تھی۔ بڑھیا ناراض تھی۔
 دنیا ناختم ناراض تھا۔ سونہ داری کے لوگ ناراض تھے حتیٰ کہ سونہ
 داری بذات خود ناراض تھی۔ نہ کہیں گھر نہ گھاٹ۔ مر بھی جائے
 تو کسی کا کیا نقصان ہو گا۔ کم از کم قہرے کا حزرہ لوٹے۔ قہرے
 کے بیٹھے گھر نہ بند بند میں رہے تھے۔ بند بند کو ڈھیلہ کر رہے
 تھے اُسے بے انتہا تنگن محسوس ہوئی۔ شاید موت بے انتہا تنگن کا
 ہر نام ہے۔

رحمان مٹی کے ڈھیر تیلے دب کیا گیا کہ بڑھیا کو محسوس ہوا
 کہ اُس کی اپنی قسمت دب گئی۔ ہر طرف سے مہیبت اُٹھی چلی آ رہی
 تھی۔ عبد السلام جھپٹ لے کر گھر چلا گیا تھا۔ افواہ تھی تبدیل کیا
 گیا ہے۔ واقعی انصاف نہ تھا اس دنیا میں۔ کسی غریب کی مدد
 کرو تو دنیا زندہ نہیں رہنے دیتی۔ شاید اُس کی اپنی منجوس پر چھائیں
 عبد السلام پر بھی چھا گئیں۔ جب سے عبد السلام تبدیل ہو کر چلا گیا
 تھا تب سے پھر ٹی سنگھاڑے اکٹھے کرنے کے لئے دُور جانے سے
 کتراتی تھی۔ ٹھیک ہے کہ عبد السلام کے جانے کے بعد کوئی راہ
 دیکھانے والا نہ تھا۔ لیکن اتنا بھی کیا کہ بالکل ہی جانا چھوڑ دے
 اور ہاتھ پیر توڑ کے بیٹھ جائے۔ عبد السلام کا سہارا عمر بھر کہاں
 رہتا۔ سہارا ملے یا نہ ملے جینے کی کوشش تو کرنی پڑتی ہے وہ خود
 بڑھاپے کے باوجود زمانے سے لڑ جھگڑ کر ایک ایک دن چھین رہی
 تھی۔ گرتے پڑتے کھانا پکاتی تھی۔ برتن مابختی تھی۔ جھاڑو دیتی تھی۔
 عبد السلام سو نہ داری نہ آتا تو کیا اُن جیسے غریب لوگ دُور جانا

چھوڑ دیتے۔ ولہ تو ان لوگوں کی زندگی تھا۔ خدا مہربان تھا تو
عبدالسلام کو ان لوگوں کی مدد کے لئے سونہ داری بھیج دیا۔ عبدالسلام
کے جانے کے بعد خدا ان کو مارا کیا تو پیٹ تو ابھی ویسے کا ویسا
موجود تھا۔ بھوک ابھی بدستور لگتی تھی۔ اور بھوک مٹانے کے لئے
ان کے ہاتھ پر بدستور صبح و سلامت تھے اُسے چاہئے کچھ لے کر
ڈھیل نہ دے۔ بلکہ مارے پیٹے لاڈ پیار سے نہیں مانتی ہے تو
ڈانٹ ڈپٹ کر ڈر جانے پر مجبور کرے۔

بڑھیا نے سوچا اور سہارا کو جانچا۔ سہارا کے کناروں پر
ابھی کچھ میں باقی تھی۔ اُس نے اور تھوڑی سی راکھ اٹھائی اور
سہارا کے کناروں کو مانجنے لگی۔ اپنے مکان کے سامنے آنگن میں بیٹھی
وہ صبح سے برتن مانجنتی آرہی تھی۔ مانجنے کا آواز۔۔۔ کھر۔۔۔ کھر
خاموش فغا کی بے فہم اُداسی کو واضح کر رہی تھی یہ بے ادور
شاید اُس کے اپنے بے چینگی ذہن کی پیداوار تھی۔ وہ نہ فغا میں اُداسی
کا کوئی عنصر موجود نہ تھا۔ مطلع صاف تھا۔ آسمان بے داغ نیلی چادر
کی طرح پھیلا ہوا تھا اور دور پہاڑوں کی چوٹیوں پر ہریالی سی اُبھر
آئی تھی۔ کچھ دیر بعد سورج نکلنے والا تھا۔ دھوپ کی چمکی گرم کرنیں
آنکھ مچولی کھینے کے لئے آجودہاں لگی۔ اُس کے ٹھٹھرتے بدن کو گدگدائیں
لگی اور تب شاید اُس کے ذہن کی میل بھی کچھ دیر کے لئے ڈھل
جائے گی۔

اُس نے سہارا رکھ دیا۔ برتن مانجنے مانجنے ہاتھوں میں درد
اُبھر آیا تھا اور سامنے ابھی کئی برتن پڑے تھے۔ وہ جھجھکا اٹھی۔ پھولی برتن

انجمنی تو اُس کے جوان ہاتھ مینٹوں میں سب برتن مانجھ کے رکھ دیے۔
 نہ معلوم کس کی نظر لگ گئی پھولی کو۔ نہ کوئی کام کرتی تھی اور نہ کسی
 کارج میں ہاتھ بٹاتی تھی کچھ کہہ لو بات کا جواب دینا بھی گوارا نہ کرتی
 تھی۔ بس لیٹ لیٹ اور نگھنے کے سوا کچھ کام نہ تھا۔ ڈانٹ ڈپٹ
 کا جواب ایک خاموشی۔۔۔ کسی دفعہ بڑھیا کو اس خاموشی سے ڈر سا
 لگا تھا۔ جیسے پھولی کی خاموشی کی تہہ میں کوئی طوفان چھپا پڑا ہے
 کریدے تو شاید طوفان پھٹ پڑے اور اُس کی سوکھی ہڈیوں میں
 اب اتنی طاقت نہ تھی کہ کسی طوفان میں ٹھہر سکیں۔ وہ سوچتے سوچتے
 ٹوک گئی۔ اُسے محسوس ہوا کہ وہ بیٹی کے ساتھ شاید زیادتی کر رہی
 ہے۔ ہو سکتا ہے کہ پھولی کی طبیعت خراب ہو اور نہ ماں کو پریشانی سے
 بچانے کے لئے ذکر نہ کر رہی ہو آخر کوئی کب تک سنگھاڑے
 اکٹھے کرنے کے لئے موقع بے موقعہ ڈر کے کناروں پر سرگرواں
 رہے۔ بے چاری پھولی۔۔۔ کبھی کبھی میں لت پت ہوتی تھی اور
 کبھی بے موقعہ بارش میں بھیگ آتی تھی۔ ضرور پھولی کی طبیعت
 خراب ہے۔ یہی وجہ ہوگی ورنہ ماں لاکھ بڑی سہی بچہ ماں کو
 سب کچھ بتانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اپنی ماں جو کٹھنری نہ معلوم
 بیماری میں لوگ کیوں بدل جاتے ہیں۔ پھولی بیمار ہے تو منہ نہ سکھڑے
 بیٹھی ہے۔ رحمان بیمار ہے تو بچے کی طرح مچلتا رہتا ہے جیسے اپنی
 سگی ماں کے سامنے مچلتا ہو۔ خدا کرے رحمان ٹھیک عبدی ہو جائے
 تو شاید زندہ رہنے کا کچھ آسرا پیدا ہو۔ سنگھاڑے ختم ہونے کو
 آئے تھے۔ ساگ سبزی اگ آئی تھی تو وہ بارش سڑا اگلا رہی تھی

واقعی جب مصیبت آتی ہے تو ایسی نہیں آتی۔ بڑھیا نے سونچ کر لمبی سانس بھری اور پیارے دھوئے لگی۔

بڑھیا ابھی سارے برتن نہ دھو پائی تھی کہ رحمان کی آواز آئی۔ لمحہ بھر کے لئے اُس کا چہرہ غصے میں ڈوب سا گیا۔ اس گھر میں جینا وہ بھرپور ہاتھ بٹا کر دیکھ رہا تھا جب دیکھ رہا تھا کہ رحمان چلاتا رہتا تھا اور وہ مجبوراً رحمان کا دل بہلا لے کے لئے حاضر ہو جاتی تھی۔ کہیں بھولی کہ جین تو نہیں رہی ہے کہ اُس کی ماں اپنی بیٹی کو بھول کر پرانے لوگوں پر بچھا کر رہی ہے۔ لیکن دوسرے لمحے ماتا کی لہر ساری اُٹھن بہا لے گئی۔ رحمان اُس کے جتنا بھی نزدیک آتا جائے گا اس گھر کا مستقبل اتنا ہی محفوظ رہتا جائے گا۔ رحمان من جائے تو بھولی کی زندگی بھی سنو رہا ہے وہ بھی خوشی کے چار دن دیکھ لے گی۔ بھولی کی خوشی کو محسوس کر کے بڑھیا خود بڑی خوش ہوئی کہ گندے پیارے ایسے ہی چھوڑ کر اُس نے ہاتھ دھو لئے۔ دروازے کے سہارے کے باوجود کھڑے ہوتے ہی اُسے ہلکا سا آگیا اور وہ گرتے گرتے پڑی۔ کسی دن ایسی گر جائے گی کہ اٹھ نہ سکے گی اس لئے جتنی جلدی ہو سکے اُس نے رحمان پر قابو پا لینا چاہئے۔

رحمان نے اُسے دیکھتے ہی ڈانٹ دیا۔ تم سنتی ہی نہیں ہو۔ آوازیں دیتے دیتے میرا گلا سٹو کھ گیا۔

تو رہی تھی.... ڈانٹ سن کر وہ بجائے غصے کے سرور ہو گئی کبھی اُس کا خاوند بھی ایسے ہی ڈانٹ دیتا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ خاوند کی پکار پر اُسے آنے میں دیر لگتی تھی کیونکہ تب وہ بوڑھی نہ تھی

”کیا کر رہی تھی اتنی دیر جو جلد ہی نہ آسکی۔ رحمان نے زبردستی بچہ بننے پر مجھے پوچھا۔ بچپن میں اُسے کبھی ایسے ٹھکنے کی ذرت نہ آئی تھی پیرا بیٹے ہی ماں مرگئی تھی اور باب کی ڈانٹ پھٹکار نے اُسے وقت سے پہلے بڑا بننے پر مجبور کیا تھا۔

”برٹن مانجھ رہی تھی۔ اس لئے آنے میں دیر ہو گئی۔ بڑھیا رحمان کے پاس بیٹھ گئی۔ ابھی کچھ اور برٹن دھونے تھے اور وہ جانتی تھی کہ ایک دفعہ بیٹھ کے وہ جلد ہی اُٹھ نہ سکے گی۔ اس لئے بیٹھنے کے بجائے رحمان کی بات کا جواب دے کر واپس لوٹ چلنا چاہئے لیکن رحمان کے پاس بیٹھ کر اُسے ایک گونہ سہارا سا ملتا تھا۔

”ارے پھر لی برٹن نہیں مانجھتی؟ عجیب لڑکی ہے پنا منہ بھی نہیں دکھاتی۔“ رحمان نے شکایت کی۔ بڑھیا کی ماتا کو محسوس کر کے رحمان اپنے آپ کو اس گھر کا ایک فرد سمجھنے لگا تھا۔

”خدا جانتا ہے اُسے کس کی نظر لگ گئی ہے نہ گھر کا کچھ کام دھندہ کرتی ہے اور نہ ہی ڈر جاتی ہے۔ بڑھیا رونے پر آئی۔

”تو کچھ گھر کا خرچ کیسے چلتا ہے۔“ رحمان نے اندازہ لگانا چاہا اُسے دو وقت قہوہ ملتا تھا۔ قہوے کے ساتھ نانوائی کی دو دو روٹیاں ملتی تھیں۔ سنگھاڑے کے آنے کی روٹی کے بجائے چاول کھانے کو ملتے تھے۔

”بیٹا اب تم سے کیا چھپانا وہ جو تم پہلے کرائے کے روپیے دیتے تھے۔ پچھلی کے جینز کے لئے بچا رکھتی تھا۔ وہی روپیے نانوائی کی کو دیئے۔ میں نے سوچا تم اچھے ہو جاؤ گے تو ڈھیروں روپیے مل

جائیں گے۔ بڑھیا کہتے کہتے شرمندہ سی ہو گئی۔

”ٹھیک کیا ماں۔ ٹھیک کیا۔ میں بھی تو تمہارا بیٹا ہوں تو فکر نہ کرو میں جلد ہی کوئی بندوبست کروں گا۔“ رحمان نے دیر لا سادیتے ہوئے کہا۔ ”وہیسیہ پھولی سے پوچھتا چھ کر لو۔ پھولی کہیں بیمار نہ ہو۔“ رحمان پھولی کے متعلق بہت کچھ کہنا سننا چاہتا تھا آج اس کی طبیعت قدرے اچھی تھی۔

”وہ کچھ بتائے بھی۔ جب کبھی پوچھتو کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے۔ جی چاہتا ہے ہڈی ہڈی توڑ دوں اس کی بڑھیا بیہوش ہو گئی پھولی کے ناز و محزونوں کا وجہ سے اس کو دن رات آشوبک بیٹھک کرنی پڑتی تھی۔“

”نہیں ماں۔۔۔ تم ذرا طریقے سے تو پوچھ لو۔ بڑی سمجھ دار لڑکی ہے۔“ رحمان واقعی پھولی کی سمجھداری کا قائل ہو گیا تھا پھولی سمجھدار نہ ہوئی تو چھیڑ چھاڑ کا ذکر ماں سے ضرور کرنی اور وہ بے موت مارا جاتا۔

”وہ بیٹیا سمجھنے کی نہیں۔ لڑکی نہیں مہیبت ہے مہیبت۔ اس سے تو اچھا تھا پیدا ہوتے ہی مر گئی ہوگی۔۔۔ میں تو۔۔۔“

رحمان نے بوڑھیا کو بات پوری کرنے کی مہلت نہ دی۔

بوڑھیا کے منہ سے پھولی کے متعلق ایسی باتیں سننی اُسے بُری لگتی تھیں۔ ذہنی طور پر وہ اتنا آگے بڑھ چکا تھا کہ پھولی بالکل اپنی لگتی تھی۔ اُس کے انگ انگ میں روح گئی تھی۔ اسی لئے وہ پھولی کے متعلق کسی سے کچھ نہ سننا چاہتا تھا چاہے وہ پھولی

کی مادہ ہی کیوں نہ ہو۔ بچھو لی جوان تھی۔ جوانی الٹ رہتی ہے
 بچل گئی ہوگی تو کیا بڑا ہوگا۔ بچل جانا تو عمر کا تقاضا تھا۔ اور بچل
 کر شرمانا.... ہائے.... ہو سکتا ہے بچھو لی اپنے رویے پر پشیمان
 ہو تبھی اُس کے سامنے نہیں آتی۔ بچھو لی کی پشیمانی اپنے تئیں بھانپ
 کر اُس کو بڑی مسرت حاصل ہوئی اور اُس نے بوڑھیا کو سمجھانا
 شروع کیا۔

”ہاں... ڈانٹ کے بغیر پوچھو تو مجھے یقین ہے بچھو لی سب کچھ
 بنا دے گی۔ بچھو مجھت چاہتا ہے۔“

رحمان کے طور اطرار نے بوڑھیا کو یقین سا دلایا کہ کہیں رشتے
 ناٹنے کی بات چل نکلی تو رحمان کے عامی بھرنے میں دیر نہیں
 لگے گی۔ اپنی دانست میں رحمان کتنا ہی بے غرض بننے کی کوشش کرے
 لیکن بچھو لی کے متعلق بات کرنے کے ڈھنگ سے بہت سارے نتیجے
 اخذ کئے جاسکتے تھے جو مرد چاہے نہ سمجھے سکے پر عورت بہت جلد
 سمجھ لیتی ہے۔ وہ خوشی کے نہیر آخر تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔
 اب کے اُس کا سر بھی نہ چکرایا۔ رحمان کے طور اطرار نے اُس کو
 بہت سہارے مہیا کئے تھے۔

”تم کہتے ہو بیٹیا تو یہ بھی کر دیکھوں گی.... ہاں یاد آیا بلایا
 کیوں تھا بیٹیا۔“

”وینا ناٹھ آ رہا ہوگا اُس کے لئے بھی چائے بنا دینا۔ یہی
 کہنے کے لئے بلایا تھا۔ رحمان نے جواب دیا۔ جب سے اُسے
 حادثہ پیش آیا تھا۔ وینا ناٹھ نے اُس کے پاس آنا جانا

شروع کیا تھا۔ سو مادی صرف ایک بار نمودند کے ہمراہ فراج پرسی
 کو آگئی تھی۔ اور سرسری طور پر کچھ لمحوں کے لئے بیٹھ گئی تھی۔ منہ
 ایسے پھلار کھا تھا جیسے دونوں دوستوں کا اکٹھا مل بیٹھنا اچھا
 نہ لگتا ہو۔ پھر سی اور بوڑھیا کو وہ بڑی طرح سے نظر انداز کر
 گئی تھی گو دونوں ماں بیٹیاں اس کے ارد گرد منڈلاتی رہیں۔
 مینا ناتھ نے بھی شاید بیوی کے طور و طریقے کو پسند نہ کیا وہ کمر
 کھینچی بیوی کو ساتھ نہ لے آیا۔ بوڑھیا کبھی بوجھ بیٹھتی تو طبیعت
 کی ناسازی کا بہانہ بنا دیا کرتا تھا۔

وینا تھنے نے ٹھیکہ دار کے نئے مکان کے نئے دہلیز پر قدم
 بڑھایا۔ مکان پر نیا پلستر کیا گیا تھا اس لئے سارے مکان سے
 مٹی گارے کی سوندھی سوندھی خوشبو آرہی تھی اور بڑا اچھی لگ
 رہی تھی۔ دہلیز کے پاس ہی برآمدے کے دائیں طرف بیٹھک کا
 کمرہ تھا۔ کمرے میں نئی طرز کی چوڑی ہوادار کھڑکیاں چنی گئی تھیں
 لیکن کھڑکیوں میں ابھی شیشے نہ جڑے گئے تھے مکان کی دوسری
 منزل ابھی تیار تھی۔ اس لئے پہلی منزل تک ہی آنا جانا تھا
 ٹھیکہ دار کچھ دنوں سے کٹر روائت پرست اور مذہبی آدمی بن گیا
 تھا۔ پیروں فقیروں کو ماننے لگا تھا۔ اس لئے جب مسجد کے امام
 نے مکان میں داخل ہونے کی ساعت مقرر کی تو ٹھیکہ دار نے
 ادھر بنے مکان میں داخل ہونے کا رسم ادا کیا۔ مسجد میں رات
 بھر چراغاں کرایا۔ نیاز نذرانے گزارے گئے اور نئے مکان کے
 باغیچے میں ایک بڑی دعوت کا اہتمام کیا گیا۔ گاہکوں کے ذی عزت
 شخص اور سونہ داری کے سب بڑے افسر مدعو تھے۔ گشتابوں

اور کباہوں کی خوشبو سے سارے گاؤں کی فضا مہک اٹھی۔ مئے
ناب پانی کی طرح بہتی رہی۔

اپنے مزدوروں اور گاؤں کے غریب غرباء کے لئے
فہوے اور باقر خانیوں کا انتظام تھا۔ بے چاروں کو کبھی کبھار
ہماری چیزیں میسر ہوتی تھیں۔ نندرا پیٹ میں بادھنمی نے جہنم لیا اور جہنم
کے نعروں کی صورت میں آشکارا ہوئی۔ ٹھیکہ دار کے نام کے
ایسے زوردار نعرے لگے کہ سارے گاؤں تھرا اٹھا۔ سونہ دار کا
لوگوں میں کچھ دنوں سے عجیب سی عادت اُبھر رہی تھی۔ معمولی سے
معمولی واقعے یا منگامے پر لیڈروں کے نام کے نعرے لگانے کی عادت
سی ہو رہی تھی۔ اس لئے ٹھیکہ دار کے نام کے ساتھ ساتھ ملک
کے سبھی لیڈروں کے نام کے نعرے بھی گونج اٹھتے۔ حسب معمول
وینا ناٹھ ایسی باتوں پر دھیان نہ دیتا۔ یہ روز کا دروس تھا
اور کئی بار خود اس نے بے مطلب نعروں کا ساتھ دیا تھا لیکن
ٹھیکہ دار کے متعلق نعرے سننے اور اس خاص واقعے پر سوچنے
کے لئے ایک خاص وجہ کار فرما تھی۔ دعوت کے دوران ٹھیکہ دار
نے اسے ایک طرف لے جا کر راز و نیاز انداز میں سرگرمی کی۔
بھٹی وینا ناٹھ۔ مجھے اس علاقے کے ہر دوڑ کے نام کا
تہرست چاہئے۔ میں سوچتا ہوں الیکشن لڑوں۔ تم کل سے کام
پر جانے کے بجائے یہی کام سنبھالو۔

شاید اپنا نام بڑے لیڈروں کے نام کے ساتھ سن کر ہی ٹھیکہ دار
کے ذہن میں مبہم امید حقیقت کا روپ دھارن کرنے پر مجبور

ہو گئی تھی۔

ٹھیکہ دار کا راز دارانہ کھسر پھسر یاد آتے ہی وینا ناٹھ کے چہرے پہ تلخی سی ابھر آئی۔ جب سے اُس کی ڈیوٹی بدل دی گئی تھی تب سے روپے پینے کا منہ دیکھنا مشکل ہو گیا تھا۔ وہ تو بھلا ہو ہیٹھ اور ماتحتوں کا رندوں کا جن کو ماضی کا یاد اور مستقبل کا خوف دلا کے وہ کچھ روپے اینٹھنے میں کامیاب ہو جاتا تھا ورنہ کب کا تھو کوں مر گیا ہوتا۔ خالی خالی تنخواہ کے پچپن روپے میں دو آدمیوں کا گذر آج کل کے زمانے میں ناممکن تھا۔ وینا ناٹھ نے سوچا اور ایک ٹھنڈی سانس لی۔ یوں سوچنے سے مشکل بہ جاتی تو اب تک اُس کی ساری مشکلیں حل ہو گئی ہوتیں۔ اُس کی خواہش پوری ہو گئی ہوتی۔ ٹھیکہ دار جیسے نئے مکان کی خواہش.... اچھے خوبصورت کپڑوں کی خواہش.... ڈھیر سارے روپیوں کی خواہش اور نہ معلوم اور کتنی آن گنت امیدیں.... ٹھیکہ دار کے کٹھاٹھ دیکھ کر اُس میں بھی اب ٹھیکہ داروں جیسے انداز پیدا ہو رہے تھے۔ پتلی ن فولڈنگ کے پاس فرامی اُدھر گئی تو پہننے کو جی نہیں کرتا تھا۔ کوٹ کے کارپر میلی کی ہلکی سی لکیر ابھر آتی تو ابکائیاں آنے لگتی تھیں۔ گویا بچپن سے آج تک وہ گندہ اور میل میں لٹھ لٹھ کر پلا تھا اب بھی شاید گھر پر.... وہ سوچتے سوچتے رُک گیا اُسے محسوس ہوا ماضی یاد کرنے سے احساس بہتری پیدا ہو رہا ہے اور آج اس احساس کی کوئی گنجائش نہ تھی بلکہ مستحکم ارادے کی ضرورت تھی ورنہ ٹھیکہ دار

سے بات کرنا ناممکن تھی۔ وینا ناتھ نے سوچا یہ سوتھ کر جمیٹ کے اپنے ذہن کا دروازہ بند کر دیا اور بیٹھک کا دروازہ کھول دیا۔۔۔۔۔

ٹھیکہ دار شوخ پیلے رنگ کے موٹے پر بیٹھا تھا۔ سائے تپائی پر کاغذ پھیلے پڑے تھے۔ تپائی پر جمکے کے سبب سر کی سار کا گنچ عیاں تھی۔ لیکن وینا ناتھ کو شلی نہ آئی۔ شاید اس کا ذہن اب اس بابہ بودار گنچ سے مانوس ہو چلا تھا۔ محسوس ہوئے ہی وینا ناتھ کو چوٹ سی لگی۔ اس کی اہمیت گرتی جا رہی تھی ورنہ ٹھیکہ دار پہلے اس کی موجودگی میں ننگے سر نہ بیٹھتا تھا۔ وینا ناتھ دبے پیر آگے بڑھا۔ ٹھیکہ دار نے سر اٹھانے کی زحمت بھی نہ کی شاید واقعی ٹھیکہ دار اس نئے مکان میں آکر بدل گیا تھا۔ اس کی شخصیت میں گھبراہٹ آگئی تھی۔ چہرے پر نازک سی سپیدی پھیل رہی تھی۔ جبرٹوں کے نیچے اور گردن پر گوشت کی کچھ اور تہیں ابھر آئی تھیں۔ ہاتھوں کا کھر دراہن مٹتا جا رہا تھا۔ ٹھیکہ دار ذی عزت بنتا جا رہا تھا۔

آداب عرض۔۔۔۔۔ وینا ناتھ نے پہل کی۔

بیٹھو بیٹھو۔۔۔۔۔ ٹھیکہ دار کا سراٹھا۔ وینا ناتھ نے دیکھا ٹھیکہ دار کے جبرٹوں کو ایک عجیب سی مسکراہٹ نے پھیلا رکھا ہے جیسے کسی نے کہیں سے مسکراہٹ چھین کر ٹھیکہ دار کے چہرے پر منڈھ دی ہو۔ نفرت سی ہو جاتی تھی اس مسکراہٹ سے۔ وینا ناتھ نے اومر اومر دیکھا۔ کمرے کے کونوں میں صوفے سجے تھے۔

بیچ فرسش قالین بچھا تھا۔ قالین پر بیٹھتے ہوئے وینا ناٹھ کو شرم سی آئی۔ پر کیا کیا جاسکتا تھا۔ اپنے مطلب کے لئے پیروں تلے بیٹھنا بھی گوارا کرنا تھا۔

”کیا علم رہا ہے حضور۔۔۔۔۔؟“ وینا ناٹھ نے بات شروع کرنے کی غرض سے یوں ہی پوچھ لیا۔

”ووٹروں کی فہرست (محلہ محلہ) کر رہا ہوں۔۔۔۔۔ اور وینا ناٹھ جل ہی تو گیا۔ ٹھیکہ دار پٹھنے لکھنے پر تیزی سے دسترس حاصل کر رہا تھا۔ کچھ کچھ انگریزی ہی بھی بولنے لگا تھا۔ یہی حالت رہی تو کچھ دنوں کے بعد اُس کی اپنی اہمیت بالکل ختم ہو جائے گی۔

”تو آپ اسی سال الیکشن لڑیں گے۔۔۔۔۔“ وینا ناٹھ کو احساں تھا کہ وہ بیوقوفانہ سوال کر رہا ہے۔ ووٹروں کی فہرست بنائی جا چکی تھی۔ الیکشن کے لئے نوکروں کی فوج بھرتی کی جا رہی تھی۔ اشتہارات چھاپے جا رہے تھے۔ اور ووٹروں کے ساتھ اندھا دھند وعدے کئے جا رہے تھے لیکن ایسے بیوقوفانہ سوال کے بغیر چارہ بھی نہ تھا۔ ٹھیکہ دار کی کرخت ڈھال میں یہی ایک کمزوری کا نقطہ تھا۔ ورنہ وہ گفتگوں بیٹھا رہتا۔ ٹھیکہ دار سر اٹھانے کی زحمت نہ کرتا جیسے وہ بیٹھا ہو۔ کدلی گتیا بیٹھا ہو۔

”ہاں۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ اس سال الیکشن لڑوں گا۔“ ٹھیکہ دار نے ایسے کہا جیسے کہہ رہا ہو کہ میرے نوکر ہو کر بھی شک کر سکتے ہو لیکن چہرے پر مسکراہٹ بدستور چسپی رہی۔

”واقعی جناب۔۔۔۔۔ آپ کے بغیر اس علاقے میں کوئی قابل

شخص نہیں جو لوگوں کے دُکھ تکلیف سمجھتا ہو۔" دینا ناتھ کے انکسار نے ٹھیکہ دار کو مجبور کر دیا کہ کاغذات سے دھیان ہٹا کر دینا ناتھ کی طرف مرکوز کرنے۔ اُس نے اپنی کمر سیدھی کی۔ ایک لمبی سی جمائی لے کر اپنے داغدار دانتوں کی نمائش کی۔ حقوڑی دیر گنجے سر کے کناروں کو کھرتج لیا اور تب کہیں منہ کھولا۔

"بھئی.... تم ہی بتاؤ۔ میں اس علاقے میں پیدا ہوا۔ پلا۔ میرے بچپن کے سنہرے دن اسی علاقے کی گھاٹیوں اور ٹیلوں کے درمیان بیت گئے۔ میں یہاں کے ہر آدمی سے واقف ہوں۔ ہر گھر سے واقف ہوں۔ اُن کی تکالیف سے واقف ہوں۔ اُن کی اُمیدوں اور نا اُمیدیاں سے واقف ہوں۔ اُن کی خواہشیں.... اُن کے خیالات.... اُن کے غم.... اُن کی فکریں.... اُن کی....."

دینا ناتھ بوکھلا گیا۔ اُسے یقین نہ آیا کہ سامنے بیٹھا شخص اُس کا ٹھیکہ دار ہو سکتا ہے۔ کہاں وہ اکھڑا اکھڑا لہجہ۔ کخت آواز اور چہرے پر ابدی منہ سمیت اور کہاں آج یہ شستہ رنگین زبان چہرے پر مسکراہٹ۔ جیسے مسکراہٹ نہ ہو بلکہ چہرے کے اپنے خدو خال ہوں۔ آواز شہد کے قطرے.... الفاظ ہونٹوں میں سے نکل کر نکل رہے تھے۔ روانی کا یہ عالم کہ منٹوں میں ایک بھر پور لیکچر جھاڑ دیا۔ دینا ناتھ حیران و پریشان منہ کھولے ٹھیکہ دار کو کہنے پر مجبور رہا۔

ٹھیکہ دار نے اتنے انہماک سے دینا ناتھ کو لیکچر سننے یا لیا تو اُسے یقین ہو گیا کہ خدا بھی مد مقابل آجائے تو ہار جائیگا۔ اُس کے

لیکچر دینے کے انداز میں یقیناً پختگی ہو گئی تھی ورنہ وینا ناٹھ جیسا پڑھا
 لکھا شخص بہت نہ ہو جاتا۔ گائیڈوں کے گنوار سن پائیں گے۔ تو اس
 کے نام کا کلمہ پڑھ لیں گے۔ واقعی ماسٹر صاحب نے لیکچر لکھنے اور
 اسے حفظ کرانے میں کافی محنت صرف کی ہے۔ ماسٹر جی کی تنخواہ
 ضرور بیڑھانی چاہئے۔ ویسے پوری تسلی کرنے کی غرض سے اس نے
 وینا ناٹھ سے پوچھ ہی لیا۔

”کیا میں غلط بول رہا ہوں“

”نہیں جناب بالکل نہیں۔ جو کچھ آپ نے فرمایا سو
 فی صدی صحیح فرمایا۔ وینا ناٹھ کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ وہ
 اگر خدا نہیں لیکن خدا کی برابر ہی ضرور کر سکتا ہے۔ کچھ دن پہلے
 ٹھیکہ دار گنوار، ان پڑھ اور جاہل تھا۔ آج رویہ کی بدولت
 اس کی حالت بالکل بدل گئی تھی۔ یہی حالت رہی تو کچھ دنوں
 میں مسکراہٹ کا مصنوعی پن بھی جاتا رہے گا تب شاید اس گنجے
 کے سامنے کوئی بھی سر نہ اٹھا سکے گا۔ کیا معلوم یہ گنج بھی نہ رہے
 اور ایک وہ ہے کہ پڑھا لکھا ہونے کے باوجود غربت کی وجہ سے
 بے عزت ہو رہا ہے۔ گنوار بنتا جا رہا ہے۔ جاہل اُجڑ۔
 بے وقوف“

”تم کیسے آئے“ ٹھیکہ دار نے اپنی کامیابی کے نشے میں
 سرشار ہو کر پوچھا۔

”میں جناب رحمان کے متعلق کچھ عرض کرنے آیا ہوں۔ وہ جو
 مٹی کے ڈھیر بنے اب گیا تھا۔ وینا ناٹھ نے آہستہ سے جواب دیا

ٹھیکہ دار چپ رہا اور دینا ناٹھ کا حوصلہ ذرا بڑھ گیا۔ بہت بیمار ہے صاحب۔ بستر میں پڑا ہے قصور۔۔۔۔۔ اور عزیز آدمی ہے۔

”اُس کی اپنی غلطی ہے۔ کسی نے جان بوجھ کر تو نہیں دبایا مٹی تھے۔ کسی کا کیا قصور۔۔۔۔۔ ٹھیکہ دار نے دینا ناٹھ کے نرم لہجے کو جھٹلایا۔

”صاحب قصور تو اُس کی اپنی قسمت کا ہے۔ بیٹھے بیٹھائے ناکارہ ہو گیا۔ دینا ناٹھ نے کہنے کو تو کہا لیکن دل میں سوچا کہ ٹھیکہ دار سے مرے مرے لہجے میں بات کی تو رحمان کی مدد کر چکا۔ ٹھیکہ دار سے ایک سچہ بھی بندرنا آسان نہ تھا۔

”یہ گاؤں میں کیا افواہ پھیل رہی ہے۔ کیا رحمان کو حادثے کا معاوضہ ملنا چاہیے۔ ٹھیکہ دار کے ٹیکے لہجے نے دینا ناٹھ کے ارادوں کو ٹوک سا دیا اور دینا ناٹھ گھبرا گیا۔

”جناب۔۔۔۔۔ جناب۔۔۔۔۔ قانون کی رو سے۔۔۔۔۔ کام پر حادثہ ہوا معاوضہ ملنا۔۔۔ اور ٹھیکہ دار کٹنے کی طرح بھونک پڑا۔

”تم بھی ایسا سوچتے ہو۔ عقل ماری گئی ہے تمہاری کیا۔ دینا ناٹھ کی جان محضے میں پھنس گئی۔ ایک طرف رحمان کا فکر و امن غیر تھا اور دوسری طرف ٹھیکہ دار کا غصہ۔۔۔۔۔ ٹھیکہ دار کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ غصے کی آگ نے جلا کر راکھ کر دی تھی سارا چہرہ نفرت سے پھنک رہا تھا۔ دینا ناٹھ کو ٹھیس سی لگی۔ یہی بدلہ مل رہا تھا وفاداری کا۔ گناہ بھڑا۔۔۔۔۔ ہوں۔

صاحب اُسے اکیس دن ہو گئے بستر پہ پڑے پڑے ۔ اُسے کچھ نہ کچھ تو ملنا چاہئے ۔ کم از کم ڈاکٹر کی دوائی کے پیسے
 دینا نا تھکے کے گھیر لیجئے جلتے پر تیل کا کام کیا ۔ ٹھیکہ دار کے خدو خال پرانی حالت ہو آگئے ۔ آواز میں میٹھاس کے بجائے کرخت
 لہجہ نمودار ہو گیا ۔ تنہا رہی دکالت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ۔
 دینا نا تھکے کو محسوس ہوا کہ کچھ دیر پہلے لگایا ہوا انداز غلط تھا ۔ ٹھیکہ دار بدل نہیں گیا تھا بلکہ بدلنے کی اداکاری کر رہا تھا ۔
 تاکہ دوڑوں کو رجھا سکے ۔ ہوں کتنے کی دم ۔ خصلت کہیں بدلتی ہے ۔ وہ خود غریب سہی لیکن خاندانی شرافت جیسی تو برقرار ہے ۔ محسوس ہوتے ہی احساسِ برتری کی لہر اٹھ کر اُس کی ساری شخصیت کو اُچھال گئی ۔ اُس کا لہجہ بھی کرخت ہو گیا

میں دکالت نہیں کر رہا ہوں صاحب ۔ میری ذمہ داری ہے میں ہی اُسے شہر سے لایا تھا ۔

میں بھی سمجھوں تم یکا یک رحم دل کیوں بن بیٹھے ٹھیکہ دار کے اظہار میں کئی مطلب پنہاں تھے ۔ وہ جواب دیتا لیکن ٹھیکہ دار نے اُسے کوئی مہلت نہ دی ۔

تم میرے نوکر ہو ۔ میری تنخواہ پاتے ہو ۔ تمہیں میرے فائدے کے لئے سوچنا چاہئے ۔ نہ کہ مزوڑوں کی طرفدار کی جتا کر رو ۔ یہ بڑے پھر ۔ مجھے اپنے گاؤں والوں پر بھروسہ نہ تھا اس لئے تمہیں نوکر رکھ لیا ۔ سب کام تمہارے سپرد کئے ۔ تمہیں مختار بنا دیا ۔ کیا ۔ کیا اس لئے کہ تم میری مہربانیوں کا ناجائز فائدہ

اٹھاؤ۔۔۔۔۔ میں حیران ہوں کہ۔۔۔۔۔

ٹھیکہ دار کہتا جا رہا تھا اور اُس کے ذہن پر ہتھکڑے بہرمان
جا رہا تھا۔ وہ ٹھیکہ دار کا ذکر تھا۔ ٹھیکہ دار کی تنخواہ پاتا تھا۔
ٹھیکہ دار چاہے تو کھڑے کھڑے نوکری سے جواب دے دے رحمان
کو حادثہ پیش نہ آتا بلکہ دوسرا کوئی مزدور مٹی کے ڈھیر تلے
دب جاتا تو شاید وہ خود بھی یوں ٹھیکہ دار کے سامنے نہ بولتا۔
یوں اپنی نوکری خطرے میں نہ ڈالتا۔ رحمان اگر اُس کا دوست
ہے تو ٹھیکہ دار کو اُس کی دوستی سے کیا غرض۔ اُسے تو کام چاہیے۔
غصے میں آکے نکال دے تو رحمان کے ساتھ ساتھ خود بھی در بدر
ہو جائے۔ شاید ٹھیکہ کہتی ہے سو ماویٰ کہ اُس کا دماغ خراب ہو گیا
ہے۔ خالی خولی دوستی کے سہارے بھلا زندگی گزار ہی جاسکتی ہے
کہیں۔ رحمان اگر اس کا دوست ہے تو دوستی کے ناطے اُسے
کھلائے پلائے۔ اپنی جیب سے رحمان کی مدد کرے ناحق کچھ روپیوں
کی خاطر اپنا مستقبل خراب کرنا وانا کی نہیں۔ بے وقوفی ہے۔ شاید
وہ واقعی بیوقوف ہے۔ بہت بڑا بے وقوف۔۔۔۔۔

ٹھیکہ دار نے نوکری سے نکالنے کی دھمکی تو دی لیکن اپنے
ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ ایکشن سر پر تھا۔ پڑھے لکھے
آدمیوں کی اندر ضرورت تھی۔ یہ نکال بھی دے تو نہ معلوم حرام
خور کون سا فتنہ کھڑا کر دے۔ دنیا ناخفہ کئی ایسے نہ از جانتا
تھا جن کے عیاں ہونے سے بے حد نقصان کا احتمال تھا۔ اس لئے
وقت کا نذاکت کو مد نظر نہ رکھ کر اُس نے تنبیہ پر اکتفا کی۔

”دیکھو دینا ناخفہ.... مجھے تنہا رہی پڑانی خدمت کا خیال آ رہا ہے۔ ورنہ کھڑے کھڑے نوکری سے نکالی دیتا۔ جاؤ اپنا کام کرو۔“
 دینا ناخفہ کچھ نہ کہہ سکا۔ اُس نے سوچا کہ کسی وقت اپنے آپ پر جبر کرنا فائدہ مند ہو تا ہے۔ کافی تنگ و زور کے بعد یہ نوکری حاصل ہوئی تھی ورنہ آج کل کے زمانے میں نوکریاں کہاں۔ بی اے۔ ایم اے پاس در بدر پھر رہے تھے۔ یہاں تک کہ ڈاکٹروں۔ انجینئروں اور اوردرسیوں کی فوج کی فوج بیکار پھر رہی تھی حالانکہ گورنمنٹ نے خرچے دے دیکر ان کو ٹریننگ کروائی تھی اور ایک وہ ہے کہ ذرا سی بات پر اپنی نوکری کو خطرے میں ڈال رہا ہے۔“

جوں جوں وہ سوچتا گیا توں توں اُس پر واضح ہو تا گیا کہ اس کساد بازاری میں کسی سہارے کے بغیر جینا محال ہے۔ ناممکن ہے۔ اس لئے وہ ہر جگہ بے کو کچل کر چپ چاپ واپس چلا آیا۔



سیراوتی نے ادھ کھلی کھڑکی سے پتی کو آتے دیکھ لیا تو لحاف کے اندر
 اور ذرا ڈبک کر بیٹھ گئی۔ دیرار سے ٹکا سر دھڑام سے ٹکے پر گرا دیا ایک
 لمبی سی انگڑائی لے کر اپنے ہاتھ پیر لیں پھیلانے جیسے کسی اہم کام کے لئے
 اپنے آپ کو تیار کر رہی ہو۔ دینا نا کھ آنگن پار کر کے مکان کی اوٹ میں
 ادھ جھل ہو گیا تو اس نے سر اٹھا کر اپنا جائزہ لیا۔ ابھرا پیٹ لحاف کے اندر
 کو بان کی طرح لگ رہا تھا دو چار گہرے سانس لینے سے لحاف سے ڈھکا
 پیٹ اُچک اُچک گیا مرد کو محسوس تو ہو کہ عورت کو کیسی کیسی مصلبتوں سے
 دو چار بھونپتا پڑتا ہے بھونپتے چھوٹے سانس لے کر کراسنے کی مشق بھی شروع
 کی۔ بال پہلے سے پریشان تھے کاجل پھیل کر آنکھوں کے مکرر دھکیل گیا تھا
 زور دے کر آسمان نے چہرے پر ایسے خدو خال ابھارے کہ لمحہ بھر میں وہ
 برسوں کی مریض دکھائی دینے لگی۔ کراہنے کی آواز بند رہی بڑھ گئی اور
 دوسرے کمرے سے مالک مکان کی بیوی نے پوچھا۔

پھر درد اٹھا بہن۔ آواز پر گھبراہٹ طاری تھی ساتویں مہینے
 میں یوں درد اٹھنا خطرناک تھا۔ اللہ سلامت رکھے بے چاری کو کہیں

کچھ ہو گیا تو پردیس میں جاری جائے گی۔

آں..... سو ماوتی نے پورا لفظ ادا نہ کیا۔ ہو سکتا تھا کہ آواز میں درد کی شدت نہ عیاں ہو۔ اور بھانڈا پھوٹ جائے۔ ذرا سی بات ہو جاتی تھی تو یہ لوگ خواہ مخواہ دخل ورمعطلات دینے لگتے تھے۔ پتی سے دو ماہیں کھل کر کرنی مشکل تھی اس مکان میں جب دیکھو سر پر موجود۔ صبح وینا ناقد اُسے اکیلے نہ چھوڑ جاتا اگر مکان والے کی عورتیں ذمہ داری نہ لیتیں۔ ٹھیکہ لے رکھا ہے ان چڑیلوں نے اُس کی صحت کا.... ہوں۔

میں نے کہا نا۔ ناف اور پیٹ پر کڑوے تیل کا مالیش کرلو۔ پر ختم مان بھی جاؤ۔ مالک مکان کی بیوی کمرے کے اندر آئی اور سو ماوتی نے منہ پھیر لیا۔ اس عورت کے میں خوردہ کالے کھردرے ہاتھ.... کڑوے تیل پر تھڑے ہوئے.... اور اُس کے پیٹ پر.... اُس کو ابکائی سی آئی۔ مالک مکان کی بیوی دوڑی دوڑی گئی اور بغیر کسی ہچکچاہٹ کے تھوکنے کا برتن اٹھا لائی۔ سو ماوتی آپ ہی آپ شرمندہ ہو گئی ایک وہ تھی کہ ان لوگوں سے نفرت کر لی تھی اور ایک یہ عورتیں ہیں کہ سگی ماں بہن سے بھی زیادہ اُس کا خیال رکھتی ہیں۔ ابکائی۔ سے وہ بے حال ہو گئی اور تنکے پر بے سدھ گر گئی۔

مکان کی دہلیز پر جوتے جھاڑنے کی آواز آئی مالک مکان کی بیوی سر ڈھانپتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی اور سو ماوتی نے آنکھیں موند لیں۔ پتہ تو چلے صاحب کو جب کھانا نہیں ملے گا۔ چائے نہیں پئے گی دیکھو قہر آج بیوی کو اس حالت میں چھوڑ کر جانے سے سارے گھر کا کاروبار درہم برہم ہو جاتا ہے۔ وراپتہ تو چلے ماں

کے لاڈلے کو.... دفعتاً وہ رک گئی۔ مالک مکان کی ماں کی آواز
آ رہی تھی۔ بیٹا بیوی کو واپس گھر بھیج دو۔ پہلا بچہ ہے۔ تم اکیلے
نہ سنبھال سکیے گے۔

سرمادتی نے سنا تو آنکھیں موندے نہ رہا گیا وہ کسی بھی حالت میں پتی
کا ساتھ چھوڑنے پر تیار نہ تھی۔ خدا خدا کر کے ایک ساس سے چھٹکارا
حاصل کیا تو یہ دوسری ساس سینے پر مرنے والی تھی۔ پتیا پہلی ہی۔ نہ معلوم
ہر بڑے بھیا ہر جوان عورت کی ساس بننے کی کوشش کیوں کرتی ہے۔

ماں۔ لاکھ بار کہا۔ پر وہ مانے بھی، وہ تو میری جان کھائے
پرٹل گئی ہے۔ دینا ناکھتہ کی آواز نہ تھی۔ زہر کی گولی تھی۔
سرمادتی دل مسوس کے رہ گئی۔ دودھ پیتا بچہ کھانا اس کا پتی
چہرہ کسی کو اپنی درد بھری کہانی سناتا پھرے.... بھوں.... وہ بستر
میں اٹھ کے بیٹھ گئی۔ ڈھونگ نہ جانے سے کوئی قانکہ نہ تھا
پہلے سے وہ دروسے مری کیوں نہ جائے لیکن اب پتی پر اپنی تکلیف
سمجھا ظاہر نہیں کرنے کی۔ بیوی کو الگ کرنے کے لئے بہانہ درکار
ہے نا اس کے پتی کو....

صبح سے درد میں مبتلا ہے۔ بہت پریشان ہے۔ اب کے مالک
مکان کی بیوی کی آواز آئی اور سرمادتی کے چہرے پر نفرت کے
آثار پھیل گئے کہیں... کتیا.... بڑی حیا دار بنتی پھرتی تھی مالک
مکان کی بیوی۔ سامنے تو گھبرنگھٹ کاڑھے پھرتی ہے تو پیٹھ
پچھے باتیں لڑاتی رہتی ہے۔ حسد اور رشک کی لہر میں سرمادتی کے
ذہن میں رواں ہوئیں اور وہ سانس روکے چپ کا جواب سننے

کی منتظر رہی۔ لیکن اُسے مایوسی ہوئی۔ وینا نائٹھ کی آواز کے بجائے وینا نائٹھ کا سایہ دروازے پر پڑا۔ غیر ارادی طور پر سر سہماوتی نے پہلو بدل لیا۔

”کیا بات ہے۔ زیادہ درد ہے کیا؟“ وینا نائٹھ کی آواز میں مہستور جھنجھٹا ہٹ عیاں تھی۔ شاید ٹھیکہ دار کے کچھ کے اب بھی دل پر عامی تھے۔ سہماوتی نے جواب نہ دیا بلکہ اٹھ کر سارے ٹھیکہ کرنی چاہی۔ یکایک اٹھ کھڑے ہونے سے اُس کا سر عکرا یا اور وہ دیوار کا سہارا لینے پر مجبور ہو گئی۔

وینا نائٹھ سے بیوی کی حالت چھپی نہ رہی اُس کو سہماوتی پر رحم سا آ گیا۔ شہر جاتی تو ساس سسر بلیکوں پر بٹھاتے نہ معلوم عورت ذات کو عقل کب آئے گی۔!

”تم بیمار ہو۔ اُٹھنے بیٹھنے سے زیادہ تکلیف ہوگی۔ تمہیں آرام کرنا چاہیے۔“ وینا نائٹھ نے علیبی سے کہا۔

”اچھی بھلی تو ہوں۔۔۔“ سہماوتی کا لہجہ روکھا تھا۔

”اٹھ کر دفتر تو نہیں جانا ہے۔۔۔“ وینا نائٹھ کو بیوی کی کم ظرفی پر سنہی آئی۔ ”بستر پر لیٹی رہو تو آرام سا ملے گا۔“

”کیا چائے نہ بناؤں۔ کھانا نہ بناؤں۔۔۔ تمہیں یاروں دوستوں کے پاس جانا تو ملے گا۔“ سہماوتی بالوں کا جوڑا باندھتی ملتی رسولی کی طرف جلدی۔

یاروں دوستوں کے پاس۔۔۔۔۔! وینا نائٹھ نے الفاظ منہ میں الٹ پلٹ لئے۔ بغیر کسی غصے کے۔۔۔ نہ لہجے میں کوئی کھر دراہٹ

ظاہر ہو گئی اور سو ماوٹی سنبھل کے بیٹھ گئی۔ آج انہونی سی بات
 ہو رہی تھی۔ اُس کے انگ انگ سے بے اعتباری چھلکنے لگی۔

دینا ناخنہ جرتیوں سمیت چٹائی پر بیٹھ گیا۔ جرتیوں پر کئی
 دفنوں سے پالش نہ کی گئی تھی اس لئے بڑے بے رنگ اور بھلے
 لگ رہے تھے۔ اُسے چاہئے جوڑوں پر جلد سے جلد پالش
 چڑھائے ورنہ خراب موئے کا احتمال تھا۔ ویسے پتلون بھی
 فولڈنگ کے پاس پھٹ گئی تھی تھوڑی سی سیلائی پتلون کو نیا
 روپ بخش دیتی۔ لیکن سو ماوٹی سوچی دھاگہ اٹھانے کی زحمت
 کرے بھی تو! اپنی کنگھی چوٹی سے فرمت مل جائے تو پتی کی بھی
 سدھ لے۔ شاید یہی چھوٹی موٹی باتیں جمع ہو کر میاں
 بیوی کے درمیان دیوار کی طرح حائل ہو جاتی ہیں ورنہ
 جگہ جگہ ادکا کوئی جھگڑا نہ تھا۔ مذاق تو یہ تھا کہ دونوں میاں
 بیوی اس اونچی موٹی دیوار سے مایوس تھے اور دونوں
 میاں بیوی چاہتے تھے کہ یہ دیوار کسی طور ٹوٹ جائے۔ لیکن
 سو ماوٹی توڑنے بھی دے تو..... جب کبھی اُس نے خود
 کوشش کی تو سو ماوٹی نے اپنی طرف سے اس دیوار میں
 ایک دو اینٹ کا اور اضافہ کر دیا..... ہوں.....
 مذاق..... شاید زندگی بذات خود ایک بڑا مذاق ہے
 مذاق نہ ہوتی تو وہ ٹھیکہ دار کی ٹائرسن کڑیوں پر بیٹھتا بلکہ
 اس پتلون کے پھٹے پائینچوں کی طرح ٹھیکہ دار کی حالت
 بھی بنا دیتا۔ جی چاہہ رہا تھا کہ بیوی کے یہ خوبصورت بال

سول ڈالے۔ کھول کر نوٹن ڈالے۔۔۔ نوٹج ڈالے۔۔۔ اچھے
 نوٹن ڈالے کہ بیوی کا وجود بکھر جائے۔۔۔۔۔ تحلیل ہو جائے
 تب کہیں وہ شاید فرمہ داریوں سے آزاد ہو جائے اور کچھ
 ٹھیکہ دار۔۔۔۔۔ سارے خراج ٹھیکہ دار کی نوکری غور سے
 ٹھکرا سکے۔۔

سوماوتی نے سہارا میں زور بٹور سے پٹھانیکس مارنی
 شروع کیں تو وہ چونک سا گیا۔ کہیں بیوی کو اُس کی مضحکہ
 خیز سوتج کا پتہ چل جائے تو قیامت آجائے۔ اُس نے پتلون
 سے نگاہ اٹھا کر بیوی کی طرف دیکھا۔ اُس کا ڈر دور ہو گیا
 سوماوتی سہارہ میں بیٹھ کر مارنے میں مصروف تھی۔ اُس کا
 چہرہ سہارا میں دھکتے انگاروں کے طفیل گلابی ہو گیا تھا۔
 بالوں کی کچھ لٹیں جڑے کی بندش سے آزاد مانگنے کا طیف
 کر رہی تھیں۔ گم کا جل آنکھوں میں سے پھسل کر گالوں پر
 پھیل آیا تھا۔ پھر بھی سوماوتی بڑی دلکش لگ رہی تھی
 غضب تو یہ تھا کہ گرم سہارا کی شانزدت نے انگ انگ سے
 بے اعتباری کا فورہ کر دی تھی اور سوماوتی بڑی متعصب
 لگ رہی تھی۔ دینا ناتھ نے موقع غنیمت بھان لیا۔ کیا معلوم
 وہ خود اپنے آپ کو کب تک قابو میں رکھ سکے۔ ٹھیکہ دار
 کی لٹاؤ فرہن میں اُدھم مچا رہی تھی۔ بہانہ ملنے کی دیر تھی
 کہیں دیر کر دی تو ٹھیکہ دار کی لٹاؤ فرہن سے کھسک کر
 باہر نہ نکل آئے پھر تو سب کیسے دھڑلے پر پانی پھر جائے گا۔

سسر سمجھتے ہو گئے کہ بہو راج کر رہی ہو گی گاؤں میں اور گاؤں
 کی یہ حالت کہ سبزی خریدو تو چو گئے داموں۔ چاول نہ تو آٹھ گئے
 دام دو۔ لکڑی سونے کے بھاؤ یک رہی تھی یہ تو اس جیسی
 عورت کا ہی کمال تھا جو گھر چلا رہی تھی کوئی اور عورت ہوئی
 تو میاں بیوی دونوں بھوکوں مر گئے ہوتے۔
 ”اتنے روپیے کیا کرنے ہیں۔۔۔ گھر بھینچے ہیں۔“ اس نے
 کر پدا۔

”نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔“ دینا ناتھ نے جلدی سے تردید کی۔
 وہ جانتا تھا کہ گھر کے نام پر سو ماوتی بدک جائے گی جب
 سے سو ماوتی ساٹھ آئی تھی۔ وہ ایک پیسہ بھی گھر نہ بھیج سکتا تھا
 اس لئے اصل وجہ بتانے میں ہی اُس نے اپنی خیریت سمجھی۔
 ”رحمان بیمار ہے۔ اُس کے پاس کوئی پیسہ نہیں۔۔۔“
 ”ٹھیکہ دار نے دئے نہیں کیا؟ صبح تو مجھے مرتنا چھوڑ گئے
 تھے اپنے دوست کی خاطر۔ سو ماوتی نے لفظ دوست اتنا کھینچ
 کر کہا کہ اس لفظ کا سارا پیار۔۔۔۔۔ ساری میٹھاں نفرت سے
 لبریز کر رہے آواز میں تبدیلی ہو گیا۔ دینا ناتھ کو بُرا ضرور لگا
 لیکن آج اُس نے بیوی سے پیسے کا نیا گروہ پالیا تھا۔ شاید کام
 کر جائے۔ اس لئے اُس نے بدستور علیی سے جواب دیا۔
 ”ٹھیکہ دار نے صاف انکار کیا۔ اور رحمان بڑی مشکل میں ہے۔“
 ”تو یہاں سدا بہت ہے کیا۔۔۔۔۔“ سو ماوتی اپنے اصلی
 رنگ پر آنے لگی۔

دینا ناخقد کو صدمہ سا ہوا۔ شاید وہ جان بوجھ کر بے وقوف بن گیا اور اصلی وجہ بیان کر گیا۔ بدھ کہیں کا۔ شرافت دکھائی چاہی اور عورت کے ایک معمولی اشارے پر قتل بازی کھا گیا۔ اپنی خفت مٹانے کے لئے اس نے بڑے غرور سے کہا۔

”رحمان میرا دوست ہے۔ اور دوستی کا تقاضا ہے کہ میں اس کی اس مصیبت میں مدد کروں۔“

سوماوٹی نے طنز کیا۔ ”تو جا کے اس کی مدد کرو۔ میرے پاس کیوں گھلگھیا نے آئے ہو۔“

”میں گھلگھیا نے نہیں آیا ہوں۔ روپے مانگنے آیا ہوں۔... روپے“

دینا ناخقد نے لٹکارا۔ برداشت کی بھی حد ہو جاتی ہے۔

”میرے پاس خزانہ دھرا ہے کیا۔ یا کوئی روپوں کی کان ہے۔ سوماوٹی لٹکار سن کر بالکل نہ دلی۔“

”تمہارے نام پر ڈاک خانہ میں جو روپے ہیں۔ وہ کیا ہوئے۔ دینا ناخقد نے پوچھا۔“

”تو اب تمہاری نظر ان پر بھی ہے۔ ساری زندگی میں یہ کچھ روپے بیوی کے نام رکھ دیئے وہ بھی اب کھٹک رہے ہیں کیا۔“

سوماوٹی کی آواز میں تیز چاقو کی دھار تھی۔ دینا ناخقد ٹٹملا اٹھا۔

”یہ سو رہی تھی اور رحمان کے پاس جانا تھا۔ اس کے بعد کام پر جانا تھا۔ کھٹک دار ناراض تھا۔ میرے پہنچنے پر معاف نہیں کرے گا اس لئے جھگڑا بڑھانے سے کوئی فائدہ نہ تھا۔ اس نے بیوی کو سمجھانا شروع کیا۔“

"رحمان کو اودھار دینے ہیں۔ ٹھیک ہو جائے گا تو کچھ ہی دنوں میں واپس کر دے گا۔"

پہلے کا اودھار اس نے واپس نہیں کیا اب تک سوماوٹی نے پتی کو یاد دلایا اور وینانا تھو سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ سوماوٹی کی باتوں میں کچھ کچھ صداقت ضرور ہے۔ لیکن یہ وقت نہ تھا گڑے مڑے اُکھاڑنے کا۔ رحمان بیارہ تھا۔ بے آسرا تھا اور اس کا دوست تھا۔ دوستی کا فرض تھا۔ کہ رحمان کی مدد کسی طور پر کرے۔

"پُرانی باتیں دہرانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ رو پیے دینے ہیں تو دے دو۔۔۔۔۔ ورنہ میں۔۔۔۔۔"

"ورنہ کیا دوست کی خاطر بیوی کو بیچ دو گے؟" سوماوٹی نے بات کی ٹکری۔ اور وینانا تھو کے دل میں بے ستارہ خیال ابھرا کہ بیوی کی زبان کھینچ لے۔ زبان نہ تھی تیز دھار کی قینچی تھی اس سے تو گم ہو گئی عورت بھئی!

"میں تمہیں گھر واپس بھیج دوں گا۔ تمہارا میرا انساہ مشکل ہے سمجھی؟" وینانا تھو نے اپنے نہ علم میں بڑی چوٹ کی لیکن کبھی بڑی آہٹ دھمکیوں سے وہ گئی تھی جو آج وہ جاتی۔ اس نے بھی شر کی بہ شر کی جواب دیا۔

"میں بھی دیکھوں تو کیسے بھیجتے ہو مجھے گھر۔۔۔۔۔"

"آج ہی چھٹی لکھ کر کسی کو بلواتا ہوں۔ آج سے تیرا میرا نااطاختم۔۔۔۔۔" وینانا تھو نے دھمکی کو واضح کیا۔

یہ رعب کسی اور پر جا دینا۔ اور سماوئی کے ہاتھوں
 سماوار ٹوٹتے ٹوٹتے بچا۔ سماوار کا جھنکا کمرے کی ساری
 فضا کو جھنجھانگیا۔ دینا نائقہ نے چہرے پر بکھرے بال دیکھے
 موٹی موٹی آنکھوں میں وحشت دیکھی۔ چہرے پر پھیلے کاہل
 کی لکیریں دیکھیں۔ گالوں پر خون کی پہرے نہیں دیکھیں۔ جیسے
 رسوائی کے تلخے میں اُس کی بیوی نہ تھی بلکہ سوئی ڈائن علی
 جو اُس کو چبا جانے پر تیل گئی ہو۔ وہ گہرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔
 بیوی کو گھورا اور سپاٹ لہجے میں اپنا فیصلہ سنایا۔

”ابھی چھٹی گھنٹے دیتا ہوں۔ اپنا سامان باندھ کے رکھنا۔“

وہ کمرے سے باہر نکل آیا۔ راہ داری میں مالک مکان
 کا سارا خاندان کان لگائے بیٹھا تھا۔ اُس کو اپنے سامنے
 پا کر اُن میں ہلکے ڈرچ گئی۔ کوئی اور وقت ملتا تو وہ اُن
 پر برس پڑتا۔ مکان چھوڑنے کی دھمکی دیتا۔ لیکن آج وہ
 کچھ نہ کر سکا۔ بہت پانی سر کے اوپر سے گزر گیا تھا۔ کوئی
 چمپ چمپ کے اُس کی باتیں سننے یا کہیں کوئی دوست
 دوستی کے بھروسے بیٹھا رہے تو رہے۔ اُسے اب کسی
 چیز سے غرض نہیں۔ جہاں تک اُس کی ذات کا تعلق ہے
 اُس کے لئے سارے رشتے ناٹے مر گئے صرف ایک کام
 رہ گیا تھا۔ کہ کسی طور پوسٹ آفس پہنچ جائے۔ کسی طور
 اس ڈائن سے چھٹکارا پائے۔ کسی طور آزاد ہو جائے لیکن
 دل کے کسی کونے میں رہ رہ کے یہ خیال اُٹھ رہا تھا کہ شاید

پوسٹ آفس پہنچ کر وہ چٹھی نہ لکھ سکے۔ چٹھی لکھ بھی لے۔ تو
 شاید سید مروتی کے متعلق کچھ نہ لکھ سکے۔ سید مروتی تو اس کی
 نس نسل میں کسی بڑے درد کی طرح رچ گئی تھی اپنی نس
 نس کو شاید ہی وہ نوح سکے۔۔۔ شاید ہی نوح سکے۔



کسی نے چلا چلا کر سارا مکان سر پر اٹھا لیا تب کہیں بلہ کھک کی آنکھ کھل گئی۔ لیکن وہ ہاتھ پیر ہلا نہ سکا۔ بڑھاپے نے جیسے انگ انگ توڑ کے رکھ دیا تھا۔ اس پر مصیبت کہ صبح سویرے اکٹھو۔ ٹھنڈے بے باوجود بازار سے سبزی لکڑی خریدنے پھر و۔ والیں آکر بیوی کی ڈاٹھٹ سُنو۔ اس لحاظ سے تو دنیا ناخفہ کی ماں زیارہ خوش نصیب تھیں۔ ذرا سا چولہا جلایا۔ دو چار ہانڈیاں اُتاریں اور پھٹی مٹائی۔ تعجب تو یہ تھا کہ دنیا ناخفہ کی ماں پر بڑھاپے کا کوئی اثر نہ تھا اور ایک وہ تھا کہ چند قدم چلنے سے لڑکھڑانے لگتا تھا۔

بدن میں کچھ ہوش سا آگیا تو اُس نے پھون میں سے کانگریسی نکالی۔ کانگریسی میں سب کو نیلے راکھ ہو گئے تھے۔ اُس نے انگلیوں سے راکھ کو کڑبڑا راکھ میں گرمی ضرور تھی پر چنگاری کا نام و نشان نہ ملا۔ شاید چنگاریاں اپنی ہی راکھ میں گھٹ کر مر گئی تھیں۔ بلکہ کاک نے سہ چا اور ٹھنڈی سانس بھری۔ اُس کی زندگی اِس کانگریسی کی طرح برباد تھی بلکہ اِس کانگریسی سے بھی بدتر۔۔۔۔۔ اِس کانگریسی کی راکھ کہ ہوا دینے کے لئے اُس کی

انگلیاں کوشش تو کر رہی تھیں۔ پر اُس کی اپنی زندگی کا کانگریسی کو
 کریدنے والا کوئی نہ تھا۔ بچا دینے والا کوئی نہ تھا۔ بیٹا تھا تو وہ بیوی
 کو لے کر کہیں مہرح اڑا رہا تھا۔ بیوی تھی تو اُسے گھر گرہستی سے فرست
 نہیں تھی۔ کوئی وقت تھا کہ بیوی اُس سے دو گھنٹی جدا نہ بننا پسند نہ کرتی
 تھی۔ اب یہ حال تھا کہ گھنٹوں سدھ نہیں لیتی۔ کہیں بڑھاپے کے ساتھ
 ساتھ محبت بھی تو نہیں گھنڈی پڑتی۔

یکایک اُس کے آوارہ ذہن نے پلٹا کھالیا۔ اُسے محسوس ہوا کہ کوئی
 بدستور چلا رہا ہے۔ اُسے چاہئے اُٹھ کے نیچے جائے اور چلانے کی وجہ پوچھ
 لے۔ لیکن کوشش کے باوجود وہ اُٹھ نہ سکا۔ اتنی ہی دیر میں سارا بدن
 ٹھہر گیا تھا۔ کاش اُس میں اُٹھنے کی سکت ہوتی کہ کانگریسی میں دو کو نیلے
 ڈال سکے۔ کاش وہ یوڑھا نہ ہوتا۔۔۔۔۔ کاش۔۔۔۔۔ وہ پھر اٹھا۔ اُس
 نے ہاتھ تکیے سے لگائے۔ اور اُٹھنے کی جدوجہد کرے لگا۔ بدن کا ہڈی
 جھج اٹھی۔ ہڈیوں کی چٹخنے کی آواز نے کمرے کی خاموشی میں زندگی سی
 بھردی اور اُسے تسکین سی ملی۔ جینے کی خواہش مر جائے تو زندہ رہتے
 ہوئے بھی انسان مر رہا ہے۔ اُس کو چاہئے ایک ایک پل جائے۔ اب دن
 ہی کتنے باقی تھے عمر کے۔ موت سے پہلے مرنا بڑی بے وقوفی تھی۔

بیڑھیل پر کسی کے چڑھنے کی آواز آئی اور اُس کے ذہن میں
 بھگدڑ سی صبح گئی۔ "کون ہے۔۔۔" بے تحاشہ اُس کے منہ سے نکل گیا۔
 "میں ہوں۔" ڈر لگتا ہے کیا۔ وینا ناتھ کی ماں پھر کی طرح
 کمرے میں داخل ہو گئی۔ بیوی کی تیزی دیکھ کر بلہ کاک کے ارادوں کو
 تقویت سی ملی۔ اُس نے بڑے پیار سے کہا "بڑی عمر ہے تمہارا"۔

۔ تمہارے متعلق سوچ رہا تھا اور تم سامنے آ گئیں ۔

و میں بھی سنوں ۔۔ کیا سوچ رہے تھے ۔۔ بیوی نے بے اعتباری سے پوچھا ۔

”کہہ دوں ۔۔۔۔۔۔“ بلکہ کاک نے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ۔ اکڑنے کی وجہ سے ٹانگیں رکھڑا ہٹ سے لبریز تھیں ۔

”کہہ دو۔۔۔“ وینا ناتھ کی مان نے حیران بلکہ کہا ۔ بھلا ایسی کون سی بات تھی جو نزدیک آ کر کہی جاسکتی تھی ۔ یہ ٹھیک تھا کہ بلکہ کاک کی آنکھوں میں نئی چمک سی عود کر آئی تھی ۔ پر آنکھوں کے گرد تو بڑھاپے کا جال بدستور تنہا تھا ۔

”تو سنو۔۔۔“ بلکہ کاک نے نزدیک پہنچ کر بیوی کے کندھے پر کپڑے لٹے ۔ بھرے بھرے کندھوں کے بجائے سٹوکی ہڈیاں انگلیوں کی گرفت میں آ گئیں اور اُس کا جوش کچھ سرد ہو گیا ۔

بچی کی یہ حالت دیکھ کر وینا ناتھ کی ماں کچھ گھبرا گئی ۔ کہیں پاگل تو نہیں ہو گیا تھا ۔ کندھوں میں تو کیسی انگلیاں بُری طرح سے کھسک رہی تھیں ۔ جوانی میں اتنی تیز گرفت پسند آتی تھی تو آتی تھی پر اس وقت تو سارے کندھے میں درد پورہا تھا ۔ اُس نے شائستے جھٹکنے چاہے لیکن بلکہ کاک نے گرفت ڈھیلی نہ ہونے دی ۔ بلکہ کاک کے ذہن میں یہ خیال سراپت کر رہا تھا کہ کہیں اُس کی زندگی کی ہر جنگاری نہ رکھ ہوئی ہو اور وہ اندھیروں میں ہمیشہ کے لئے ڈوب جائے تو بچانے پھر کیا ہو کون کون سے ہنگامے جنم لیں گے ۔ کیسے فتنے سراٹھائیں گے بیوی کے کندھے بھرے بھرے نہ سہی پھر بھی سہارے کے لئے کافی تھے قدم آگے

بڑھا کر پیچھے بیٹا ناشکست کا اعتراف کرنا تھا اس لئے اس نے ایک بار پھر بیوی کو بڑھلا دیا۔

”بتا دوں بتا دوں بتا دوں۔“

”کچھ کہو گے بھی“ بیوی گھبرا کر چیخ سی پڑی اور بلد کا کویقین آگیا کہ وہ ابھی زندہ ہے اب بھی اس میں اتنا سکت باقی ہے کہ کسی کو اپنے وجود کا احساس دلا سکتا ہے۔ کسی سے اپنی شخصیت منوا سکتا ہے اب بیوی سے مزید چیل کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ نہ ہی بخلگیر نے کی ضرورت تھی۔ وہ زندہ تھا۔ اس کے ارمان زندہ تھے۔ یہی بہت کچھ تھا اس نے بیوی کے کندھے چھوڑ دئے اور بات پلٹ دی۔

”بس ذرا یہ کہنا تھا ... کہ ... کہ ... کا ٹکڑی میں کیرے نہیں ہیں۔“
وینا ناتھ کی ماں کو یقین واثق ہو گیا کہ بلد کا کادمانہ خراب ہو رہا ہے۔ عجیب و غریب حرکتیں کر رہا تھا۔ ”اے۔ ایسے لگتا تھا جیسے کھانسی جانیگا۔ کندھوں میں ابھی بدستور درد ہو رہا تھا۔ کاٹ کھانے کو دوڑے تو وہ جان بھی نہیں بچا سکتی۔ بیٹا گھر میں بیٹا تا کی باپ کو سنبھالنا۔ بیٹا یاد آتے ہی وہ بلد کا ک کے پاگلپن کو بھول سی گئی۔ ”لو چھٹی آئی ہے ... نیچے بیڑھیوں پر پڑی علی۔“

”تو بسٹ میں پلہ رہا تھا لاؤ تو۔“ چھٹی کو دیکھتے ہی بلد کا ک کا لہجہ گھمبیر ہو گیا۔ ”وینا ناتھ کی چھٹی ہے۔“

”میں تو پہلے ہی سمجھی تھی۔ بھلا میں اور کون ہے چھٹی لکھنے والا۔ وینا ناتھ کی ماں سہم گئی۔ نہ معلوم بیٹا کس مشکل میں تھا۔ ورنہ چھٹی لکھنے کی اس کی عادت نہ تھی۔“

”کیا لکھا ہے...“ اُس کی آنکھ پھڑکنے لگی۔ ”اکیلے اکیلے ہی پڑھو گے یا مجھے بھی کچھ بتاؤ گے۔“ وہ پتی پر پس پڑی۔ ”بہو تو مضحک سے ہے۔“

بلد کاک بیوی کی بتیابی پر ایسے مسکرا دیا جیسے اُس کی مانتا کی تضحیک کر رہا ہو۔ ”تمہارے متعلق کچھ نہیں لکھا ہے۔“

”تم جھوٹ بول رہے ہو.....“ وینا ناتھ کی ماں منہ پھیرنے پر مجبور ہو گئی۔ ”آئسو رکھنے نہ پاتے تھے۔“

ارے بیگنی....؟ بلد کاک کو رحم سنا گیا؟ ”ناتھ جوڑ کر نمسکار لکھا ہے بیٹے نے۔“ بہو نے بھی لکھا ہے۔

”جگ جگ جئے میرا بیٹا۔“ میرا منہ سس رہا تھا۔ اُس پر۔ جہاں بھی رہے خوش رہے۔ وینا ناتھ کی ماں رو پڑی اور بلد کاک کے دل کو دھچکا سالکا۔ اُسے یقین نہ تھا کہ وینا ناتھ کی ماں رو پڑے گی وہ تو سمجھتا تھا حسب معمول بہو اور بیٹے کو صلواتیں سنائے گی۔ کئی بار اُس نے خود بہو بیٹے کو کو سا تھا۔ دونوں بوڑھے بے سہارا دن گزار رہے تھے۔ جیسے انہوں نے کسی ننھے کو جنم نہ دیا تھا۔ نہ اُسے پال پوس لیا تھا اور نہ اُس کو بچپن تک لایا تھا۔ نہ ہی کسی ننھے کی شادی چاہی تھی۔ نہ ہی جیسے کسی نے اپنے اوپر رہے پٹنے منسلک کئے تھے۔ عمر بھر کی ریاضت کے بعد کچھ ملتی نہیں.....۔ کیسی ٹنڈ منڈ درخت کی طرح۔ جس کی کوئی ٹہنی نہیں۔ کوئی شاخ نہیں۔ کوئی پھل نہیں۔ بلد کاک نے مرد کی طرح سوچا اور مرد کی طرح اپنے شانے جھٹک کر تلخی کو فراموش کر بیٹھا۔ اب چپ بھی رہ۔ رونے پٹنے سے کیا ہو سکا

روتا۔ پٹینا تو بڑا اکے لئے ہے۔۔

”کیا بچو!۔۔۔“ وینا ناکھ کی ماں کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”رحمان مٹی کے ڈھیر تلے دب گیا ہے۔ بستر پر پڑا ہے۔۔۔۔۔ ویسے بچ گیا ہے۔“ بلہ کاک کے جواب نے وینا ناکھ کی ماں کے آئینہ بھر سے اُبھارے۔ اُن کے گھر رحمان کھانا جانا بچپن سے تھا۔ وینا ناکھ کے ساتھ پتا بڑھا تھا۔ کئی بار بڑا آنے کام پر جاتے ہوئے بے ماں کے بچے کو اُس کے سپرو کر دیا تھا۔ اور وینا ناکھ اور رحمان میں اُس نے کبھی فرق محسوس نہ کیا تھا۔ بلکہ رحمان وینا ناکھ سے زیادہ پیارا تھا۔ رحمان اُس کی زیادہ عزت کرتا تھا۔ اُس کے کئی چھوٹے مرنے کا کام کرتا تھا اور کبھی نہ مچلا کرتا تھا، وینا ناکھ بھی مصیبت میں پھنس گیا مگر کاک نے باپ کی بیٹے کے لئے مخصوص نشوونما لیش ظاہر کی۔ تیار داری اُس کو کرنا پڑ رہی ہو گی۔ ذرا جلدی سے کانگریسی میں کمرے ڈال۔ میں برا سے مل لوں۔ بغیر کانگریسی کے مجھ سے چلا نہ جائے گا۔“

پتی کی بات نے وینا ناکھ کی ماں کو بے حد رنج پہنچایا۔ خود غرض بننا عمارت تھا اُس کا پتی۔ رحمان نے کئی دفعہ بلہ کاک کے سپرد اپنے بچے کو کئی بار روانہ کر دیا تھا۔ حُفے کا پانی بدل دیا تھا۔ ایسی بے لوث خدمت کی تھی کہ اپنا بیٹا بھی نہیں کرتا۔ اور بلہ کاک تھا کہ وینا ناکھ کے متعلق نشوونما لیش ظاہر کر رہا تھا۔ کہیں واقعی اُس کا دماغ تو خراب نہیں ہو رہا ہے۔ ایک نئی فکر نے اُس کے ذہن میں جنم لے لیا۔

”مہارے جانے کی ضرورت نہیں۔ میں کھڑکی میں سے آواز دیتی ہوں بڑا کو“

بلد کا کہانگڑی بچہ نک رہا تھا کہ نبرا آن پہنچا اُس نے آتے ہی
 بلد کا کہانگڑی سے کانگڑی چھین لی اور خود بچہ کتے میں لے کھینے لگا۔
 مہتممیں دھم کی بیماری ہے۔ کانگڑی نہیں بچہ نک۔ لا میں بچہ نک
 دوں۔

بلد کا کہانگڑی سے رہ گیا۔ بہت دنوں سے اُس نے نبرا کے ساتھ
 لینا چلنا ترک کر دیا تھا۔ اُسے پر غاش تھی کہ نبرا اگر رحمان کو دینا ناقد
 کے ساتھ سونہ واری نہ بھیجتا تو دینا ناقد اپنے ماں باپ کیوں بھی بھلا بھیتا
 جب کبھی دونوں ساتھ رہے کچھ نہ کچھ فتنہ کھڑا کر گئے۔ لیکن آج نبرا کے
 اشارے اُسے نبرا کو ٹیڑی کر دیکھنے پر آمادہ کیا۔ نبرا کے چہرے پر
 کوئی خاص تبدیلی ظاہر نہ تھی، کچھ جھڑکیوں کا اور اضافہ ہو گیا تھا۔
 آنکھیں کچھ اور ندر کو دھنس گئی تھیں۔ ڈاڑھی کے بال کچھ اور سفید
 ہو گئے تھے۔ شاید نبرا اب بھی وہی نبرا تھا۔ کاٹھ کا آؤ۔ بے اعتنائی
 برتنے پر بھی کتے کی طرح حاضر۔ وہ ناحق جھگڑا گیا۔ نبرا جیسے آدمی
 اتنے جھاس بن جائیں تو وہ خود کہاں جائے گا۔ کسی پر اپنی برتری جتاگا
 کیسے ہانکتا پھرے گا۔ دوستی تو بہانہ تھی ورنہ اُن دونوں کا کیا میں۔ وہ
 خود پڑھا لکھا اور نبرا اُن پڑھ۔ یہ دوستی نہیں بلکہ دنیا کی ریت ہوگی
 کہ طاقتور کمزور پر غلبہ پائے۔

نبرا نے کانگڑی بچہ نک کہ بلد کا کہانگڑی کی طرف بڑھادی۔ گرمی کی لہروں
 نے بلد کا کہانگڑی کے فلفے کا سردی ماند کر دیا اُس نے اپنی سورت بدل کر کہا
 نبرا..... دینا ناقد کی چٹھی آگئی ہے۔
 بلد کا کہانگڑی کی بات سن کر نبرا حیران ہوا اٹھا۔ دینا ناقد نے اب تک

کئی چٹھیاں لکھی ہیں گی۔ اپنے ماں باپ کو نہ لکھے تو کسی کو لکھے گا اور ایک رحمان تھا جو وہاں جا کر ایسے چپ بیٹھا ہے جیسے باب مر گیا ہو اگر بلہ کاک نے یہی کچھ کہنے کے لئے اُسے بلایا ہے تو دینا ناقد کی ماں کا شک ٹھیک ہے۔ بلہ کاک کا دماغ ضرور خراب ہو رہا ہے۔

، خیریت سے ہے نا دینا ناقد.... نبرانے رسما بوجھ لیا۔
 ، رحمان کے متعلق لکھا ہے....، نبراکے کان کھڑے ہو گئے
 نہ چاہتے بلوئے بھی وہ اپنا اشتیاق ظاہر کئے بغیر نہ رہ سکا۔
 ، جلدی کہو....، ٹھیک سے تو ہے۔ نبراکا ذہن رحمان کی خیر و
 عافیت میں اتنا اُلجھ گیا کہ بلہ کاک کے پاگلپن کو بھی بدول گیا۔
 ، کچھ زیادہ نہیں فراموشی کے ڈھیر تلے دب گیا ہے.... خطرے
 سے باہر ہے اور کمزور ہے۔“ بلہ کاک نے رُک رُک کر کہا کہیں نبراکو
 صدمہ نہ پہنچے۔

، اوہ....، نبرانے ایک لمبا سانس لیا۔ ذہن ماؤف سا ہو گیا۔
 ، کافی کمزور ہو گیا ہے۔ اُسے واپس لے آنا چاہئے۔“ بلہ کاک
 نے اُسے سمجھایا۔

، ہاں....، واپس آنا چاہئے....“ حسب معمول نبرانے بلہ کاک
 کے فیصلے کی تصدیق کی۔

، بھئی نہیں جانا چاہئے۔ اکیلے تو وہ نہیں آ سکتا۔ بلہ کاک نے
 کہا۔ اور نبراک سا گیا۔ کچھ۔ پتہ ہر فرقہ بے کے تحت وہ بوکھلا
 گیا تھا۔ وہ جذ بہ رحمان کے متعلق پورے بات سن کر پھر سے دب گیا تھا۔

رحمان کو لانا آسان نہ تھا۔ اُس کے پاس جانے کے لئے پیسے نہ تھے۔
 بڑی مشکل سے دو وقت کا کھانا میسر تھا۔ اودھار بھی کوئی دینے سے
 رہا۔ اور بلہ کاک سے اودھار مانگنا اُسے منظرِ نہ تھا۔ بلہ کاک پہلا
 جیسا بلہ کاک نہ تھا اب تو مہینوں صورت دیکھنے تک کاروبار نہ تھا
 ویسے کہیں اور سے انتظام ہو بھی جائے تو کشتی شہر میں اکیسی چھوڑ کے
 جانا ناممکن تھا۔ کوئی چور اچکا کشتی نہ سہی چھوڑا انکارہ لے کر ہی
 بھاگ جائے۔ دفعتاً وہ جھنجھلا اٹھا۔ مرہی جاتا رحمان کو روز روز
 کی معیبت سے نجات مل جاتی۔ ایک بار ہی رو وھو کے چپ ہو لیتا۔
 ”وینا ناتھ کے ساتھ آسکتا ہے رحمان۔ میں یہاں کشتی نہیں کے
 بھروسے چھوڑ جاؤں گا؟ اُس نے نہ جانے کا فیصلہ کر لیا۔

”وینا ناتھ کیسے لے آسکتا ہے۔ اُس کی بیوی ہے وہاں۔ اُس کو
 اکیلا چھوڑ کے کیسے آسکتا ہے یہاں اور پھر تو... پھر تو رحمان تمہارا
 بیٹا ہے۔ تمہیں جانا چاہئے۔“

بلہ کاک کے جواب نے نبرا کو خاموش کر دیا۔ ٹھیک ہی تو کہہ رہا
 تھا بلہ کاک۔ بھلا کوئی کیوں لے آئے رحمان کو۔ وہ رحمان کا باپ تھا
 اُس نے رحمان کو پیدا کرنے کا گناہ کیا تھا۔ اس لئے گناہ کی سزا بھی اُسی
 کو بھگتنی پڑے گی۔

وینا ناتھ کی ماں نے اُس کی سوتیلہ روک لی ویکشتی اسدو کے
 پاس چھوڑ جائے۔ سمندھی بن رہا ہے تمہارا۔ وہ انکار نہیں کرے گا۔“

مشکل آسان ہوتی دیکھ کر نبرا کے چہرے پر خوشی کی کوئی علامت
 ظاہر نہ ہوئی۔ دراصل وہ بیٹے کو نہ لے آنا چاہتا تھا۔ بیٹے کے

بغیر زندگی کچھ دیر کے لئے ہنگاموں سے محفوظ رہ گئی تھی۔ رحمان کے آنے کے بعد پھر کچھ ہنگامے جنم لینے کا خطرہ تھا۔ باپ کے ناطے وہ کہہ بھی نہ سکتا تھا کہ اُسے بیٹے کے قرب سے تکلیف ہوتی ہے۔ ایک باپ بھلا کیونکر ایسا کہہ سکتا ہے۔ دینا نہ کھلی ہنہ پر۔ بڑی کٹھن رکتی دینا آرام سے مرنے بھی نہ دیتی تھی۔

”رحمان بیمار ہے۔ گاڑی کا سفر برداشت نہ کر سکے گا۔ نبرانے دوسرا بھانہ گڑھ لیا۔ لیکن دینا ناخفہ کی ماں نے جہاں بھی جھٹلا دیا۔ دینا ناخفہ کی ماں کے ذہن میں ایک نیا خیال پیدا ہوا تھا۔ لیکن اُسے یقین نہ تھا کہ بلد کا کس اُس خیال کی تائید کرے گا۔ بہو کو دیکھے کافی دن ہو گئے تھے۔ بچوں کے بغیر گھر سنان... مرگھٹ کی طرح ویران لگتا تھا۔ جس کی چار دیواری میں وہ دو میاں بیوی دو بدروحوں کی طرح شکارہ ہے ہتھارے پاس۔ وہی لے جاؤ اور آرام سے لے آؤ بیٹے کو۔“ اُس نے اپنے خیال کو حقیقت کا رُوپ دینا شروع کیا۔

”ماں ٹھیک ہے نبرا۔۔۔ بلد کا کبیلہ کی سمجھداری کا قائل ہو کر بول اٹھا۔“ بڑے آرام سے آسکتا ہے رحمان۔ ختم تو بڑے خوش قسمت ہو جو کشتی میں رہتے ہو۔ جہاں جب چاہو جا سکتے ہو گھر بار سمیت۔“ نبرا پہ لیا حق ہو گیا۔ شکارہ لے جانے کو تو لے جا سکتا تھا کیونکہ دریا کا بہاؤ اُس کے ساتھ تھا۔ لیکن واپسی پر بہاؤ کے مقابل کشتی کھینی مشکل تھی۔ اتنی سکت ہوئی تو ٹو کری اٹھانے کی تربت نہ آئی۔ جیسے زندگی بھر کشتی میں سامان ڈھویا کرتا تھا۔ ویسے اب بھی

کے ڈھول سب کو مہانے لگتے ہیں۔ بلد کا کہ سمجھتا ہے کہ کشتی میں رہنے والے لوگ خوش ہو جائیں گے۔ بلد کا کہ کہ کیا خبر۔۔۔۔۔ بلد کا کہ پاس اپنا مکان ہے۔ اپنا آگن ہے۔ نہ سیلاب کا خوف نہ طوفان کا ڈر اور نہ ہی ڈوب جانے کا فکر۔ ایک وہ خود ہے کہ ساری زندگی ڈولنا رہا۔۔۔۔۔ بہتار ہا۔ نہ کوئی جڑ نہ کوئی سہارا۔ گھاٹ گھاٹ در بدر یہ بھی کوئی زندگی ہوئی۔ بلد کا کہ نے انجانے میں ایک ایسی رگ کو پھیرا جس میں پلپ اور جلن دوڑتی پھر رہی تھی۔ بلد کا کہ زندگی بھر اُس کا یہ درد نہ سمجھ سکا اب ٹیڑھا ہے میں کیا سمجھ پاؤں گا۔ اس لئے نہرا نے بلد کا کہ کے بجائے بلد کا کہ کی بیوی سے کہا۔

”بیانی۔ میں کشتی بہاؤ کے مقابل واپس نہ لے آسکوں گا اور مزدور کرانے پر لینے کے لئے پیسے نہیں رہے۔“

”میں سوچ رہی تھی، وینا ناٹھ کی ماں نے بلد کا کہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہوئے کہا، یہ جائیں گے اور بہو کو لے آئیں گے۔ کیوں نہ ہمارے ساتھ ہی شکار لے پر۔“

میں نہیں جاؤں گا، بلد کا کہ پھر پڑا۔ تم نے مجھے کتنا سمجھ رکھا ہے کیا۔۔۔۔۔ مجھے بے عزت کرنا چاہتی ہو۔“

اپنی بہو کو لانے جانا ہے تو اس میں بے عزتی کی کون سی بات ہے؟ وینا ناٹھ کی ماں بھی سمجھ گئی۔ مشکل سے تو ایسا موقع ہاتھ لگتا تھا اور بلد کا کہ اپنی ہیٹ دھری سے اس موقع کو کھو رہا تھا خود بھی آرام سے کشتی پر جاسکے گا اور بہو کو بھی آرام سے کشتی پر لاسکے گا۔ یاد ہے بیٹا بیوی کو لے کر تمہیں کیسے یہاں چھوڑ گیا۔۔۔۔۔ بلد کا کہ

نے اپنے زعم میں بڑی چوٹ کی۔

”ہاں ہاں یاد ہے۔“ وینا ناتھ کی ماں چمک اٹھی، اپنے ماں باپ سے نہ روکنے تو اور کس سے روکنے گا..... بچہ ہی تو ہے ابھی ۹۔

”ابھی بچہ ہے..... ہوں.....“ بلد کا ک نے ناک چڑھا کر کہا۔
باپ بٹنے والا ہے۔ باپ..... اور تم بچہ کہہ رہی ہو اُسے۔

”نتیجی تو بہتیں جانا چاہئے۔ بہو کا وقت نزدیک آ رہا ہے۔ وہاں گھاؤں میں کہیں کچھ ہو گیا تو لوگ کہیں گے۔ ساس سُسر نے جان بوجھ کر مار ڈالا بہو کو۔“

بلد کا ک بیوی کی بات سن کر رُک نہا گیا۔ ویسے ہی سمجندھیوں سے تعلقات کچھ اچھے نہ تھے۔ آج بہو کی خبر نہ لی تو عمر بھر بات رہ جائے گی۔

بیٹا بھی نہ معلوم کیا سمجھ بیٹھے گا۔ اُسے تو ماں باپ کو چھوڑنے کا بہانہ چاہئے۔ آج کل کا پود میں بندہ رگوں کا لحاظ عنقا تھا۔ اُسے جانا چاہئے کم از کم دنیا کو دکھانے کے لئے جانا چاہئے۔ چاہے بہو آئے یا نہ آئے پر دل مانے بھی.....

”تم ہی جاؤ نا..... میں بیمار آدمی کہاں کہاں گھومتا پھروں گا؟“ اُس نے کہنے کو نہ کہہ دیا۔ پر لہجے میں پہلی جیسی تڑپ نہ تھی۔

”سٹھیا گئے ہو کیا؟“ وینا ناتھ کی ماں تینک سے لگی۔ ”میں جاؤں تو تمہارا یہاں کون خیال رکھے گا۔ کھانا کون پکائے گا۔ کانگریسی چھینکی نہیں جاتی۔ چر لھا پھونک سکے گے کیا.....؟“

نیرامیاں بیوی کے جھگڑے کو دیکھ کر اکتا سا گلیہ ہاں اُس

کے بیٹے رحمان کی جان پر بن آتی تھی اور یہاں یہ لوگ دنیا داری کی باتوں میں اُلجھ رہے تھے۔ بڑے خود غرض تھے یہ لوگ۔ اُس کے جی میں آیا کہ اُنکے چپکے سے چل دے۔ ان جیسے لوگوں کے ساتھ اُس کا کوئی سمبندھ نہ تھا۔ کوئی میل نہ تھا۔ لیکن دینا ناتھ کی ماں کے آخری جواب کے انداز نے اُس کے قدم نہ اٹھنے دیے۔ ذہن میں عجیب سی پہل مچا دی۔ دینا ناتھ کی ماں کے مخروں نے۔۔۔ کتنا پیار۔ کتنی فکر۔ کتنی شہنشاہی تھی اس آخری جواب میں۔ عورت کا سارا وجود اُبھر آیا تھا۔ ان کچھ الفاظ میں۔ بڑا خوش نصیب تھا بلکہ کاک جو بڑھاپے میں بھی اُسے کسی کے پیار کا سہارا میسر تھا۔

”تم کہتی ہو تو جاؤں گا۔“ بلکہ کاک نے ہتھیار ڈال دیے لیکن جہرے پر خفقت کے بجائے بیٹھی سی مسکراہٹ تھی یا شاید اُس کی اپنی پیمکی زندگی پر طنز تھا۔ اکیلے پن پر چوٹ تھی سارے کمرے میں اسی مسکراہٹ نے پیار کی لہریں سی رواں کر دیں جن میں دونوں میاں بیوی اُس کے وجود سے بے نیاز ڈول رہے تھے۔ اُس کے دل میں بے تحاشہ خیال اُبھر کر اپنے وجود کا جویرانی بکھر کر کمرے کی فضا کو قاتل بنا دے ان کی خوشی سہی نہیں جاتی تھی۔ اُس نے کرخت لہجے میں کہا۔

”بھابی۔ اتنی خود غرضی اچھی نہیں۔ میں نے کہا نا کشتی بہاؤ کے مقابل نہ لاسکو لگا۔۔۔ تو جاؤں کیسے۔“

”میں بتاؤں۔۔۔“ دینا ناتھ کی ماں کا جواب نہ تھا بلکہ التجا تھی ”بس سے جانے میں کراہ لگتا ہے۔ وہ واپس لوٹتے وقت مزدور کو دیتا کشتی ہرام سے واپس پہنچ جائے گی۔“

نہرا کیرے اسکا رہا مادہ تھا لیکن وینانا تھ کی ماں کے چہرے
 پر مامتا کی پرچھائیں رقصاں دیکھ کر رگ گیا۔ وینانا تھ کی ماں شکرگو
 آنکھوں کے کناروں پر آنسوؤں کے قطرے ستاروں کی طرح ٹھک رہے
 تھے۔ اُس کا انگ انگ پھر دک رہا تھا جلن ہوئی لیکن ستاروں سے
 پرے آنکھوں میں مامتا کا اتھاہ سمندر بھی جھلک رہا تھا اُس کا جی نہ چاہا
 کہ اسکا رکر کے اس سمندر میں طوفان بپا کر دے۔ طوفانوں سے اُسے
 نفرت تھی۔ بے حد نفرت۔ طوفان کشتیوں کو توڑتے ہیں۔ آدمی بڑبو
 دیتے ہیں۔ وہ خود طوفان میں گھر ادھرا ہے تو اس میں بلند کاک کا قصور
 نہیں۔ بلند کاک کی بلیبی کا قصور نہیں۔ رحمان بیمار تھا وہ آج نہ جلے
 کل تو جاتا پڑے گا۔ بیٹے کو ایسی حالت میں وہاں بھیج دے تو نہیں سکتا۔
 بیٹا لاکھ بڑا سہی پر اپنے بدن کا ٹکڑا ہے۔ اگر کسی کو اُس کے آج
 جانے سے خوشی حاصل نہ ہو سکتی ہے تو اُس کا کیا جاتا ہے وہ خود خوش
 نہ سہی۔ کوئی اور تو خوش ہو گا۔ یہ بھی بہت تھا۔ اُس نے جانے
 کی حاشی بھر لی۔



موسم بہت اچھا تھا۔ کئی دنوں کے بعد سورج نے نہہرہ پور سے بادلوں کا آئینل سرگایا تھا۔ چار دن اور دھوپ پھیلی ہوئی تھی جس نے ساری کائنات کو اُجلی چمک بخش دی تھی۔ مٹی دھوپ کے ڈر کے مارے تجارت بن بن کر اُڑی جا رہی تھی۔ اُڑتے تجارت کے بیچ زمین تھر تھراتی نظر آتی جیسے سورج کی تازہ سی اُٹھ رہی ہو۔ سارے گاؤں میں اُبال سا آگیا تھا۔ بچوں کا شور و غل اُگڑا لے رہا تھا۔ ارمان جاگ رہے تھے۔ اور زندگی سرگوشی بن کر سارے گاؤں میں گھومتی پھرتی خاموشی کے پردے سکاٹی پھر رہی تھی۔

کھڑکی سے دھوپ کا چوکور قلعہ کمرے کے وسط تک پھیلا ہوا تھا جس کی روشنی میں کمرے کا کھڑ دروازہ اور بن اُبھرتی سی محسوس ہو رہی تھیں۔ اندھیرے کوئے واضح ہو رہے تھے اور گرم رویں کمرے کی سبب بستہ فضا میں ارتعاش سا پیدا کر رہی تھیں۔ لیکن رحمان ان سب چیزوں سے بے نیاز تھے۔ سر لگائے کالی حچیت کو گھور رہا تھا۔ جہاں دھوپ کے چوکور قلعے کے بیچ پڑی چینی کے حالی پیالے کی

پہ چھائی جم سی گئی تھی۔ رحمان کہ کئی بار خیال آیا کہ چھت پر یہ پیالے
کی پرچھائی نہیں، اُس کی اُمید کا تارہ ہے۔ کالہ کھردری چھت پر
پیالے کی پرچھائی کسی ننھے تارے کی طرح چمک رہی تھی۔ چھت کو
لٹکا تار گھومتے رہتے سے اُس کی آنکھیں دکھنے کو آئیں پر آنکھیں چھپائی
اُسے منظر نہ تھیں۔ کیا معلوم آنکھ جھپک گئی۔ ننھا تارہ کھجے جائے
اور وہ پھر اپنے ذہن کے اندھیریوں میں ڈوبنے لگے۔

اُمید کے تارے آنسو بن کر اُس کی آنکھوں سے بہے۔ تارہ
وہند لا گیا تب کہیں وہ کروٹ بدلنے پر مجبور ہو گیا۔ کھڑکی میں سے
روشنی کا سیلاب اندر آ رہا تھا۔ اُس کی تنگی آنکھیں چندھیا گئیں اور
وہ جھنملا اٹھا۔ نہ اس کروٹ چھین نفا نہ اُس کو ٹھکانا اُلجھس میں
پھنس گئی تھی۔ اُس نے غصے سے ٹانگوں پر سے لحاف دور پھینک دی
پاجامہ گھٹنوں سے اوپر چڑھ آیا تھا اور ٹانگیں تنگی تھیں سیرزی کی
لہروں نے ٹانگوں پر بالوں کو کھڑا کر دیا۔ ٹانگیں سوکھ گئی تھیں گھٹنوں
اور ایڑیوں کے گرد میل کی لکیریں ابھر آئی تھیں۔ اُسے ٹانگوں سے
لُفٹ سی ہوئی۔ نہ معلوم وہ دن کب آئے گا جب وہ اسی
کمرے سے باہر نکل کر دریا پر جا سکے گا اور رگڑ رگڑ کر بدن کو صاف
کر سکے گا۔ اُس نے شانے جھٹک دئے اور کھڑا ہونا شروع کیا
لمحہ بھر کے لئے اُس کا سر جھکا گیا لیکن اس نے دیوار کے سہارے
اپنے توازن کو برقرار رکھا۔ کھڑکی سے آتی ہوئی آواز میں اُسے
تڑغیب دے رہی تھیں کہ اُٹھ کے باہر جائے۔ باہر جا کر بچوں کے
ساتھ کھیلیں کرتا پھرے۔ عورتوں سے چہل کرے اور جوانوں۔

سے لڑ پڑے۔ تاکہ اس کی ہڈیاں جٹج جائیں۔ اتنے دن بستر پر لیٹنے سے سارا بدن ٹوٹ سا گیا تھا۔

دفعۃً میٹر بھیوں پر آہٹ ہوئی اور وہ دھم سے بستر پر گر گیا۔ شاید بڑھیا تھی یا شاید بچھوٹی ہو وہ اندازہ نہ لگا سکا۔ دروازہ بند تھا۔ اُس نے عجلدی سے لحاف ٹانگیوں پر کھینچا اور پکارا۔
”کون ہے.....“

دل دھک دھک دھڑک رہا تھا۔ کہیں بچھوٹی یا بڑھیا اُسے کھڑا دیکھ لے تو غضب ہو جائے گا۔ اور بھرم ٹوٹ جائے گا وہ تو جان بوجھ کر اس گھر کے مکینوں سے اپنی حالت چھپائے بیٹھا تھا۔ نہیں تو وہ کئی دنوں سے اٹھ بیٹھ سکتا تھا۔ کمرے میں گھوم پھر سکتا تھا۔ حتیٰ کہ باہر جانے کا سعی کرے تو گاؤں بھر کا جکر کاٹ سکتا تھا۔ ذرا سہا کمروری باقی بقی در نہ وہ اب بالکل ٹھیک ہو گیا تھا لیکن بستر چھوڑ دے تو کیسے۔ اس بستر کے سہارے وہ کئی قویوں کو روکے بیٹھا تھا۔ گاؤں والوں کا قرضہ تھا۔ مکان کا کرایہ تھا۔ دوائی دار کا خرچہ الگ تھا اور کیا معلوم بڑھیا اُسے ٹھیک ہو تا دیکھ کر کھانے پینے کا خرچ بھی مانگ بیٹھے۔ کئی تقاضے تھے جنہیں پورا کرنے کے لئے اُس کے پاس بچھوٹی کڑی نہ تھی۔ کمرے سے باہر جائے تو کس آسہرے پر۔ دینا نا کھنے بھی آنا چھوڑ دیا تھا۔ شاید ٹھیکہ دار کے پاس بھی نہ گیا ہو۔

دروازہ کھل گیا۔ اور بچھوٹی کا بدن عیاں ہو گیا۔ بچھوٹی حسب معمول چپ چاپ سر جھکائے اُس کی آواز کی منتظر رہی۔ بچھوٹی کی یہ

اذا اُسے بہت پسند تھی۔ جب کبھی بھٹی اُس کے سامنے آتی تھی تو آنکھیں میچی کئے بیٹھے۔ بدن سیٹھے بیٹھے چپ چاپ کھڑی رہتی تھی جیسے شرمنا رہی ہو۔

”ادھر تو آنا.....“

اُس کی آواز نے بھٹی کو کمرے کے اندر کھینچ لیا۔ میلے کچیلے فرن میں بھی وہ اچھی لگ رہی تھی۔ بال حسب معمول پریشان تھے۔ حسب معمول چہرہ چمکے گا لک میں لٹھڑا تھا۔ رحمان کو محسوس ہوا کہ بھٹی کچھ کچھ فریب بیٹھتی جا رہی ہے۔ بدن پر کچھ اور گوشت چڑھ گیا ہے۔ سینے کے نشیب و فراز ڈھیلے ڈھالے ان کے باوجود نیاں تھیں۔ شانوں کی گر لائی اور کپڑوں کا اُبھار بھی بھوش پڑ رہا تھا۔ اُس کا دل ڈنکا۔ ڈول ہو گیا۔ نہ معلوم وہ بھٹی کو دیکھ کر دنیا و مافیہا سے بے خبر کیوں ہو جاتا تھا۔

”کیا چاہتے.....“ بھٹی بدستور سر جھکائے رہی۔ رحمان سے کوشش کے باوجود وہ آنکھیں نہ ملا سکتی تھی۔ اُسے یقین سا ہو چلا تھا کہ اگر وہ رحمان کو نہ ڈانشتی تو رحمان کو حادثہ پیش نہ آتا۔

”کیا چاہتے.....“ رحمان نے نرم لب بڑبڑایا۔ اُسے کیا کچھ نہ چاہیے تھا۔ بھٹی جان بول شاید ایک بار اور لڑ پڑے۔ اس لئے اُس نے بڑی بے چارگی سے کہا ”کھڑکی تک سہارا چاہیے۔ مجھ سے اٹھا نہیں جاتا۔“ کہنے کو تو رحمان کہہ گیا لیکن دل کی دھڑکن بڑھی طرح سے تیز ہوئی۔

بھٹی کے چہرے پر کوئی مدد عمل ظاہر نہ ہوا۔ اور رحمان کا جملہ

ذرا بڑھ گیا۔ پھوٹی آگے بڑھ آئی۔ اُس کے ہاتھ رحمان کے ہاتھ میں آگئے اور وہ ہچکچاتے ہوئے اٹھا۔ ہاتھوں میں ہاتھ سہی۔ پردوں کا فاصلہ تو میلوں تھا۔ رحمان میں برداشت کی قوت ختم ہو گئی۔ کھر کی تک صرف چند قدم تھے۔ لیکن وہ ہر قدم لڑکھڑا گیا جتنے کھڑکی تک پہنچتے پہنچتے پھوٹی اُس کی پیدٹ میں آ گئی تھی۔ جی نہ چاہا کہ اب کبھی پھوٹی سے جدا ہو اور پھوٹی کی اُجھن بڑھی۔ بیماری کی وجہ سے رحمان سوکھ تو گیا تھا مگر بھی اُس کا وزن بہت تھا۔ سارا وزن اُس پر جھول گیا تھا بازوؤں کی گرفت کھر کو کاٹنے جارہی تھی وہ غصے سے بول پڑی۔ "کھر کی آگئی ہے۔۔۔"

رحمان کے ذہن کو جیسے کسی نے چابک مار دیا۔ اُس کے ہاتھ ایک دم پھوٹی سے جدا ہوئے لیکن نگاہیں پھوٹی کے بدن سے نہ ہٹ سکیں۔ کاش پھوٹی کا سپارائیسر پوتا تو وہ اپنے آپ کو اتنا بے بس نہ محسوس کرتا۔

رحمان کی ٹوٹتی مٹکاہیں اپنے بدن پر مرکوز پا کر پھوٹی گھر اسی گئی پیٹ میں بچہ اُچھلتا سا محسوس ہوا۔ غیر ارادی طور پر اُس کے ہاتھ پیٹ کے سامنے ان کو سینے کی خاطر بڑھے جی چاہ رہا تھا کہ کچھ دیر رحمان کے پاس بیٹھی رہے۔ عبدالسلام کی قربت نے اُس کے جسم میں کچھ ایسی لرگوں کو گھمگدایا تھا کہ وہ موقع بے موقعہ جذبات کی شدت سے بے قابو ہونے لگتی تھی۔ انگ انگ میں وحشت پیمبر اٹھتی۔ بدن ٹوٹنے لگتا کسی کرخت گرفت کی طلب محسوس ہوتی جو اُس کے بدن کو جکڑ کر بکھرنے سے روکے۔ بدن کو ٹوٹنے سے روکے۔ کاش وہ رحمان کی کرخت گرفت

میں جھجھل جائے۔ کاش پیٹ میں بچہ نہ اُچھلے.... کاش....
 کاش وہ عہد السلام کی مریچیں اُکھاڑ سکے... کاش وہ ہر اس
 مرد کی مریچہ اُکھاڑ سکے جن کی وجہ سے اُس کا بدن چھلنی ہو گیا تھا
 رحمان کی ٹٹو لٹی ہنگا ہیں نہ نکلیں۔ تیشتر تھے جو اُس کے بدن کی چھلنی
 کر رہے تھے۔ اُسے رحمان سے نفرت سی ہوئی اور وہ منہ پھر کر کمرے
 سے باہر جانے لگی۔

”میرے پاس نہیں بھیجی گئی...“ رحمان کی آواز میں کئی دُکھ عیاں
 تھے۔ وہ سہ نہ سکی۔ ویسے ہی اُس کو کیا کم دُکھ پہنچے پڑ رہے تھے۔
 ماں کا ڈر، درد کی جلن، ٹرسسوائی کا خوف.... ایک دُکھ ہوتا۔
 ایک ڈر ہوتا تو وہ شاید عہد السلام کی دعا کو نظر انداز کر کے
 رحمان کی طرف جھجک جاتی.... لیکن اتنے سارے دُکھ اور وہ ننھی
 سی جان نہ معلوم یہ مرد کیوں اتنے کہینے ہوتے ہیں۔ اُن کا بس چلے
 تو عورتوں یا ریلوں کی ہڈیوں سے گزشت چن چن کے توجہ لیں اور ہڈیاں
 تک چپا جائیں.... درندے....

”میں تمہاری نوکرانی ہوں کیا.... ہوں۔“ لہجے میں مرد ذات
 کے برخلاف عورت کے وجود کی کھربوں نفرت جھلک رہی تھی۔

رحمان کا منہ اترتے دیکھ کر وہ دہاں مزید نہ رُک سکی۔ ڈانٹنے
 کو تو اُس نے رحمان کو ڈانٹ دیا لیکن دل پشیمان ہو رہا تھا۔ بھلا رحمان
 کا کیا قصور.... یہ ٹھیک تھا کہ رحمان اُسے دیکھ کر بے قابو ہونے لگتا
 تھا۔ اُس کی آنکھوں میں درندگی اُڈاتی تھی۔ نہتھے کسی کعبہ کے کیتے کی طرح
 پھر کٹے لگتے تھے اور ہاتھ بے تحاشہ نوچنے کو آگے بڑھتے تھے۔ پھر بھی

رحمان کی درندگی ایک عجیب ہیکچر ہٹ سے برہنہ ہوئی تھی۔ اُس کی وحشت میں پیار بھی شامل محض اُس کے بڑھتے ہاتھوں میں نرمی کی خفیت بیٹھاس بھی تھی۔ یقیناً اُسے رحمان کی نگاہوں میں عبد السلام کی نگاہوں جیسی کرہ بھی بھوک کبھی نہ نظر آئی۔ اور بڑی بات تو یہ تھی کہ رحمان کی بڑی بڑی ڈرائی نو کیلی مومچیں نہ تھیں۔ واقعی کوئی قصور نہ تھا رحمان کا اگر کسی کا قصور تھا تو اُس کا اپنا تھا۔ خود اپنے آپ کو رحمان کے بارے عبد السلام بھوکے گدھ کو سوئپ دیا۔ کاش وہ ایسا نہ کرتا کاش ماں اُسے سنگھاڑے اُکٹھے کرنے پر مجبور نہ کرتی۔ کاش اُسے بھوک نہ لگتی۔۔۔ کاش۔۔۔ اپنی بے بسی۔ بے کسی محسوس کر کے وہ سر ڈھیل پیر ہی بیٹھ کر کھٹ کھٹ کر رونے پر مجبور ہو گئی۔

پھولی عورت تھی۔ رو رہی کہ اپنے غم غلط کر سکتی تھی۔ روتے ہوئے کوئی دیکھ لے تو پان میں منہ چھپا کر رو سکتی تھی۔ پھر رحمان مرد ہونے کے ناطے رو رہی نہیں سکتا تھا۔ آنسو بہانا اُس کا شیوہ نہ تھا۔ اُسے چاہیے لڑ جھگڑا اس گورکھ دھندے میں سے اپنا راستہ بنائے۔ لیکن لڑ جھگڑے تو کس کے ساتھ۔ کوئی حریف تو سامنے نہ۔ سب سے اُسے خارش زدہ کٹنے کی طرح نظر انداز کر دیا تھا۔ خارش نہ وہ گنا۔۔۔۔۔ ورنہ وہاں تھ کیوں آنکھیں پھیر لیتا۔۔۔۔۔ گنا۔۔۔۔۔ ہوں اور کھڑکی پر بیٹھے بیٹھے اُسے بہت دنوں بعد بھوڑا یا آیا۔

رحمان اور وہاں تھ جب بچپن کی حدود ہی چھل گئے میں مصروف تھے تو اُن دنوں اُن کے محلے میں ایک تندرست گنا ہوتا تھا جس کا نام محلے والوں نے بھوڑا رکھ دیا تھا۔ وہ بڑا لڑکا تھا

ہر ایک کا ناک میں دم کر رکھا تھا اُس نے۔ کیا مجال جو کسی غیر شخص کو ٹھلے میں آنے دیتا۔ کوئی دن نہ جاتا تھا جب وہ کسی کے پیچھے نہ لپکتا یا کسی کا پاؤں نہ پھنڈا ڈالتا۔ محلے کے بڑے بوڑھوں نے اُسے کئی بار مروڑنا چاہا پر ہر بار وہ بچ جاتا تھا۔ کبھی نہ ہر گھر اگر شبت کو لئی ووسرا کٹنا کھا جاتا، اور کبھی بھوڑ نہ ہر گھر اگر شبت کھانے بیٹھے کروڑیاں بار بار اُسے محلے کے بچوں نے زہر ملا کر شبت کھانے سے روکا تھا۔ جہاں ٹھلے کے بڑے بوڑھے بھوڑ سے خائف تھے وہاں محلے کے بچے اُس سے ماتو س نکلتے۔ بچے اُس کو پونچھ سے کھینچتے۔ گھسیٹتے۔ اُس کے کان مروڑتے۔ اُس کی تھو تھنی میں بے خطر ہاتھ ڈال کر ذانت گینتے۔ لیکن بھوڑ بے حس و حرکت مڑے کی طرح بچوں کی زیادتیاں برداشت کرتا رہتا۔ جتنے کہ بچے اُس کی پیٹھ پر گھوڑے کی طرح سواری کیا کرتے تھے۔ اور بھوڑ خوشی خوشی اُن کو ٹھلی کو چوں میں لئے لئے پیہرا کرتا تھا۔

ایک دن شہر میں کوئی سرکس آگیا۔ دینا ناٹھ اپنے باپ کے ساتھ شاہد دیکھ آیا لیکن رحمان نہ دیکھ سکا۔ اُس کے باپ کے پاس سرکس دیکھنے کے لئے فالتو پیسے نہ تھے مصیبت تو یہ ہوئی کہ دینا ناٹھ اُس وقت بیٹھتے سرکس کی رٹ لگائے پھرتا تھا۔ کبھی ہوا لٹی بھوڑے کے قصبے سُنا تا۔ کبھی شیروں کی خوفناک دھاڑ کا ذکر کرتا۔ اور کبھی دوڑتے گھوڑوں پر کرتب کرنے والی لڑکیوں کا ذکر کرتا۔ اور خوب بڑھا چڑھا کر ذکر کرتا تھا۔ رحمان کو کئی بار دینا ناٹھ کی باتوں کا یقین نہ آیا۔ یہ سنا تھا شیر ڈھاڑنے والوں۔ چھوٹے چھوٹے ہوں

پر دوڑتے گھر ڈروں پر کہاں اُچھلا جا سکتا ہے جبکہ بھوٹو کی پیٹھ پر
 اپنے آپ کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا تھا۔ وینا ناٹھ لاکھ کچے سپر وہ
 مانے بھی؟ ناچار وینا ناٹھ کو اپنی سچائی جاننے کے لئے بھوٹو کھڑا کرنا
 پڑا۔ خود دوسرے دوڑتے ہوئے آیا اور بھوٹو کی پیٹھ پر جھلانگ
 لگائی۔ ترائی کی آواز آئی اور وینا ناٹھ بھوٹو سمیت زمین پر گر گیا
 رحمان فقیر مارا۔ وینا ناٹھ کھسیانا ہو کر کپڑے جھاڑنے لگا لیکن بھوٹو
 نہ اٹھ سکا۔ وہ زمین پر پڑا پڑا کر رہا تھا شاید اُس کی کمر کی
 ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ وینا ناٹھ گھبرا کر بھاگ گیا۔ اور رحمان بھوٹو
 کے پاس اکیلا رہ گیا۔ اُس نے کئی بار بھوٹو کو چمکایا... دیکھا اور
 اٹھانے کی کوشش کی۔ لیکن بھوٹو اٹھ نہ سکا۔ صرف زبان نکال کر زمین
 کو چاٹ رہا تھا یہ حالت دیکھ کر رحمان دوڑا دوڑا گیا اور دریا
 کنارے سے اپنی ٹوپی میں پانی بھر لایا۔ لیکن بھوٹو نے....

جب بھوٹو کی لاش جنگلی نے دریا بردار دی تو رحمان ڈاڑھیں مار
 مار کر رویا اور وینا ناٹھ اپنے گھر میں بیٹھا محلے کے بہت سارے بچوں
 کو سرکس کی باتیں سنا دیا جیسے بھوٹو اُس کا اپنا نہ تھا۔ جیسے بھوٹو
 اُس کو پیٹھ پر لاد کے محلے کی سیر نہ کراتا تھا اور جیسے بھوٹو اُن لوگوں
 کی آواز سن کر میلوں دوسرے دوڑتا ہوا نہ آتا تھا۔ یا جیسے بھوٹو
 کی جان اُن کی کہیں کو دینے نہ لی تھی۔ جیسے کچھ بھی نہ ہوا تھا۔ بھوٹو
 کتا تھا اور ایک کتا مر گیا تھا اس میں رونے کی کون سی بات تھی۔
 بہت دنوں تک محلے کے بچوں نے اُس کا مذاق اڑایا۔ اتنا مذاق
 اڑایا.... اتنا مذاق اڑایا کہ وہ بھی اپنی حرکت پر کھسیانا ہو گیا۔

۲۲۲
 بیتی باتیں دہرانے سے اُس کی آنکھوں میں نمی سی تیرنے لگی۔
 ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کی زندگی بھوٹو سے بھی بدتر ہے۔ بھوٹو کی
 موت پر وہ رو دیا تھا لیکن اُس کی موت پر شاید کوئی نہ رووے۔ نہ
 بھوٹو کی روئے گی۔ نہ بڑھیا رووے گی۔ شاید ویتاناکھ کا آنکھوں میں
 بھی آنسو نہ آئیں۔ اور کون تھا اس گاؤں میں اُس کا اپنا۔ اُس کی
 آنکھوں میں بے تحاشہ آنسو ابھر آئے۔ چاروں اور پھیلی دھوپ
 کا اُجلی جاوے ماند سی پڑ گئی کائنات کا ہر رنگ دھندلا گیا اور مکان
 کے سامنے ٹیچر بھرے آننگن پر دھند کے بادل سے چھانے لگے۔
 دھند کے دبیز تہوں میں بوڑھے باب کا لڑکھڑاتا وجود ابھرتا
 محسوس ہوا۔ شاید وہ بھی اُس کی موت پر نہ روئے جسے وہ اپنے
 ذہن کی خود غرض سیلوٹوں میں کبھی بھول چکا تھا۔ کٹیک ہی تو تھا
 بھلا کیوں روئے اُس کا باب۔ کیا اُنس تھا بوڑھے باب کو بیٹے سے
 کون سا مطلب پارہا تھا وہ بیٹے سے۔ وہ باب کا لاڈ لا کبھی نہ
 تھا اور نہ کبھی بن سکا شاید اُس کا اپنا وجود بوڑھے باب کے لئے
 نفرت کا وجود تھا۔ وہ ماں کے مرنے کے بعد زندہ نہ رہتا تو
 شاید بوڑھا نیا گھر بساتا۔ نئی شادی کرتا۔ نئے بچے پیدا کرتا۔ شاید
 یہ بھی ایک وجہ تھی جو باب نے چار مہینے بیٹے کی شدھ نہ لی۔ بوڑھا
 مرجائے تو شاید وہ خود بھی نہ روئے۔

بیٹا بونے کے ناطے باب کے متعلق ایسے خیالات..... تیز
 دھوپ کی شانرت کے باوجود تداامت کا سچا بستر لہر اُس کے
 بدن کو منجد کر گئی۔ انگ انگ میں جھرجھری سی دوڑ لگ گئی۔ کاش

بوڑھے کا لڑکھڑاتا وجود بھی دھندلکے میں گم ہو جائے۔ جذبات
 ہو جائے اور وہ اکیلا۔۔۔۔۔ بالکل اکیلا اپنے وجود کی دیرینوں
 میں بھٹکتا پھرے لیکن نہ معلوم کیوں باب کا لڑکھڑاتا وجود ڈوب
 جانے کے بجائے ابھرتا جا رہا تھا۔ واضح ہوتا جا رہا تھا۔ اُس نے
 تمیز کے واسطے آئینہ بونچھ لئے اور یکایک وہ چونک پڑا۔
 اُس کا باب ایک چھوٹی سی گھڑی بغل میں دابے ایک بڑے
 چپو کے سپہارے کیچر بھرے آئینے کو بھٹا نکلتا جا رہا تھا۔ وہی نیلی
 دھاری دار تمیز۔ وہی سفید شلوار جو میل کی بیغارتلے ٹیلا لارنگ
 اختیار کر چکی تھی اور وہی لال پٹا اسکاٹ۔۔۔ جس کی گہری جیبوں
 میں وہ خود بہت پہلے۔۔۔ بچپن میں راتوں کو اٹھ اٹھ کر باب سے
 چوری چھپے پینے تلاش کیا کرتا تھا۔۔۔۔۔ یا شاید چوری کرتا تھا۔
 چوری کا احساس ہوتے ہی وہ شرمندہ سا ہو گیا۔ شکل تمنا گئے
 اور سامنے بدی میں بے پنی کی لہر سی دوڑی۔ شاید سورج کی
 تازت کا اثر تھا۔ اُس نے سوچنے کی کوشش نہ کی۔ باب کی آمد
 نے اُس کے ذہن کو موقوف سا کر دیا تھا۔

کیے آئے۔۔۔۔۔ ہر کمرے میں باب کو داخل ہوتے دیکھ کر اُس کے
 منہ سے بے اختیار نکل گیا اور ساتھ ہی وہ کھسیانا سا ہو گیا۔ باب
 بیٹے سے ملنے نہ آئے تو کون آیا۔ اُسے چاہئے باب کی خیر و عافیت
 دریافت کرے۔ اُس کی صحت کا حال پوچھے۔ باب کے چہرے پر
 بوڑھاپے کی چھاپ اور واضح ہو گئی تھی۔ شانے کچھ اور جھک آئے
 تھے اور سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ بے چارہ۔۔۔ اب تو کچھ

سیرھیاں بھی چڑھ نہیں پاتا۔۔۔۔۔ اُس کو باپ کی حالت پر رحم سا آگیا۔

نبرے نے بیٹے کو دیکھ لیا تو کھجور نچکا رہ گیا۔ رحمان گھاس کے تنکے جتنا رہ گیا تھا۔ گوشت ہڈیوں سے اُڑھ چکا تھا اور پوسٹ ٹسکا ٹسکا لگتا تھا۔ چہرے پر زردی کی چھاپ تھی اور آنکھیں چہرے کی ہڈیوں میں ڈوبی ڈوبی لگتی تھیں۔ جی چایا جا کے بیٹے کو گود میں اٹھا سینے سے چمٹا لے۔ اور اپنی دھڑکنوں سے اُس کے سوتے بدن میں زندگی رواں کر دے۔ اپنے خونی سے اُس کے بدن کو سینچے۔ ایک سالس بچھا ور کر دے بیٹے پر۔ لیکن وہ آگے نہ بڑھ سکا۔ رحمان کے الفاظ نے ماتا کے سر سوتے کو جیسے پتھروں سے ڈھک دیا ہو وہ کمرے کے وسط میں جان بوجھ کر کھڑا رہا۔ رحمان سایہ ضرور لگتا تھا لیکن اس سائے میں بڑی تیکستی چھن تھی۔

باپ کو بدستور رکھ دے دیکھ کر رحمان نے اپنی غلطی سُدھاری ”بیٹھو۔۔۔ میں بغیر سہارے کے اُٹھ نہیں سکتا۔“

نبرے کو جھٹکا سا لگا۔ بیٹا اتنی بڑی حالت میں اور وہ نخرے کرتا پھرے۔ وہ اور نہ سہہ سکا۔ رحمان کی بے بس آواز نے اُس کی ماتا کے سوتوں کو آتش کی روانی دی۔ اُس کے قدم آگے بڑھ گئے اور رحمان اُس کی پیٹ میں آگیا۔ بوڑھے ہاتھ بیٹے کے انگ انگ کو چھونے لگے۔۔۔ انگ انگ کو سہلانے لگے۔

بڑے کی آنکھ حسب عادت سویرے کھل گئی۔ اُس نے ادھر
 ادھر دیکھا۔ اُس کو کچھ نہ دکھائی دیا۔ کمرے میں گہری تاریکی
 تھی۔ شاید باہر روشنی پھیل گئی تھی لیکن صحیح اندازہ لگانا مشکل
 تھا سردی روکنے کے لئے کھڑکی کی درزوں پر کپڑا پھیلا دیا گیا تھا
 اُس نے گلے کو کھنکھار اگلا سہ کھا سہ کھا سا لگ رہا تھا۔ کھنکھارنے
 کی آواز کمرے کی خاموشی میں گونجنے لگی اور اُس کے سارے
 بدن میں جھنجھری سی دوڑ گئی۔ سارا بدن ٹڑٹڑا ٹڑٹڑا لگ رہا
 تھا۔ رانیں اور بازو تو جیسے درو کے بوجھ تلے دب سے گئے تھے
 دن بھر چپ چلا نا پڑا تھا اسی لئے شاید نکلن کا غلبہ تھا۔ اب
 تو وہ کشتی چلا نا بھول سا گیا تھا اور وہ اندھیرے میں آپ سی آپ
 ہنس پڑا۔ وہ بڑی عجیب باتیں سوچ رہا تھا آج کیسے نکلن
 نے اُس کے ذہن پر بھی نہ غلبہ پالیا ہو۔ بھلا مچھلی تیرنا بھول جاتی
 ہے۔ پھندے پرواز بھول سکتے ہیں جو وہ پانچویں پہر کرکشی کھینا

بھول جائے۔ کشتی کھینا اُس کی عبادت ہے۔ عبادت بھول جائے تو
 جئے کیسے۔ اُسے اتنا یقین تھا کہ بوڑھا پا چاہے کتنی ہی یلغار کرے
 لیکن جب تک اُس کے بدن میں زندگی کی آخری رمق بھی باقی ہو
 اس کی سوکھی ہڈیاں کشتی کھینے کی حرکات پر تاجتی رہیں گی اور
 چوہ کا کھر دراڑ اندھ ہاتھوں میں آ کر خود بخود نرم و نازک بن جائیگا
 یہ خود فریبی نہ تھی۔ حقیقت تھی۔ بچپن میں چوہ نے سہارا دے کر اُسے
 گھٹنوں گھٹنوں چلنا سکھا یا تھا۔ کچھ بڑا ہو کر چوہ نے کھڑوں کی ضرورت
 پوری کی تھی اور وہ گھٹنوں کشتی کے پھٹیوں پر بیٹھ کر دریا کی منجلی لہروں
 سے کھیلتا رہتا تھا۔ چوہ نے اُسے تعلیم دی۔ قلم کے بدلے چوہ ہاتھ
 میں مقام کر اُس نے رواں دریا کی وسیع کتاب پر پڑھنا لکھنا سکھا
 چوہ کے سہارا سے اُس کی زندگی کی کشتی دنیا کے بے رحم تقصیروں
 پر بہتی رہی۔ اور بوڑھا پے میں چوہ لاکھٹی بن کر اُس کی سہارا دے
 جارہا تھا۔ اُسے محسوس ہوا چوہ چلانے سے اُس کے بدن میں کوئی
 ٹھکن نہیں ہوئی۔ بلکہ اگر ٹھکن ہوئی ہے تو اس مگرے کے گھٹے گھٹے
 ماحول کی وجہ سے ہوئی ہے۔ نہ کہیں کشتی کے پھٹیوں کے کرانے
 کی آواز تھی اور نہ کہیں لہروں کی میٹھی چپ چپ کی آواز....
 نبرے کو عادت تھی کشتی کے کھر ڈرے پھٹیوں پر سوجانے کی
 اور کشتی رات بھر پانی کے ہچکچاہٹوں پر ایسے ڈولا کرتی تھی جیسے
 کوئی ماں اپنے بچے کے پلنگے کو ہلے ہلے جھلارہی ہو۔ بچے کو
 ہلے ہلے جھلارہی ہو۔ لیکن اس مگرے کے مردہ ماحول میں
 وہ رات بھر نہ سو سکا تھا۔ سارے مگرے پر موت کا سکوت طاری

تھا۔ کئی دفعہ ایسے لگا تھا جیسے موت نے اپنے ٹھنڈے پنچے بڑھادے
میں ڈر اور خوف کروٹوں میں بدل گئے تھے۔ پر ان کروٹوں نے
بھی مردہ کمرے میں کڑی جنبش نہ پیدا کی

بستر میں اب اور نہ رہا جاتا تھا۔ وہ اٹھ کے بیٹھ گیا۔ آنکھیں
اندھیرے سے مانوس ہو گئیں تھیں۔ اب کے اندھیرے میں سو یا
رحمان سائے کی طرح واضح ہو گیا۔ دروازے کی چرکھٹ کے
پاس ہلکی سی، جلی لکیر بھی دکھائی دینے لگی اور دروازے کے سہارے
کھڑے چپڑے کی موٹی کالی لکیر تو غیبی سہارا بنا بہت ہوئی وہ بے اعتنا
اٹھ کھڑا ہوا۔ اعتیاد سے کپڑے کو کھڑکی کی درزوں سے
جھکا کیا اور کھڑکی کے پٹ واسکے۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں میں
ماری سی کی چھن تھی۔ روشنی بھی پوری طرح نہ پھیلی تھی۔ کہیں
کہیں ستارے نظر آ رہے تھے جیسے بجھے انگارے ہوں۔ شاید
ٹھنڈے نے انہیں ڈھک رکھا تھا۔ نا اُس نے چلار رحمان کو جگائے۔ اُس
سے باتیں کرے۔ کچھ اپنی کہے۔ کچھ اُس کی سننے دین میں کمی لشد
سوال اور دھم چارے تھے۔ بڑھیا کون ہے؟ اُس کی بیٹی
کہا ہے؟ گھر کا مالک کہاں ہے۔؟ بڑھیا کے انداز پریشان
گن تھے۔ رات کھانا ایسے کھلایا تھا جیسے وہ کراہہ دار تھا
باب نہ تھا بلکہ کوئی سگا تھا۔ بڑھیا نہ تو بلی و لہن کی طرح
شترناگنی تھی اس کے سامنے اور وہ بوجھلا کر کھانا نہ کھا پایا
تھا۔ گو کھانا بڑا مزیدار بنا تھا۔ برسوں بعد ایسا کھانا میسر ہوا
تھا۔ نہ ملک کم نہ زیادہ۔ چاول میں ایک بھی کمتر نہ تھا اور

پروسنے کا اندازہ اتنا خراب و بے درت تھا کہ پودے والی کے ہاتھوں
کی داد دینیے بغیر نہ رہا جائے۔ ہر ایک لڑاے میں اتنی مٹھاس تھی
جیسے ہر لڑاے میں کسی کا پیار تحلیل ہو چکا تھا۔ اُس کے منہ میں
پانی بھر آیا۔ مزہ لینے کے لئے وہ رات کا کھانا پھر سے یاد کرنے لگا
تھی کہ وہ رحمان کو جگانا بھڑل گیا۔

جب دوسرا حادثہ اُس کی آنکھ کھل گئی تو اندھیرے کا سحر
ختم ختم ہو چکا تھا۔ دن بہت چڑھ آیا تھا۔ اور رحمان کھر کی پر
بیٹھا دھوپ سینک رہا تھا۔ سارے آنگن پر دھوپ بڑھیا کی مسکراہٹ
کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ وہ بھنبھلا اٹھا۔ بڑھیا نہ ہوئی۔ شیلان
کی تالہ ہوئی جو ذہنی پر بڑھی طرح سے سوار ہو گئی تھی۔ جسے کہ وہ یہ
بھی نہ سوج سکا کہ رحمان بغیر سہارے کے کھر کی تک کیسے گیا ویسے
رحمان کی تنکھی نگاہیں بھی کچھ کم تیز نہ تھیں۔ شاید سوج رہا ہو کہ
جو باب عمر بھر اُسے دیر سے جاگئے پر ڈانٹ پھینکا کر گیا کرتا تھا۔
وہ خود کیوں دیر سے جاگ گیا۔ جی چاہا نہ پیر سے اُٹھنے کا حجاز
پیش کرے۔ لیکن اُس کے لب نہ ہلے۔ شہر میں تکرار ہوتی تو ہوتی
یہاں تو وہ رحمان کا باب تھا۔ اپنے بیٹے کو ساتھ لے جانے کے
لئے آیا تھا۔ اپنے بیٹے پر حکم جھانڈنے آیا تھا۔ اُسے چاہئے ایک
باب کی طرح گھبر رہے جیسے بلد کا ک بیٹے کے سامنے گھبر رہتا ہے
بلد کا ک کی یاد آتے ہی اُس نے رحمان سے پوچھا۔ بلد کا ک نے
کوئی خبر سمجھائی ہے کیا۔

”نہیں تو....“ رحمان نے ایسے کہا جیسے بلد کا ک کے متعلق

کوئی بات نہ کرنا چاہتا تھا لیکن ہنرا کچھ نہ سمجھا۔ اس نے تشریش ظاہر کی۔

”بھئی آج واپس جانا ہے۔ خبر تو بھیجانی چاہیے۔“
 ”تم فکر نہ کرو۔ اٹھو اور منہ ہاتھ دھو لو۔ پانی ٹھنڈا سو رہا ہے
 رحمان جھنجھلا اٹھا۔

اور ہنرے کو محسوس ہوا کہ بیمار رہنے رحمان کی شکل و صورت تو بدل رہی ہے لیکن مزاج تبدیل نہیں کیا ہے۔ طبیعت میں نہ ہی تیزی اور غلبہ پن تھا۔ جی چاہا بیڈ کو ڈاکٹر دے لیکن پانی کے آنسو رے پر نظر پڑتے ہی سارے اعصاب کا فور ہو گیا۔ آنسو رے میں سے بھاپ اٹھ رہی تھی یا شاید کوئی بھجولی لبر کا یا دبی چاہا کچھ دیر ایسے ہی بیٹھا رہے اور ذہن کہ بے لگام گھومنے دے اور بہت پہلے بہت پہلے کے زمانے میں آوارہ ہو جائے جب کوئی صبح سویرے ہاتھ دھونے کے لئے گرم پانی کا آنسو رہ سامنے لا کر رکھ دیتا تھا۔ غیر ارادی طور پر اس کی نگاہیں دروازے کی اور مڑ گئیں کہ شاید کوئی منہ ڈھلانے والا نمودار منہ جائے دروازے کے حدود واضح ہوتے ہی وہ کھسکا سا ہو گیا۔ اس نے اپنے شانے جھٹک دئے اور لستر میں سے نکل آیا۔ بد کاٹک کو آنا ہی نہ تھا تو خود ہی آجائے گا۔

کوئی اور دن ہوتا تو بد کاٹک رحمان کی حالت دیکھ کر تشریش ظاہر کرتا۔ شاید اس کے انگ انگ کو ٹیڈ لٹا بھی۔ اس نے رحمان کو اپنے گھر میں بڑا سوئے دیکھ لیا تھا۔ گھر کا بچہ تھا رحمان

پر آج اُس کی زبان گنگ رہ گئی۔ دینا ناتھ نے دوستی کے ناطے
 رحمان کی شکایت نہ کی بلکہ پر سوماوتی نے گھونگھٹ کی آڑ سے بہت
 کچھ کہا تھا۔ کاش دینا ناتھ کی ماں سامنے بیڑتی تو بیٹی کے صمیم
 اندازوں کی قائل ہو جاتی۔ وہ تو ایک ہی نظر میں آدمی کو دیکھ
 لیتا ہے۔ پر کوئی مانے بھی۔ اس لئے بہم کہ ہم خیال پا کر وہ نڈر
 ہو گیا تھا۔ پر یہ ظالم سانس کچھ کہنے بھی دے چھاتی تو پھٹی
 جا رہی تھی۔ وہ تو بھلا ہو نبرے کا جس نے اُسے اتنے دیکھتے ہی
 سہارا دے کر بیڑھیاں ملے کر انہیں تھیں ورنہ وہ تو میڑھیں پر
 ہی گر جاتا۔ اُس کے وجود میں کڑواہٹ سی اُبھر آئی۔ گر بجا
 جاتا تو رحمان تب بھی نہ اٹھتا۔ شاید دینا ناتھ بھی پر زائد کرے
 بیوی اور رشتہ دار و دردن رو دھولیں گے اور بھول جائیں گے۔
 دنیا اپنی بیڑھنگی چال چلتی رہے گی۔ رحمان اور دینا ناتھ یکجا ہوتے
 رہیں گے اور فتنے کھڑے کرتے رہیں گے۔ دروازے کی چو کھٹ کے
 سہارے کھڑے کھڑے اُسے چھس ہو کر اُس کے سارے ارادے
 اور فیصلے اس ناپائیدار دنیا میں پانی کے بلبوں کی سی وقعت
 رکھتے ہیں جو کچھ دیر اپنا وجود منوانے کے لئے ہنر تھراتے ضرور ہیں
 اور پھر تھک کر سر ٹیک کر دم توڑ دیتے ہیں۔ لیکن دوسرے
 لمحے رحمان کی آواز نے اُس کے سارے ارادوں کو تھجھک کر
 تن جانے پر مجبور کیا۔ رحمان بیٹھے ہی بیٹھے کہہ رہا تھا۔
 "اندراؤ۔۔۔ چاچا جی۔۔۔ اندراؤ۔۔۔"
 بلکہ کاک بل ہی تو گیا۔ آج کل کے لونڈوں کا بس چلے تو

بزرگوں کی پکڑیاں اُچھالتے پھریں۔ رحمان نے اٹھ کر خیر مقدم کرنا بھی نہ گوارا کیا۔۔۔ سہ ماہی کا کہنا غلط نہ تھا۔ رحمان واقعی چلے سرے کا بد ذات تھا۔

”بھئی جوتے تو اتار دو۔۔۔۔۔“ نبرے نے منہ ہی اور بلد کا بیٹھے پر مجبور ہو گیا۔ رحمان کے اصرار پر وہ کھڑکی کے سامنے بیٹھ گیا اُجلی دمھپ اچھی لگی۔ سنسن گرم ہونے لگی۔

”ہاں جی کیسی ہیں۔۔۔۔۔“ رحمان نے بھیلپن سے پوچھا۔ بلد کا کہ رحمان کے بھیلپن میں عیاری محسوس ہوئی۔ وہ چونکنا ہو کر بول پڑا۔

”اچھی ہے۔۔۔۔۔“
کمرے میں پھر خاموشی طاری ہو گئی۔ رحمان نے خاموش رہنا ہی تھا۔ دینا ناتھ کے ساتھ تعلقات اس حد تک بگڑ گئے تھے کہ بلد کا کہ ساتھ بات کرنی مشکل ہو رہی تھی۔ لیکن بلد کا پریشان سا ہو گیا۔ نبرا بھی چپ تھا۔ ایک دم رحمان کو شہر جانے کے لئے کہنا مشکل ہو گیا۔ اس نے آہستہ سے پوچھ لیا۔

”یہ کیا حالت بنا رکھی ہے تم نے۔۔۔۔۔“
”بلد کا کی آواز نے نبرے کے بندھ کھول دئے وہ ایک دم بول پڑا۔“ ہاں بلد کا کہ بُدی حالت ہے۔ بغیر سہارے کے اٹھ نہیں سکتا۔“

”بلد کا اپنی زیادتی پر پشیمان ہو گیا۔ بغیر سہارے کے اٹھا نہ جائے تو خیر مقدم کیونکر کرتا۔ ناحق بے چارے پر الزام دیا۔“

” میں نے تو اُسی دن کہا دیا تھا کہ رحمان کو یہاں نہ بھیجیو
تم مانتے بھی۔۔۔“ اور نیرا حسب معمول مرعوب ہو گیا۔ باپ کو
مرعوب ہوتے دیکھ کر رحمان کو چڑسی ہو گئی۔ باپ ابھی سے
بلد کا کک کے سامنے دبتا جائے تو بات بد چکی۔

” تو پھر تیار ہو جاؤ۔۔۔ دیکھ کا ہے کی ہے“ بلد کا کک نے کہا۔
اور نبرے کے ذہن پر پھر سے خاموشی کا پردہ گرا۔ وہ خالی غولی
آنکھوں سے بیٹے کو تنکے لگا۔ اور رحمان جھنجھلا گیا۔ بڑا بے وقوف
تھا اُس کا باپ جو اپنا بڑا بھلا نہیں سوتھ سکتا۔
” میرا فیصلہ تو سن چکے ہو۔ جواب کیوں نہیں دیتے“ رحمان نے
باپ کے آڑے آتے ہوئے کہا۔

” کیسا فیصلہ۔۔۔۔۔“ بلد کا کک نے نبرے کو شمش وینج میں
ڈال دیا۔ ایک طرف بلد کا کک تھا جس نے ستر بھر روادار ہی
برتی تھی۔ اُس کی وقت بے رقت مدد کی تھی اور ہاتھ پکڑ پکڑ کر
زندگی بھر راہ سمجھائی تھی اور دوسری طرف بیٹا تھا۔ جس کی وجہ
سے اُس کی زندگی ڈالو اڈول رہی اور جس نے اُسے کبھی شکوہ و
چین کا سانس نہ لینے دیا۔ جی تو کرتا تھا بلد کا کک کا ساتھ دے
لیکن بازار کا قرضہ دینا تھا۔ مکان کا کرایہ ادا کرنا تھا اور
بڑھیا کی تیار داری کی قیمت ادا کرنی تھی۔ کاش بلد کا کک اُس کی
مجبوری سمجھ سکے۔ کاش بلد کا کک اُسے یوں گھور گھور کر نہ دیکھے۔
لاچار ہو کر نبرے نے کہا۔ ” رحمان شہر جانے پر تیار
نہیں۔“

بلکہ کاک نے سنا تو ٹھٹھک کے رہ گیا۔ بے اعتبار نگاہیں نبرے کے بدن پر پھیلا دیں جیسے نبرے نے اس کو کوئی بڑا دھوکہ دیا ہو۔ یوں تو بلکہ کاک نے وینا نامتھ اور سومو موٹی کی بے اعتنائیاں سہیلی تھقیں۔ اور ان پر زیادہ غور بھی نہ کیا تھا۔ سومو موٹی اس کی اپنی بہو تھی۔ اپنے بیٹے کی بیوی تھی۔ خراب تھی یا اچھی تھی یہ اپنی تھی۔ لیکن برا پرایا تھا۔ رحمان پرایا تھا۔ قدرتی طور پر اس کا ذہن نبرے اور نبرے کے بیٹے کے ذہن پر مسلط تھا۔ اس لئے نبرے کے الفاظ نے اس کے بہت سارے اندازے چرچر کر دیئے۔ اُسے بڑی تکلیف ہوئی۔ شاید بوڑھا یا اسی کا نام ہے جب ہر کوشش ہر دائرہ نام کا میاب ہو جائے اور آدمی اپنے اندازوں اور ارادوں کی لاش کے سرہانے بیٹھا ہاتھ ملتا رہے۔

میں شہر نہیں جا رہا ہوں۔ یہیں مزدوری کروں گا۔ شہر میں پیٹ بھرنے کا کوئی آسرا نہیں۔ بلکہ کاک کو رحمان کا کہنا بُرا تو لگا۔ لیکن رحمان کی مشق کے سامنے کچھ کہا نہ گیا۔ واقعی رحمان ٹھیک کہتا تھا۔ شہر جائے تو کرے گا کیا۔ رحمان نے بلکہ کاک کو چپ ہو تے دیکھ لیا تو نبرے کو تقویت دینے کے لئے بولتا گیا۔

گاؤں کا قرضہ دینا ہے۔ چالیس روپے۔ روپے دئے بغیر کیسے جاسکتا ہوں؟ اور بلکہ کاک چالیس روپیوں سے دس سا گیا۔ تجربے نے اسے سکھایا تھا کہ باپ بیٹے کا رشتہ ٹوٹ جائے

تو ٹوٹ جائے۔ بیوی خاوند کا رشتہ ٹوٹ جائے تو ٹوٹ جائے
 حتیٰ کہ مامتا کا رشتہ بھی ٹوٹ جائے لیکن روپے پیسے کا رشتہ
 نہیں ٹوٹ سکتا۔ یہی ایک رشتہ تو تھا جس پر ساری دھرتی کی
 قدریں قیمتیں قائم تھیں۔ رحمان کو ساتھ لے جانے اور وینا ماتھے
 سے الگ کرنے کی اس ٹوٹنے دیکھ کر اُسے سینے میں جلن سی
 محسوس ہوئی۔ اُس نے ساری جلن نبرے کے منہ پر تھوک
 دی۔

”میں نے سو ماوتی کو شہر جانے پر آمادہ کر لیا ہے۔ تم بیٹے
 کو آمادہ نہ کر سکے تو تم جالو۔ خیر رحمان کی مرضی تم تو جلد۔ دیر
 ہو رہی ہے۔“

نبرے پر بلہ سنگسنگ کا طنز کا رگر نہ ہوا۔ زندگی گذر گئی تھی
 دنیا کے طنز سہتے سہتے۔ اس لئے اُس نے خاموش رہنا ہی بہتر
 سمجھا۔ باب کی حالت دیکھ کر رحمان کو ایک بار اور بلہ ساک کا
 سامنا کرنا پڑا۔ کشتی تو نہیں جا سکتی۔ میں یہاں کشتی چلایا
 کروں گا۔“

یہ دوسرا جھٹکا تھا جس نے بلہ ساک کو یہ سمجھنے پر مجبور کر دیا
 کہ باب بیٹا اُس کو بے عزت کرنے کی سازش عمل میں لارہے ہیں
 وہ بوڑھا سہی۔ پرنبرے کی طرح بے وقوف نہیں۔ شہر میں کشتی
 چلانے سے پیٹ بھرنے کی سبیل نہ تھی تو اس ویران گاؤں میں
 کیسے ہو سکتی ہے۔ یہ سب چال تھی۔

”میں بھی سفوں گاؤں میں تم کشتی چلا کے کیا کماؤ گے اور

کیسے کماؤ گے۔"

یہاں پارسی بل میں دریا کے دونوں طرف کام پھیر رہا ہے۔
مزدوروں وغیرہ کو آ رہا ہے جانا پڑتا ہے۔ سامان لے جانا پڑتا
ہے۔ لیکن یہاں کوئی ٹرل نہیں۔ ٹرل راجن میں ہے اور راجن ایک
میل سے بھی زیادہ فاصلے پر ہے۔ اس لئے پار جانے کے لئے
تین ساڑھے تین میل کی مسافت طے کرنی پڑتی ہے۔ اگر میں ایک آنہ
سوارسی بھی لوں تو دن میں کئی روپے کما سکتا ہوں یہاں کے
بانجی ڈھروں روپے کما رہے ہیں۔

رحمان کی بات سن کر بلبلے کا گرجا جی چاہا کہ قائل ہو جائے۔
لیکن کیسے۔۔۔ بہو کو لے کر ایک میل سے زیادہ فاصلہ ہاجن گاؤں
تک طے کرنا تھا۔ ہاجن سے بس میں شہر تک جانا تھا اور بس کے
حصہ کیوں سے جان پر بن آتی۔ اس لئے اس نے اُنسا رحمان کو
قائل کرنا چاہا۔ ”ایسے کئی پروگرام ہمارے پاس ہیں زندگی میں بنگا
تھے۔ لیکن کوئی پورا نہ ہوا۔ اب تم کیا کر سکتے ہو۔“

ایسا نام سن کر نبرے سے چپ نہ رہا گیا۔ بعضی بلکہ ساک حجت کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ رحمان ٹھیک کہتا ہے۔ یہاں بہت کام ہے۔

اور ستم بڑھے جے وقت پر پہنچا۔ ستم کیا جانہ یہ باتیں۔ رحمان
ڈالٹی سیدھی پڑھا دی اور ستم بہک گئے۔۔۔۔۔ بلکہ کاک بھی

پڑا۔

بلد کا کہ ہر بار اسی انداز سے نبرے کوڑاٹھا کرتا تھا اور

ہر بار نبرا سر جھکائے ڈانٹ سہم لیتا تھا۔ پر آج... اس مکان میں شاید بڑھیا سیڑھیوں پر کھڑی اُس کی باتیں سن رہی ہو گی۔ سیڑھیوں پر کئی بار سدا یہ سا لہرا اٹھا تھا۔ بڑھیا ضرور سن رہی ہو گی۔ شاید بلہ کا ک کی ڈانٹ بھی سن لی ہو۔ اُس کا چہرہ لال ہو گیا زندگی میں وہ بھی پہلی بار بھیر پڑا۔

”تم مجھے بے وقوف بوڑھا کہتے ہو۔ ذرا خود کو تو دیکھو۔ بغیر سہارے کے ایک قدم نہیں چل سکتے اور جانتے ہو تمہاری بیوی تم کو پاگل سمجھتی ہے اور تم مجھے بیوقوف کہتے ہو۔“

بلہ کا ک کو یقین نہ آیا کہ نبرا اُس سے یوں مخاطب ہونے کی جرأت کر سکتا ہے۔ یہ سب کا رستانی رحمان کی ہو گی۔ اُس نے نبرے کو دھمکا ڈر کر اُس کے منہ لگنے پر اُکسایا ہو گا۔ غصے کے بجائے اُس کو نبرے کی حالت پر رحم سا آ گیا۔ بوڑھا ہے پر جوانی کا غلبہ یقیناً ہو رہا تھا۔ اب بحث کرنے میں کوئی لطف نہ تھا۔ رنگ بدل رہے تھے۔ انداز بدل رہے تھے۔ رشتے بدن رہے تھے۔ دنیا بدل رہی تھی۔ اُسے بے انتہا تنگن سہی محسوس ہوئی۔

”تم ٹھیک کہتے ہو نبرے۔ میں بھلا بوڑھا پاگل میری بات کا کیا بھروسہ.... میں چلتا ہوں۔“

نبرا دل ہی دل میں پشیمان ہو گیا جس بات کا دھڑکارا تھا بھر اُس کو لگا ہوا تھا۔ وہ آخر ہو کر رہی رہی۔ بلہ کا ک ناراض ہو گیا۔ عمر بھر کا ساقھی ناراض ہو گیا۔ بلہ کا ک شاید ٹھیک کہتا تھا کہ وہ سٹھیا گیا ہے۔ ورنہ اس عمر میں بڑھیا کا خیال اُس کے ذہن

پر کیسے چھا جاتا۔ بڑھیا نہ بھڑکی۔ کوئی جنت کی شہر بھڑکی جس کے لئے
 اُس نے دنیا دارمی اور دوستی کی لات مار دی۔ بلد کا ک نے جوتے
 پہن لئے تو اُس سے رہا نہ گیا وہ اکھڑ کھڑا بھڑکیا۔ "آؤ میں بڑھیا
 اُترنے میں مدد دوں۔"

بلد کا ک نے کوئی احتجاج نہ کیا۔ اکیلے بڑھیاں اُترنا اُس کے
 بس کی بات نہ تھی۔

اور رحمان ان دو بوڑھوں کو ایک دوسرے کے سہارے ٹہکتے
 دیکھ کر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ بلد کا ک کے رو پیے نے جتنی کچھ تنہی
 اُس کے وجود میں ابھاری تھی اس مسکراہٹ نے چشم نازن میں
 کاغذ کر دی۔

دو پہر دن چڑھ آیا تھا رحمان پارسی بل گھاٹ سے لگی کشتی
 میں پاؤں پانی میں لٹکائے بیٹھا تھا۔ نگاہیں دریا پر ایسے جمی تھیں
 جیسے دریا کی روانی کو روکنا چاہتی ہوں۔ دریاں دریا کی سطح پر
 گھاس بچھڑے کے تیلے اپنی رفتار سے رحمان کو بہتے وقت کا احساں
 دلا رہے تھے۔ اور وہ دل ہی دل میں بیچ و تاب کھار رہا تھا۔ کئی بار
 اُس کی دُور دیدہ نگاہیں گھاٹ کی ڈھلان پر دوڑ گئیں لیکن نگاہیں
 ہر بار خالی خالی لوٹ کر دریا کے پانی پر ٹوک جاتیں۔

آج بہت دنوں بعد دریا کا پانی سبزی مائل ہو گیا تھا۔ سبزی مائل
 پانی میں آسمان کی گہرائیوں کی نیلی پرچھائیاں نازک سی خوبصورت
 کا اضافہ کر رہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے سارا آسمان سورج کی
 تمازت سے گہرا کر دریا میں ڈبکی لگائے بیٹھا ہے۔ سورج کی تمازت
 برداشت سے باہر تھی۔ رحمان نے ہاتھ اٹھا کر مانتے ہوئے پھر اُس
 کی انگلیاں نم ہو گئیں۔ بے کل ہو کر اُس نے پسینے سے قطرے انگلیوں

کو پانی میں ڈبو دیا۔ پانی ٹھنڈا محسوس ہوا یا شاید آسانی سے برستی
 آگ کے مقابلے میں ٹھنڈا محسوس ہو رہا تھا۔ رحمان نے غور کرنے
 کی ضرورت نہ سمجھی۔ وہ تو چاہا رہا تھا کہ کپڑوں سمیت کشتی میں
 سے پھسل کر دریا میں جا گرے تو شاید پانی بدن کی گرمی کے ساتھ
 ساتھ ذہن میں اُبلتی جلتی بھٹیوں کو بھی بجھا دے اب واقعی اور
 انتظار مشکل تھا۔ ویسے بھوک بھی لگ رہی تھی۔ صبح گھاٹ پر
 آنے سے پہلے وہ ایک سنگھاڑے کی موٹی سی روٹی پیٹ میں جھونک
 چکا تھا۔ ٹمکیں چائے کے دو ایک نیپا لے بھی چڑھا آ یا تھا پھر
 بھی بھوک نے تنگ کرنا شروع کر دیا۔ اُسے چاہئے۔ انتظار کرنا
 چھوڑ دے۔ بلکہ چپکاندے پر تھام کر گھر کی چل دے۔ بڑھیا شاید
 کھانا لانا بھول گئی ہے۔ کاش صبح اُس نے بڑھیا کے اصرار پر
 ایک آدھ روٹی اور کھالی ہوئی۔ انتظار کی شدت نہ سہی بھوک
 کی شدت تو کچھ کم پڑ جاتی۔ کاش.....

کیا ایک وہ آپ ہی آپ جھنجھلا اٹھا۔ یہ ٹھیک تھا کہ بڑھیا
 اُسے کسی سنگے کی طرح چاہتی تھی۔ یہ بھی ٹھیک تھا کہ بڑھیا کی
 بدولت وہ موت کے منہ سے واپس نکل آیا تھا۔ یہ بھی ٹھیک
 تھا کہ بڑھیا صدیوں کے تعلقات..... عمر بھر کے رشتے ناٹے
 اور بڑھاپے کی تلخی واد پر لگا کر گاؤں والوں کے سامنے سینہ
 نہیں نہ ہوتی۔.... اُس کی حمایت نہ کرتی تو آج اس گھاٹ سے
 لگی کشتی میں یوں پیر لیسارے نہ بیٹھا ہوتا بلکہ شہر میں کہیں دربدہ
 پھرا کرتا۔ گاؤں والوں کو پسند نہ تھا کہ کوئی غیر آدمی اُن کے

گھاٹ پر کشتی کھینچا پھرے اور خواہ مخواہ اُن کی روزی میں شریک بن جائے۔ بڑھیا کے سوکھے وجود میں اتنی سرکشی..... اتنی بغاوت..... دیکھ کر اُس پر خود گھبراہٹ طاری ہو گئی تھی۔ کبھی کسی غلطی کا مرتکب ہو گیا تو شاید بڑھیا زندہ نہ چھوڑے..... وہ شاید غلطی کر رہا ہے جو اپنی زندگی کی نادر بڑھیا کے سرکش ہاتھوں میں سوئپ رہا ہے۔ کیا معلوم پھولی اُس کی ہو سکے گی۔ اور کیا معلوم مل بھی جائے اور بڑھیا اُڑے آجائے۔ عقل کا تقاضہ تھا کہ بڑھیا کا قرضہ بیاک کر کے شہر کا رخ اختیار کرے۔ اپنے بوڑھے باپ کا کہا مان لے۔ بوڑھے باپ نے بوڑھے ارمانوں سے پیسہ پیسہ جوڑ کر بھوکے لڑے لڑے کیٹے کئے تھے وہ چاہے بوڑھے باپ کو بھول جائے۔ لیکن گھبراہٹ..... سنسناہٹ اور شرمانے کی کیفیت وہ شاید ہی بھول جائے جو بوڑھے باپ کی زبانی اپنی شادی کے متعلق سننے سے اُس کے بدن پر طاری ہو جاتی تھی۔ شاید پھولی اتنی اہم نہیں جو وہ اتنے سارے بندھن توڑنے پر تُل گیا ہے۔ پھولی.... جو روز بروز دور ہوتی جا رہی تھی۔ اُس سے چھٹی پھرتی تھی۔ منجوس کشتیا کی طرح کو ٹھٹھری کے اندھیرے گوشوں میں غرائی رہتی تھی۔

اُس کی سوچ رُک گئی۔ گھاٹ کی ڈھلان پر بڑھیا کا کالا پھرن اُبھرنہ ہاتھ اور اُس کے ذہن کو جھٹکا سا لگا سب سوچیں رُک کر بڑھیا کے سر پر مرکوز نہ ہو گئیں۔ بڑھیا کے سر پر کپڑے کی

گٹھڑی سی دھری تھی اور گٹھڑی پیر برتن تھا۔ اُسے محسوس ہوا کہ چاہے اُس کی عمر کا ایک ایک لحظہ ضائع ہو جائے۔ چاہے پھر کی ۹ سے جنم جنم دھنکار تھی پھرے اور چاہے اُس کی ناؤ اس گھاٹ سے لگی لگی ڈوب جائے وہ اس بڑھیا کے ہاتھوں سے اپنی زندگی کی ناؤ پتوار نہ چھین سکے گا بڑھیا کی مانتا کا وہ قرعہ نہیں چکا سکتا۔ !

بڑھیا ناؤ کی طرف بڑھی اور اُس نے کچھ نہ کہا بلکہ ہاتھ بڑھا کر دریا میں ڈبو دیا۔ رسمی گفتگو فضول تھی۔ بڑھیا کا سینہ دھڑکنے کی طرح چل رہا تھا۔ رحمان کو حسب معمول رحم آگیا بڑھیا نے سانس کو سہارا دینے ہوئے کھانے کا برتن اُس کی طرف بڑھا دیا۔

جب کبھی بڑھیا اُس کے لئے کھانا لاتی تھی تو کپڑے کھیل کر برتن پر سے ڈھکن اٹھاتی تھی۔ تب کہیں کھانے کا برتن اُس کے آگے سرکاتی تھی۔ لیکن آج معمول توڑنے پر رحمان کا دھیان نہ گیا۔ بھوک تو جان بھاننے پر تل گئی تھی۔ اُس نے خود ہی کپڑے کی گانٹھ کھول دی اور ڈھکن ہٹا دیا۔ برتن میں چاول تھے اور کوئی جنگلی ساگ تھا۔ گائوں بھری ساری سبزی بے وقت بارش نے سڑا دی تھی۔

شروع شروع میں بھوک کی وجہ سے چاول میٹھ لگے اور سبزی میں بھی کوئی نقص نظر نہ آیا۔ لیکن جب دو چار لقمے کھا کر اُس کی بھوک کچھ ڈھیلی پڑ گئی تو ہاتھ بھی ڈھیل پڑ گیا۔ چاول پوری طرح

سے اُبل نہ پائے تھے اور سبزی میں بھی جنگلی سبزیوں کی مخصوص کڑواہٹ
باقی تھی۔ اُس نے پوچھا۔

”چاول کچے رہ گئے ہیں اور سبزی بھی کڑوی ہے کیا اچھی طرح
سے دھوئی نہ تھی۔۔۔۔؟ رحمان نے اپنی دانت میں نرم لہجہ استعمال
کیا۔ لیکن بڑھیا کے جواب نے اُسے اچنبھے میں ڈال دیا۔ بڑھیا
کا لہجہ بڑا اڑو کھا تھا۔“

”اچھی طرح سے دھوئی نہیں ہوگی یا شاید جلی گئی ہوگی۔۔“
رحمان ٹھٹھک گیا۔ بڑھیا نے اُس سے ایسا برتاؤ تب بھی نہ
کیا تھا جب وہ بستر پر بیمار بڑا کسی بچے کی طرح چھلا کرتا تھا کہ میں
آج بڑھیا اُس کا معمول ٹوٹتا دیکھ کر باقی سارے معمول توڑنے پر
نہ تل گئی ہوں۔ اُس کا اپنا معمول تھا کہ جتنا کچھ وہ صبح سے دوپہر تک
کشتی کھے کر کھاتا۔ کھانے سے پہلے بڑھیا کے ہاتھ میں تھما دیتا تھا اور
رات جب گھر لٹ جاتا تھا تو باقی دن کی ساری کمائی بڑھیا کے
سامنے رکھ دیتا تھا پہلے پہل بڑھیا نے کمائی لینے سے انکار کیا تھا۔
لیکن رحمان کے اصرار کے سامنے وہ ٹھہر نہ سکی۔ اب وہی گھر کو
سمیٹا لیتی۔ چاول سبزی خریدتی اور چائے پانی کا انتظام کرتی تھی۔
اور جب کبھی رحمان سگریٹ خریدنے یا بال کٹائی کے لئے ایک آدمہ
آنہ مانگ لیتا تھا تو بڑھیا کا چہرہ مارے ماتا کے دھک اٹھتا۔
یقین نہ آتا تھا کہ کوئی اُس سے یوں پیسے مانگ رہا ہے۔ جیسے
بچے اپنی مائیں سے مانگتے ہیں۔ اپنے ڈھلوانے یقین کو سہارا دینے
کے لئے وہ رحمان کو سر کا جھوٹ موٹ معاینہ کرتی۔ سگریٹ عیسیٰ

فصل خرچی کرنے پر ڈانٹتی بھی۔ اور تب کہیں دو چار آنے دیکھ دیتی تھی۔ رحمان کی اس چھوٹی سی حرکت نے بڑھیا کی زندگی کو نئے سرے سے جینے کا مطلب پیش کیا تھا اس لئے اس کی صحت بھی اچھی بننے لگی تھی۔ گالیوں پر ہلکا سا تناؤ آ گیا تھا اور ہاتھوں پر ٹھنڈی کے اُبھار میں بھی ٹھنڈی فرقی پڑ گیا تھا۔ اپنے بدن میں فرق محسوس کر کے بڑھیا کے دل میں سوئی عورت بھی جاگ پڑی تھی اب وہ بالوں میں ہر دوسرے دن تیل ڈالتی۔ کنگھی کرتی اور کبھی کبھار آنکھوں کو کا جل سے بھی سنوارا کرتی تھی۔

رحمان خاموشی سے کھانا بنگلہ تھا اور سوچتا رہا کہ آج اگر وہ بڑھیا کے ہاتھوں میں کچھ نہ کھائی انڈیاں سکا تو یہ اس کا قصہ نہ تھا۔ آج صبح سے اس نے کچھ نہ کھایا تھا۔ کسی نے کچھ نہ کھایا تھا۔ لیکن کچھ نہ کھائے تو بڑھیا گھر میں رہنے ہی کیوں دے۔ وہ بڑھیا کے بطن سے تو نہ پیدا ہوا تھا۔ نہ ہی وہ بڑھیا کا رشتہ دار تھا پھر کیوں بڑھیا اس کی خاطر چڑھنے کے سامنے جلتی رہے۔ کیوں فرلانگ آدھ فرلانگ تپتی دھوپ اور ٹھنڈی بارش میں کھانے کا پرستار لاوے لاوے پھرے۔ آخر کیوں۔۔۔۔۔ جب وہ خود بے مطلب بڑھیا کے پاس نہ رہ رہا تھا۔ بلکہ کچھولی کی خاطر بڑھیا کے ہاتھوں کٹھ پتلی بن رہا تھا۔ ٹھیک تو تھی بڑھیا کا رکھائی۔ اسے چاہئے کسی طور رکشتی کھیتا رہے۔ پیسے کما تا رہے اور بڑھیا کے سرکش ہاتھوں اور پیروں کو سونے چاندی کی زنجیروں میں جکڑ دے۔ پھر شاید کچھولی اس کی ہرکے گی۔

دار سے اُس کی جھکی گردن کو توڑ سکے گی۔ وہ جنم جنم کی
 بھڑکی بوڑھی..... وہ جو بھڑکی کی بھی ماں غلی جس
 کا ورد اُس نے بھڑکی کے وجود میں آنے سے پہلے محسوس
 کیا تھا۔ سہہ لیا تھا اور جس کی پیدائش پر وہ مرتے مرتے
 بچ گئی تھی۔ اور جن کو اُس نے برسوں پہلے سے چٹا رہ کھا تھا
 شاید اپنی بھری بھری جھانپوں کو بھڑکی کے منہ میں ڈالنے
 سے عجیب سی آسودگی بھی حاصل کی تھی۔ اب اُسے اتنا یاد
 کہا۔ اور نہ ہی بھڑکی کو یاد تھا۔ اور بھڑکی بات بات پر
 بوڑھی تھی۔ گھر کے کام کاج میں ماتہ نہ بٹاتی تھی بلکہ
 چھٹی چھٹی اندھیرے کوڑوں میں کوٹتی پھرتی تھی۔ کراہتی رہتی تھی
 اُس نے اُس نے اُس سے اکیلے گھر کا کام کاج بن نہ پڑتا تھا
 سبزی بھی اچھی طرح سے دھوئی نہ گئی تھی اور سبزی میں نہ ہر
 بھری کر ڈواہٹ بھی رہ گئی تھی۔ اور نہ ہر بھری کر ڈواہٹ
 بیٹے کے وجود میں سرایت کر گئی اور بیٹے نے ساری کر ڈواہٹ
 ماں کے منہ پر تھوک دی اور وہ جنم جنم کی بوڑھی بھڑکی.....
 بڑھیا کو اپنا گلا سہکتا سا محسوس ہوا۔ اُس نے گلے کو
 کھنکھا رہا۔ تھوک منہ میں الٹنے پلٹنے سے منہ گہلا رہ گیا۔ تھوک
 دے تو شاید رحمان کو بڑا لگے۔ اُس نے تھوک نکلائی۔ اُسے قنای
 سی آئی۔

کھنکھا رہن کر رحمان چمکنا ہو گیا۔ بڑھیا کے تیرہ اچھے نہ تھے
 بظاہر چہرے پر دکھ اور تکلیف کے آثار نہ تھے لیکن آنکھوں میں

بجلیاں سی کو نذرتی محسوس ہو چکی ہیں۔ بڑھیا کے وجود میں چھپی سرکشی کو محسوس کر کے اُسے ایک دفعہ اور ڈر سا لگا۔ لیکن بڑھیا کی آواز نے اُس کے سارے ڈر دور کر دیے۔

”کیوں.... آج کو فلا خریدیا کہ آدہ پار نہ گیا کیا۔“

بڑھیا کا لہجہ احتجاج کر رہا تھا اور نہ خان شرمندہ ہونے کے ساتھ ساتھ سراسیمہ ہونے لگا۔ اُسے یاد آیا کہ وہ صبح سے انتظار کر رہا ہے اور شاید انتظار نہ سہہ کر وہ بوکھلا گیا ہے کیونکہ آج وہ الیاد رائے لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جس کی ہر کروٹ میں بر باد ویا کے آثار چھپے تھے۔ یاد آتے ہی اس خطرناک کھیل کے کئی ڈرائے تھیلے اُس کی آنکھوں کے سامنے کوند گئے۔ بنگا ہیں اندھی سی ہڈ گئیں اور وہ بڑھیا کا سہارا لینے پر مجبور ہو گیا۔

”ماں آج کسی کو فرصت نہ ملی خریداروں کو آدہ پار نہ جانے کی ہم الیکشنی لڑنے والے ہیں۔ ٹھیکہ دار سالانہ سے نا۔ جو میری مزدوری ہڑپ کر گیا۔ گنجا کہیں کا۔ اُس کے بر غلاف ہم تھانڈ کھڑا کر رہے ہیں۔ آج یہیں فیصلہ کرنا ہے۔... آج....“

رحمان ترک سا گیا۔ بڑھیا اُسے ایک ٹک گھیر رہی تھی یوں کہیں دیکھ رہی ہو....“ اُس نے پوچھا۔

”نہیں تو.... نہیں تو....“ کہتے جاؤ.... کیا محاذ۔ بڑھیا سپساکر بولی۔ بظاہر وہ لفظ محاذ میں اُلجھ گئی، قبا کی محلے کے دنوں

میں یہ لفظ بڑا عام تھا۔ لیکن اتنے دن بعد رحمان کے منہ سے یہ لفظ سُن کر اُس کا ذہن رحمان کی معصومیت میں اُس سا گیا۔ کچھ دیر پہلے رحمان کے ہر لفظ میں ایک واضح چوٹ کا گمان ملتا تھا اور کچھ دیر بعد ہی رحمان ایک نئے بجے کی طرح اُس کے سامنے اپنا ذیل کھول رہا تھا۔ اب بھلا وہ بوڑھے تھے۔۔۔ کیا جانے یہ باتیں۔ وہ پریشان سی ہو گئی۔

رحمان بڑھیا کی پریشانی کو نظر انداز کر گیا۔ اُسے تو بہانہ چاہئے تھا۔ دل کا بوجھ کم کرنے کے لئے۔ دل پر کئی من بوجھ تھا۔ ذہن میں ہزاروں وسوسے تھے۔ ٹھیکہ دار کا کروہ چہرہ.... لوگوں کی فوج.... پولیس کا ساتھ اور وہ اکیلا ٹھیکہ دار کے سامنے کھڑا ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ حد تو یہ تھی کہ جن لوگوں کے بیچ رہتا تھا۔ وہ بھی اُس پر کبھی نہ کر رہے تھے۔ رحمان خوب جانتا تھا کہ گاؤں والے اُسے اپنا کبھی غیر سمجھتے ہیں اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ گاؤں کے لوگوں کا کوئی قصور نہیں۔ قصور اُس کا اپنا تھا۔ اُس کے چلنے پھرنے کے انداز۔ بات چیت کے ڈھنگ اور رہیں سہن پر ابھی شہر کی چھاپ تھی۔ وہ روزانہ کئی اہم باتوں کو شہری ٹکٹہ نگاہ سے پرکھ کر رہا تھا۔ جتنے گاؤں والوں کے مخصوص تلفظ پر مسکراہٹ کو روکنا بھی نہ سیکھ پایا تھا۔ قدرتی طور پر اُس کے سرکش خیالات نے گاؤں والوں کے یوں میں کئی شبہات نے جنم دیا تھا۔ رحمان بیزار تھا۔ بیزاری کی شدت نے اُسے بڑھیا کا سہارا لینے پر مجبور

کر دیا۔

”ماں..... آج ہم سب فیصلہ کر لیتے ہیں کہ اپنا دھوٹا
ٹھیکہ دار کو دیں کہ نہ وہیں..... ٹھیکہ دار نے ہر گھر کو ایک
پہنچائی ہے ماں.....“

”ہم سب کون..... یہاں تو صرف تم ہی مجھ سے بڑھیا ہے
اور دھواؤ دھو خالی کشتیوں کی طرف نظر دوڑائی اور رحمان نے
ایک ٹھنڈا سالن بھری۔ شکر تھا اللہ کا کہ بڑھیا کی
بے اعتبار نگاہیں اس کے بدن سے ہٹ گئیں۔ بڑھیا تھوڑی
دیر اور گھورتی تو شاید وہ ننھے بچے کی طرح رو پڑتا۔

”باقی سب لوگ فیصلہ کرنے گئے ہیں کہ میری بات مانیں
یا نہ مانیں۔ مجھ پر بالکل بھروسہ نہیں کرتے، رحمان کا تلخ
ہجو بڑھیا سے چھپا نہ رہا۔ لیجے کی تلخی بڑھیا کو مانوس سی
لگی۔ اس کی اپنی زندگی جو تلخ تھی۔

”نہیں..... نہیں.... وہ لوگ تمہاری بات ضرور مان
لیں گے۔ میں منداؤں کی۔ تم گھبراؤ نہیں۔ کہاں گئے ہیں فیصلہ
کرنے۔ بڑھیا نے اندھا دھند رحمان کی ڈھارس بندھا لی۔
وہ بیٹے کی ماں تھی نا آخر.....“

”کھلیاں میں گئے ہیں..... غیر ارادی طور پر رحمان نے
رات فاش کر دیا۔ لوگوں نے تاکید کر رکھی تھی کہ کوئی آن کا پتہ پوچھے
تو بالکل نہ بتائے۔

”تو میں بھی کھلیاں چلتی ہوں..... رحمان کی باچیں کھل گئیں وہ

بڑھیا کی طاقت کا مظاہرہ گھاٹ پر اپنی کشتی کا اضافہ کرتے وقت دیکھ
 چکا تھا۔ اس کو یقین تھا کہ طرفداری پر آما وہ سو گئی تو سارے گاؤں کو
 اس کی حمایت پر آما وہ کر سکتی ہے پھر بھی اس نے کہا ۔
 ” نہیں ماں جو فیصلہ کرنا ہو گا کر لیں گے تمہارا رے جانے
 کی ضرورت نہیں ۔“

” تم میری فکر نہ کرو بس بیٹھے رہو“ بڑھیا جاتے جاتے
 کہہ گئی ، رحمان بڑھیا کو گھاٹ پر چڑھتے دیکھنے لگا ۔ اور ول میں
 سوچنے لگا کہ اس کی ماں ہماری تو کیا وہ بھی ایسی ہی ہوتی“



دینا ناتھ نے پھیلے آدھ گھنٹے میں کی وقفہ گھڑی میں وقت دیکھا تھا۔ اس
 لئے ہر منٹ کا حساب تھا۔ جب وہ چھپتے چھپاتے کھلیان میں پہنچ گیا۔ تو سورج ڈوبنے
 کو تھا۔ اور کھلیان کے گرد گھرے پناروں کے پتوں میں گزرتی ترچھی زرد کرتیں
 سونے کی سلاخیں جیسی لگتی تھیں۔ سورج ڈوبنے کے ساتھ ساتھ بے ذرہ سلاخیں
 سُرخ مائل ہو گئیں۔ جیسے کسی کی سُرخ گوری باہیں پتوں میں لپٹی پڑی اُس کی طرف بڑھ رہی
 ہوں اور اُسے بے تماشہ سوما دتی کی گوری باہیں یاد آگئیں۔ اُس دن گزر گئے تھے
 سوما دتی کو نہر گئے ہوئے اور اُس کا ایک خط بھی نہ آیا تھا۔ کئی بار جی چاہا تو خط
 لکھنے کی پہل کرے۔ لیکن خط گھر کے پتے پر لکھنا ناممکن تھا۔ عجیب قانون تھے اس
 فرسودہ سماج کے۔ شادی ماں باپ کرتے تھے۔ دو لہا دہن کو ایک ہی کمرے میں
 بے پردہ کھولتے دیتے تھے۔ پر کمرے سے باہر اُن پر پہرہ بٹھا دیا جاتا تھا۔ شادی
 مقصد اولاد پیدا کرنے تک محدود کر دی جاتی تھی۔ نہ آپس پہنسنہ کھیلتا۔۔۔
 ۔۔۔ نہ گھومنا پھرتا۔۔۔ خاوند بیوی ایک دوسرے کا بدن جانتے ہوئے
 بھی ایک دوسرے کی شخصیت سے ناواقف رہتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُن
 کی زندگی بھر نہ بن پاتی نہ اُن کے چٹھے میں کسی کا بن پاتی ہے جیسے اُس کی اپنی

بیوی سوما دتی سے نہیں بنتی ہے جتنی دیر وہ سونا داری میں اکٹھے رہے۔ روز
جھگڑتے رہے۔

تلخ یادیں یاد آتے ہی اُس نے سرخ گوری باتوں کو ذہن میں سے ہٹاتا
چاہا۔ اس لئے اُس نے ایک بار اور گھڑی دیکھ لی۔ اسے عجیب سا لگا۔ سارے سماں
ماں باپ بیوی اور اپنی اتنی ساری زندگی کے متعلق سوچنے میں صرف ایک منٹ
گزر گیا تھا۔ صرف ایک منٹ۔۔۔۔۔

سورج ڈوب گیا تو اندھیرا چار کے پتوں کی آڑ سے نکل کر کھلیاں پر
دھاوا بولنے لگا۔ حتیٰ کہ اُس کے جسم پر نیلا سوٹ بھی کاٹے رنگ میں مدغم ہو گیا
گھڑی پر کھدے ہوئے ریڈیم کے حرف زندہ ہو گئے۔ ریڈیم کی نیلی روشنی
بڑی بھلی محسوس ہوئی۔ جیسے کسی کی نیلی آنکھیں ہوں۔ اور ایک بار پھر اُسے
سوما دتی کی یاد آئی۔ جو بہت پہلے دعا مانگا کرتی تھی کہ اُس کے سب بچوں کی
آنکھیں نیلی ہوں۔ نیلم کی طرح اور وہ خود بیوی کو چڑانے کی خاطر کہتا تھا۔
”یہ نہیں بل کی طرح“ سوما دتی روتھ جاتی اور وہ منائے پر مجبور ہو جاتا۔ سوما دتی
کے نرم گدار بدن میں گدگدی کرنے لگتا۔ سوما دتی کے نرم گدار بدن کو یاد کرتے
ہی اُسے اپنی تنہائی کا احساس ہوا اور وہ چنار کی جڑ سے گھاؤں کی طرف نگاہیں
پھیرنے پر مجبور ہو گیا۔

گھاؤں کے خدوخال دبیر اندھیری دھند میں ڈوب گئے تھے۔ صرف کہیں
کسی پکے مکان کی اینٹوں کا سرخ رنگ راکھ میں دبے انگاروں کی طرح عیاں
تھا۔ لیکن گھاؤں پر پھیلے تناور سفیدے کے درختوں کے تنے مٹیائے نیلے آسمان
کی چادر پر پوری آب و تاب سے بچھوٹے پڑے تھے۔ ایک ایک ٹہنی دکھائی دے
رہی تھی۔ جیسے کسی نے کائے قلم سے آسمان کے جادو پر کھدی ہوں۔ سفیدوں

کے تنوں سے ذرا اوپر کچھ ستارے بھی تانک جھانک کرنے لگے تھے۔ ٹپٹھاتے ستاروں کو دیکھ کر دینا ناتھ کی نگاہیں پھر گھڑی پر مرکوز ہو گئیں۔

گھڑی کے ہندسے ردمن زبان میں کھڑے تھے۔ جن سے وہ ابھی پوری طرح مانوس نہ تھا۔ اس نے سب اسمول اُسے وقت دیکھنے میں کچھ دیر لگی۔ ساڑھے آٹھ بجنے والے تھے۔ ہوا بند ہو چکی تھی۔ چنار کے پتے ساکن ہو گئے تھے۔ اب کوئی پرندہ بھی پر نہ پھڑپھڑا رہا تھا۔ اس عین خاموشی میں باتو اس کے دل کی دھمک دھمک رداں، مٹی یا صرف گھڑی کا ٹکڑا، فرق کرنا مشکل تھا۔ یکایک دینا ناتھ کے ذہن میں عجیب سا خیال گوند گیا۔ یہ گھڑی شاید ٹھیکہ دار نے اُس کو اس لئے بخش دی تھی کہ وہ ٹھیکہ دار کے حکم اور اپنی زندگی میں کوئی فرق نہ محسوس کرے۔

جوں جوں وہ اس سبکے پر غور کرتا گیا توں توں اُسے یقین ہو چلا کہ ٹھیکہ دار نے ضرور کسی خاص مطلب کی خاطر یہ گھڑی اُسے انعام میں دی۔ ورنہ ٹھیکے تو ہر ٹھیکہ دار کو ملتے ہیں۔ اور ہر ٹھیکہ دار ہر ٹھیکہ سے ڈھیر سارے روپے کماتا ہے۔ یہ ٹھیکہ تھا کہ اُس کے ٹھیکہ دار کا بندھن تیار ہو گیا تھا۔ واسے بنیادے ہو چکے تھے۔ ٹھیکہ دار کو ٹھیکے کی ایک ایک پائی مل گئی تھی۔ نئے ٹھیکے بھی مل گئے تھے۔ اس خوشی میں دعوت دی جاتی، منیافیتیں اڑائی جاتیں۔ نہ کہ اُسے سو روپے کی گھڑی دی جاتی۔ آخر اتنی ذرہ نوازی کس لئے۔۔۔۔۔ وہ رُک گیا۔ کھلیان کے اندھیرے میں سے کوئی سایہ اُس کی سوچوں پر چھا گیا۔ اُس کے منہ سے بے تحاشہ نکل گیا۔

”کون ہے۔۔۔۔۔“

”یہاں ہوں رحمان۔۔۔۔۔“ مختصر سے جواب نے اُس کے ڈر دو کر دیئے

اتنی گہری تھی کہ اپنے دل کی دھڑکن سے بھی خوف لگے۔ سارے کھلیان پر اندھیرے کا راج تھا، اور پناروں کے سارے بھوتوں کی طرح لگ رہے تھے۔ ویسے آج سارا گاوں جیسے بھوتوں کا مسکن تھا۔ کھلیان کے بچوں بیچ کائے کپڑوں میں ملبوس دینا ناتھ بھی شاید ایک بھوت تھا۔ ماضی کا بھوت۔۔۔۔۔ وہ بھوتوں کے آگے پیچھے کب تک گھومتا پھرے گا۔۔۔۔۔ کہاں تک گھومتا پھرے گا۔ انگ انگ میں تمکن محسوس ہو رہی تھی۔ اُسے اپنے آپ پر رحم سا آگیا اور وہ پتار کی جڑ پر بیٹھ گیا۔ "بھیر کیوں بلایا مجھے۔۔۔" آواز بھی تمکن سے لبریز تھی۔

کچھ ضروری باتیں کرتی ہیں۔۔۔۔۔ دینا ناتھ نے الفاظ ڈھونڈنے شروع کر دیئے۔ نونج گئے تھے۔ دیر ہو رہی تھی اور وہ ابھی الفاظ ڈھونڈ رہا تھا۔۔۔۔۔ ہوں؟

"کیسی ضروری باتیں۔۔۔۔۔" رحمان کی آواز سپاٹ تھی اور دینا ناتھ کو سٹھیس سی لگی۔ ایک وہ تھا جو رحمان کی خاطر اپنا آرام چھوڑ کے اور اپنی جان خطرے میں ڈال کر اس کھلیان کے ڈراؤنے اندھیرے میں سرگرداں تھا۔ اور ایک رحمان تھا جیسے کسی بات کی اہمیت کا کوئی اندازہ ہی نہ تھا۔ "ٹھیکہ دار کو ہنہ چلا ہے کہ تم اس کے برخلاف پروگنڈہ کر رہے ہو۔ لوگوں کو بھڑکا رہے ہو ٹھیکہ دار بہت ناراض ہے۔"

"ناراض ہونا ہے تو ہر کامے۔ میں اس سے ہنس ڈرتا" رحمان بھڑک گیا۔ کہاں تو سوچا تھا کہ بھیرے دوست پھر سے گلے ملیں گے۔ اور کہاں دینا ناتھ دُہی چرانا راگ دہرانے آیا ہے۔ جیسے ٹھیکہ دار ٹھیکہ دار نہ ہو بلکہ دینا ناتھ کا خدا ہو۔

۔۔۔ وہ دریا کرتا رہے کچھ نہیں ایک دوسرے کو کھاٹ کھانا۔۔۔۔۔ وہ سگریٹ
کے ٹکڑے کے لئے ایک دوسرے کو صلوایتیں مٹانا۔۔۔۔۔ وہ سینما کے ٹشو
پر ایک دوسرے سے روٹھ جانا اور آخر میں ٹھیکہ دار کے معاملے پر بے
تعلقی۔ ارتقا اٹھا، ان حرکتوں میں۔۔۔۔۔ نہ ہوتا۔۔۔۔۔ کھاٹ کھانا۔۔۔۔۔ صلوایتیں
مٹانا۔۔۔۔۔ روٹھنا اور آخر میں بے تعلقی۔۔۔۔۔ لیکن آج وہ دونوں ایک بار
پھر ان ساری منسروں کو پھاند کر پہلی منزل پر پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایک
دوسرے کو نوچنے پر آمادہ تھے بچپن کی حدود میں داخل ہونے کی کوشش کر
رہے تھے۔ دینا ناتھ کو اپنا آپ بھوٹا ہوتا ہوا سا محسوس ہوا۔ اس کا بدن
ڈھیل چڑ گیا۔ اور وہ دھیرے سے چنار کی جڑ پر پھر بیٹھ گیا۔

دینا ناتھ بیٹھ گیا تو رحمان پر ندامت کی بو چھا رہی تھی۔ اپنا آپ قابو میں
رکھتا تو اس کی وقعت کم نہ ہوتی۔ سوچا جائے تو دینا ناتھ کا کہنا درست ہے۔
ٹھیکہ دار کے پاس روپیہ ہے۔ آدمی ہیں اور سونہ داری کے آفیسروں کی
طاقت ہے۔ ٹھیکہ دار چاہے تو اسے کیڑے کی طرح مسل سکتا ہے۔ لگاؤں
کے لوگ تو مارے طر کے ٹھیکہ دار کا نام زیر لب لیتے ہیں۔ عین وقت پر ساتھ
چھوڑ گئے تو اکیلا مارا جائیگا۔ ان گادوں کے لوگوں پر بھروسہ نہیں۔۔۔۔۔ ناجائز
اپنے آپ کو خراب کرنے سے فائدہ۔ اسے اپنا آپ لٹھیتا سا محسوس ہوا یا شاید
بیماری کا اثر بدن پر ابھی باقی تھا۔ وہ بھی چنار پر بیٹھ گیا۔ دونوں دوست اپنی
سائنوں کو سمجھانے لگے۔ جیسے کسی معرکے سے پٹ کے نکل آئے ہوں۔

دینا ناتھ نے کہنا شروع کیا

"میں زیادہ دیر نہیں کھڑا رہتا اس لئے صاف صاف کہہ رہا ہوں آج
ٹھیکہ دار نے فیصلہ کیا کہ تم اس کے خلاف لوگوں کو بھڑکانا نہ چھوڑو گے تو وہ

تم کو پورا دے گا۔ کیا معلوم ہا بھی دے۔ کھاؤں کے سبب غنڈے چور اچکے
 اس کے تنخواہ دار ملازم ہیں، اب تم جانو اور تمہارا کام۔۔۔۔۔۔ لیکن
 دوست ہونے کے ناطے تمہیں آگاہ کرنا میرا فرض تھا۔ ٹھیکہ دار کو پتہ
 چل گیا کہ میں چوری چھپے تم سے ملنے آیا تھا۔ تو میری بھی خیریت نہیں ہے۔
 دینا نامتھ کے ایشارے رحمان کے ذہن کی بہت ساری حدیں (تھا)
 دیو نہ داری کی زمین پر اُسے کسی نے اپنا نہ سمجھا۔ نہ بچھولی تے۔۔۔۔۔ نہ
 بڑھیا۔ اور نہ ہی گاؤں والوں نے سب اس کے جذبات سے کھیلتے
 رہے۔ لیکن آج بہت دنوں بعد اُس کو کھویا ہوا سہارا ملا تھا۔ بہت دنوں
 بعد کوئی اس سے ہمدردی جنلا رہا تھا۔ اس کے دکھ سکھ کی پرواہ کر رہا
 تھا۔ اس کی پرواہ کر رہا تھا۔ ڈوبتے کو سہارا چاہیے۔ گھاس کا تنکا ہی سہی
 وہ نکلے پر چھٹا۔

دینا نامتھ۔ میں بہت مشکل میں ہوں۔ میری مدد کرو۔ نہیں تو میں
 تباہ ہو جاؤں گا۔ میرا دماغ کام نہیں کرتا۔
 بھائیوں۔۔۔۔۔ کیا ہوا۔ کیا بات ہے، دینا نامتھ گھبرا گیا۔ رحمان
 ایک ہی جیت میں پہاڑ کی چوٹی سے گر کر نہتہ تک آ گیا تھا۔
 ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن مجھے کہیں سے سو ایک روپے مل
 جانے چاہئیں۔ نہ نہیں گے تو میں تباہ ہو جاؤں گا۔
 روپے کا نام سن کر دینا نامتھ کو بڑی مایوسی ہوئی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔
 اور رحمان کو جانچنے لگا۔ شاید یہ وہ رحمان نہ تھا جس کے ساتھ اس نے
 بچپن گزارا تھا۔ بلکہ سو نہ داری کا رحمان تھا۔ جس کے ذہن پر سونا مسلط
 ہو گیا تھا۔ جس کی رگوں میں سونہ داری کا نہ ہر سرا بیت کر گیا تھا۔ رحمان

کہتا تھا کہ اُس کام

مکا اور رحمان کا کوئی میں نہیں۔ دونوں کے راستے الگ ہیں لیکن شاید رحمان
سیدھے راستے پر نہیں جا رہا ہے عجیب حالت تھی رحمان کی۔ گھڑی میں تو لگھڑکی
میں ماشہ۔ کبھی بھر کتا اور دوسرے لئے بھٹنڈا پڑ جاتا۔ شاید بیمار یا نے اُس
کا ذہن بھی ناکارہ کر دیا ہے۔ بے چارے کو سونہ واری کی ہوا اور اس نے
آئی۔ جب کبھی وہ شہر جا بیگا۔ تو میں چاہا سے رحمان کا تذکرہ ضرور کر لیگا
سکاؤں بھر میں کئی افواہیں پھیل رہی تھیں۔ دوستی کے ناطے کچھ افواہیں،
اُس سے بھی مستحب ہونے کا احتمال تھا۔ جیسے دوستی نہ ہوئی کوئی گناہ ہوا
کاش۔۔۔۔۔ اُس نے بلد کاک کا کہا مان لیا ہوتا۔ اور رحمان کو اپنے ساتھ
یہاں نہ لے آتا۔ رحمان کے شہر واپس جاتے ہیں اُس کی اور اُس کی عاقبت
ہوگی۔ وہ ضرور بڑا چاچا کو رحمان کو واپس شہر لے جاتے پر آمادہ کرے گا۔
جائے جسے وہ اسی کام کے لئے شہر جانا پڑے۔

دینا نا نقصانے آخری بار گھڑی دیکھ لی۔ رحمان کو گئے ہوئے کافی
دیر ہو گئی تھی۔ رحمان اب تک گاؤں پہنچ گیا ہو گا۔ اب کسی کے دیکھنے کا ڈر نہ
تھا۔ اس لئے مزید رکتا بے فائدہ تھا۔ اُس نے دونوں ہاتھ جیب میں
گھونس دے اور دھیرے دھیرے اپنی راہ پر ہولیا۔

بڑھاپا درد اُسے کی چوکھٹ پر مظاہر آؤنگے رہی تھی لیکن اُس کے
 کان ذرا سی آہٹ پر چوکنے ہو جاتے۔ ہر آہٹ بدن میں خوف کی جھجک
 رواں کرتی۔ لمحے بھر کے لئے اُس کی اونگھتی ٹھکانیں ارد گرد پھیلے اناجیر
 سے لڑنے لگتی۔ سارا وجود سراپا انتظار بن جاتا۔ ہر آہٹ کے گم ہوتے
 ہی اُس کی زندگی بھی موت سے ہمکنار ہونے لگتی۔ پھر چڑاتی آنکھوں پر
 رات ایک بار اور چھا جاتی اور ذہن دم توڑتا سُوس ہوتا۔

یہ راستہ ہی کچھ ایسی تھی جب زندگی موت کے قریب سُوس ہوتی ہے شاید
 تار یکساں آسمان پر ستارے ٹمٹما رہے ہوں گے لیکن اُس کی آنکھوں میں ابائی ہو
 نہ تھی کہ ستارے دیکھ پاتیں۔ چاند بھی کہیں ڈوب گیا تھا ان دنوں شاید اُس
 کی اپنی قسمت کے اماوس میں ڈوب کے رہ گیا ہے، جی چاہ رہا تھا اُٹھ کے
 آگ لگا دے دُنیا کو۔ کچھ تو روشنی پیدا ہو جاتی۔ اب باقی رہا کیا تھا اس بے
 درد دُنیا میں۔ ایسی زندگی سے موت بہتر کوئی بندھن باقی نہ رہ گیا تھا اب
 سب بندھن ٹوٹ گئے تھے شاید یقین کرنے کے لئے اُس نے ذہن پر زور دیا،
 اور اپنی ساری زندگی کو ٹوٹنا شروع کیا۔ اُسے کو ٹی بندھن نہ ملا جس کے

”کہاں تھا ڈاکٹر۔۔۔۔۔“ بڑھیا نے عجیب سا لہجے میں نرمی پیدا کی۔
 یہی تو ایک داؤ تھا جس کی بدولت وہ رحمان کے لیے چوڑے جسم پر قابو پالیتی
 تھی، ورنہ بس چلتا تو سب کو کاٹی بھرتی۔۔۔۔۔ گتیا جو سٹھہری،
 ڈاکٹر کہیں گیا ہوا تھا، کمپونڈر ملا، وہ نہیں مانتا، کہتے کہتے رحمان
 کے لہجے میں مسرت چمک اُٹھی۔

”کیوں نہیں مانا کمپونڈر۔۔۔۔۔“ بڑھیا بے تاب ہو گئی۔
 رحمان نے کلا کھنکھار کر صاف کر دیا تاکہ ہر لفظ کی چوٹ واضح

ہو جائے۔

”کمپونڈر کہتا تھا، ایسا کرنا قانون کے خلاف ہے، خون کرنے
 کے برابر ہے۔“ وہ رک گیا۔ بڑھیا ہر لفظ پر مسکراتی جا رہی تھی جیسے
 رحمان کے منہ سے الفاظ نہ نکل رہے تھے بلکہ نشتر نکل رہے تھے۔
 ناامیدی کے نشتر۔۔۔۔۔ بڑھیا کو دکھی ہوتے دیکھ کر رحمان کے
 انگ انگ میں وحشت مچل اُٹھی۔ شاید سچوئی بھی سیڑھیوں کے اندھ جھک
 میں ناامیدی کے نشتر سہہ رہی ہوگی۔ اُسے چاہئے۔ آہستہ آہستہ
 انہماک کے نشتر ان لوگوں کے وجود میں اتارنا چلا جائے۔ تاکہ درد
 اور تکلیف ان کو ادھوا کر دے۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ اُسے بڑی
 تیزی سے چلا چلا کے چھینا چاہئے۔ تاکہ سارا مکان سُٹ لے۔ سارا کھاد
 سُٹ لے۔ ساری دُنیا سُٹ لے اور یہ گھر نہہ و بالا ہو جائے۔ اس گھر کے
 مکینوں کے پرچے اُڑ جائیں۔ اُس کی اپنی سونج کے پرچے اُڑا دیئے
 تھے اس گھر کے مکینوں نے۔۔۔۔۔!

”اب کیا ہو گا۔۔۔۔۔ اب کیا ہو گا۔“ بڑھیا کی سرسکیاں سُٹ

کر رحمان کو ہنسی آئی۔ ڈانس سمجھتی ہوگی کہ کچھ آسودہ کچھ کر دے پیسہ جائے گا۔ بالکل غلط خیال تھا بڑھیا کا۔ اب وہ مٹی کا مادھو نہیں بلکہ ٹھوکر بن کھا کر پیٹھ پر بن گیا ہے۔۔۔۔۔ پتھر۔۔۔۔۔

اب کچھ نہیں ہو سکتا۔۔۔۔۔ مگر رحمان نے اپنی آواز میں پتھر جتنی سختی پیدا کی، "کیونڈر کتنا تھا ڈیڑھ سو روپے لگیں گے ڈاکٹر کو آمادہ کرنے پر۔۔۔۔۔ ہا ہا ہا۔۔۔۔۔ ڈیڑھ سو روپے ہیں ڈاکٹر بھی ایسا کام کریں گا جو بغیر روپے کے خون کرنے کے برابر ہے۔ سمجھی تھیں۔۔۔۔۔ خون کرتا ہو گا۔۔۔۔۔ خون۔۔۔۔۔" رحمان مزا لینے کے لئے رک گیا۔ بڑھیا کا سر ایک ایک لفظ کے بوجھ تلے ٹوٹتا جا رہا تھا۔ جیسے الفاظ نہ گرا رہے تھے۔ پتھر گر رہے تھے۔

ڈیڑھ سو روپے ہیں تو دے دو۔ سب کام ہو سکتے ہیں روپے سے دنیا کے سب کام ہو سکتے ہیں۔ اور کیوں نہیں۔۔۔۔۔ جب کچھ کچھ کھوں گے عوض چھوٹی نے عبدالسلام کے ساتھ بیٹکیں بڑھائیں، اُس کے پاس سو گئی۔ تو ڈیڑھ سو روپے ہیں ایک جان کو ختم کرنا ہڈیاں نہیں۔۔۔۔۔ ملے نا عبدالسلام کہیں تو اُس کی ٹانگیں پیر کے رکھ دوں۔ سارا۔۔۔۔۔ ترا مزاد۔۔۔۔۔ کہتے۔۔۔۔۔ گنتا۔۔۔۔۔

غصے کے مارے اُس سے پولا نہ گیا۔ جی چاہ رہا تھا اپنے بال نوچ دے اپنا گلا کاٹ لے۔۔۔۔۔ لعنت تھی اُس پر۔ اُس کی مردانگی پر۔۔۔۔۔ پھولی مالزادی عبدالسلام کے پاس سو جاتی تھی۔ لیکن اُس کے سامنے بڑی پار سابتی پھرتی تھی۔ پاک دامن۔۔۔۔۔ گنتا۔۔۔۔۔ نامرو سمجھ رکھا تھا اُسے۔ اب دونوں ماں بیٹیاں جہاں عبدالسلام کے پاس تھیں مزادہاں

الذادیاں پڑھ لیں۔۔۔۔۔

”میں رو پئے تو دے دو نہیں تو جاؤ عبد السلام کے پاس۔ اُس کا
بستر گرم کرو۔ میرے پاس اب رکھا گیا ہے۔ تم لوگوں کی خاطر میں اپنے ماں
باپ سے لاپرواہ ہوا۔ اپنے دوستوں کو چھوڑ بیٹھا۔ سبائی بندوں سے
کنارہ کر لیا۔ اب کیا باقی ہے میرے پاس۔۔۔۔۔ بولو۔۔۔۔۔ جواب
دو۔۔۔۔۔ میرے پاس کچھ نہیں۔ اب جاؤ عبد السلام کے پاس۔۔۔
میرے پاس اب کچھ نہیں۔۔۔۔۔ کچھ نہیں۔۔۔“

آخری الفاظ سچ اُٹھے۔ کمرے میں بھٹو سچاں سا اُگیا۔ بڑھیا منڈیر
بیم سے اٹھی اور اُس کے ساتھ اپڑی۔ اُس کے پیروں سے پیٹ گئی۔ بڑھیا
کی آنکھوں سے آنسو اُمد رہے تھے۔ ایل ایل کر بھڑپوں سے بھر پور چہرے
پر نفی نفی نئیوں طرح بہہ رہے تھے۔ بہہ بہہ کر ٹھوڑی کو تر کر رہے تھے۔
پو پلا منہ ندامت سے مخمخ قرار ہا تھا۔

”رحم کرو۔۔۔۔۔ رحم کرو ہم پر۔ عبد السلام کا نام نہ لو اس گھر میں
اس گھر کی بچی کا خون کر دیا اُس نے۔ اُس کی آنکھیں نکل آئیں۔ اُس کے
بال بچے سڑ جائیں۔ بے خدا جیسا حال میری بچی کا کر دیا ویسا ہی اُس کی
بیٹیوں اور پوتیوں کا ہو۔ بہنوں کا ہو۔۔۔۔۔“

بڑھیا کے لمس سے رحمان شکر سا گیا۔ اُس نے اپنے پاؤں
کیفین لئے۔ بے قابو ہونے سے کوئی فائدہ نہ تھا۔ اپنا دُکھ درد کم تھا۔ جو بے
قابو ہو کر اور دُکھ درد کو دعوت دے رہا ہے۔ پھوٹی کی حالت، بڑھیا کی
پینچ و پکار، دینا نا حق کی سرد مہری اور ٹھیکہ دار کا ڈر کافی تھے۔ ہر اسان
کستے کے لئے۔ اُسے چاہیے روز کی طرح چپ سا دھولے۔ اور صبح منہ اندھیر

اپنا بستر پوریا باندھ کر اس گھر سے نکل جائے۔ کسی طور اس جہنم سے ٹھیکارا پائے۔

رحمان کو چپ ہوتے دیکھ کر بڑھیا کی اس کچھ بندھ گئی۔ اُس نے پیپر چھوڑے اور سامنے بیٹھ کر سسکیاں پینے لگی۔
بیٹا اب تمہا سے بغیر میرا کون ہے اس دُنیا میں جو مجھے اس آفت سے نجات دلا سکتا ہے۔“

میں نے کہا نا میرے پاس کوئی روپیہ نہیں۔ تم تو خود جانتی ہو۔۔۔۔۔
رحمان نے دھیرے سے کہا۔ سمجھ کر کتنا سمجھ کر کتنا قبول تھا۔
کہیں سے کچھ کر دو بیٹا۔ ورنہ میری بیٹی مرجائے گی۔ اب مجھ سے اس کی تکلیف نہیں دیکھی جاتی کچھ تو کرو۔“ بڑھیا گھگھکیائی۔
بیٹی اتنی پیاری ہے تو مکان بیچ دو نا۔ ڈھیروں روپے مل جائیں گے۔“

بڑھیا کو ٹھیک سا لگا۔ مکان بیچ دے گا کیا۔ وہ مکان۔۔۔ جس کو اُس کے خاوند نے اٹھائیس سال کی جان توڑ محنت سے کھڑا کیا تھا۔ جس کی ایک ایک اینٹ اُس کے خاوند نے اپنے ہاتھوں سے چُن دی تھی۔ اس مکان کی دیواروں میں گارے مٹی کے بدلے اُس کے خاوند کا خون پیسہ تھا۔ اپنے مریوم خاوند کو بیچ دے گا کیا؟ اُس نے اب تک کئی بار ادھار لیا۔ ادھار نہ ملا تو فاقے کئے۔ تب بھی اُس نے مکان کے متعلق ایسا نہ سوچا۔ آج یہ چھوکر اُس کی غیرت کو لدا کر رہا تھا۔ لمحہ بھر کے لئے نفرت کی بجلی سی اُس کے وجود میں کوند گئی پر دوسرے لمحے ماسٹا کے اربھقاہ ساگر میں بچھ بھی گئی۔ پھولی کی جان بیچ جائے۔ تو مکان جائے جہنم میں۔ ماضی کے

تھار اور پھولی کی حالت خراب تھی، جمل گرانے کے لئے نہ معلوم کیا انتہا شغف
 کھا گئی تھی کہ سارا جسم پھول گیا تھا۔ دیر ہو گئی تو بچنے نہ پائے گی۔ وہ
 کیا کرے، کدھر جائے۔ بڑھیا کی خدمت گاری کا تقاضا تھا کہ قرضہ
 بے باک ہو جائے۔ بڑھیا نے اُس کی جان بچائی تھی، اُس کی بیٹی کی جان
 بچانی چاہیے۔ ناؤ بیچ دے تو چالیس پچاس روپے کا بندوبست ہو سکتا
 ہے اور کمپونڈ کرنے دھڑھ سو روپے کی شرط رکھ لیا تھی۔ اور چونکہ ناؤ
 بیچ دے تو پھر کرے کیا..... ناؤ بیچنی اپنی زندگی بیچنی ہوئی۔ ناؤ
 کے کھر دے کھٹوں پر ہانچی وجود میں آتا ہے، ناؤ کے سہارے زندگی
 کا رشتہ حاصل کرتا ہے۔ اور آخر میں ناؤ کی گود ہی میں اُمدادی بند سوجاتا
 ہے۔ اُس کی ہر غلطی معاف ہو سکتی ہے لیکن ناؤ بیچنے کی غلطی تا ابد
 معاف نہ ہو سکے گی۔ بہنیں..... وہ ناؤ نہیں بیچ سکتا ہے پھر
 اپنا آپ بیچ دے۔ اُس نے فیصلہ کر لیا۔

وہ دیکھو ٹانگیں پکڑنے سے کچھ نہیں ہو سکا۔ میں یہاں سے کل ضرور
 نکل جاؤں گا۔ تمہیں جو کچھ کرنا ہے کر لو۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔“

آخری فیصلہ ہے۔۔۔۔۔“ بڑھیا اتنی تیزی سے کھڑی ہو گئی جیسے
 اُس کے بدن میں کرم فودہ ہڈیاں نہ تھیں بلکہ کمانیاں تھیں۔

یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے کیا۔۔۔۔۔“ بڑھیا نے دُہرایا۔ ایسے
 میں عجیب سی دُور شتی تھی، رحمان کے بال کھڑے ہوتے لگے۔

تم میں اگر ہمت ہے تو نکلی کے دیکھو۔ میں بھی دیکھتی ہوں۔
 گاؤں والے تمہیں زندہ کیسے جلتے دیتے ہیں۔“

”کیا بگاڑیں گے گاؤں والے میرا“ رحمان نے بظاہر ہمدردی

”کھائی لیکن دل میٹھا جا رہا تھا۔“ میں نے کیا بگاڑا ہے گاؤں والوں کا “
 ”گاؤں کا نہ بگاڑا ہو لیکن چھولی کا تو بگاڑا ہے اور چھولی سارے گاؤں
 کی بیٹی ہے۔“ بڑھیا ہاتھ نیچا کر بولی۔

”کیا مطلب۔۔۔۔۔۔“ رحمان کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ دل میں
 سوہوم خوف اسٹھر رہا تھا۔

”چھولی کے پیٹ میں تمہارا بچہ ہے سمجھے۔۔۔۔۔۔ تمہارا بچہ۔“ اور رحمان
 کو ایسا لگا جیسے سوہوم خوف نے مجسم صورت بن کر اس کے سارے وجود کو اٹھا
 کر زمین پر پینچ دیا ہو۔ وہ بوکھلا گیا۔ ”یہ بچہ خدا السلام کا ہے۔“ چھولی نے تم سے
 خود اقرار کیا ہے۔“

”لیکن میں گاؤں والوں سے کہہ دوں گی یہ بچہ تمہارا ہے۔“ بڑھیا نے
 دار کیا۔

”تو سیٹھیا گئی ہے گاؤں والے تمہاری بات کا اعتبار نہیں کریں گے
 وہ مجھے اچھی طرح سے جانتے ہیں۔“ رحمان ہراسان ہونے لگا۔
 ”کیوں اعتبار نہیں کریں گے؟۔“ تم اتنے جینے اس مکان میں رہے۔ چھولی
 کا ساتھ چوبیس پہر کا تھا۔ تم جوان ہو۔ شہر سے آئے ہو۔ چھولی گاؤں کی چھولی
 بھالی لڑکی ہے۔ دیکھ گئی ہو گی تمہاری باتوں پر۔ کون ہے جو اعتبار نہیں کرے گا؟“
 رحمان کے ذہن میں کھلبلی مچ گئی۔ بڑھیا کی بات معقول تھی۔ کہہ دیا بڑھیا
 نے گاؤں والوں سے تو اس کی کوئی نہیں سن لے گا۔ جان کے لائے پڑ جائیں گے
 اور بونچ نکلے۔ تو شہر بات پہنچ جائے گی۔ باپ بھی یقین نہ کرے گا۔۔۔ پھر
 تھکڑی ہوگی۔ مخانا ہوگا۔ جیل ہوگا۔ بڑھیا سرائی تھی۔ مالزادی تھی۔ ڈان
 تھی۔ اس کا بس چلے تو گلا گھونٹ دے اس ڈان کا۔ دیکھو تو۔۔۔۔۔۔ ہنس نہیں

میل سر پٹا جبار ہے ۔۔۔۔۔

اُس کا سر گھٹنوں کے بیچ لٹھک گیا ہونٹوں کی بھر بھر اٹھ جباری
 رہی۔ بدن بھی جھکوں سے ہل رہا تھا شاید رو رہا تھا بڑھیا کے دل پر
 بڑھیاں سی چلیں۔ جی پابا۔ جا کے رحمان کو گود میں اٹھائے۔ اُسے اپنے سونے
 سینے سے پٹا رکھے۔ اُس کے انگ انگ کو چومے۔ دلوں بعد اسے بیٹا مل گیا تھا
 لیکن وہ بڑے بڑے سکی کبھی کبھی لاڈلوں کو بھی بے سہارا چھوڑتا بہتر ہوتا
 ہے !

بڑھیا نے آنسو پونچھ لئے اور رسوی کی طرف چل دی۔ کھانا شاید بالکل
 ٹھنڈا ہو گیا تھا۔

دردانہ بند تھا، کھڑکیاں بند تھیں، کھڑکیوں کی درندوں پر کھڑا
 پھیلا یا گیا تھا، کمرے پر گہری تاریکی مسلط تھی، پھولی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر
 تاریکی میں گھور رہی تھی، کروٹیں بدل بدل کے اُس کا جی ہلکان ہو گیا تھا، بارش
 کی سہ سہاہٹ نہ ہوتی تو اُس کی "ہائے... ہائے" تاریک چادر کو چیر
 کر، سیڑھیاں بھانڈ کر نیچے پہنچ جاتی اور بُز عیا چوہے کو جلتا چھوڑ کر اُس
 کو جلانے کے لئے اُدھر آ جاتی۔ اُس کے بدن کو ٹٹولتی، اُس کے درد کو
 کُریڈتی اور آخر میں ایک دد گالیاں بک کر اُسے پھر تاریکی میں اکیلا چھوڑ
 کر واپس چلی جاتی۔

روز تو یہی ہوتا تھا، روز اندھیرا اُس کے پیٹ پر، ہلکی سی کسک کو
 جہنم دیتا، کسک بڑھتے بڑھتے درد کی لہر میں تبدیل ہو جاتی، لہر بڑھتے بڑھتے
 درد کا دریا بن جاتی، جسم کے انگ انگ سے درد رستے لگتا، وہ تڑپ اٹھتی
 تو حرکت سے درد کے کئی سیلاب جہنم لیتے جیسے اُس کے جسم کے ہر مسام میں
 درد کا سوتا اُگھیر رہا ہو، جی کہ اُس کا اپنا سارا وجود ایک گہرا درد بن جاتا تھا
 درد اُس کے حلق سے چیخ بن بن کر نکلتا، چیخ تو کمرے کے اندھیرے میں گم ہو

کونے سے وہ پیالے کو صاف کرنے لگی۔ یکایک وہ رُک گئی۔ بھلا پیالہ صاف کرنے سے فائدہ۔ دودھ پھینکنا ہی تو تھا۔

پھرن کے گریبان سے چھاتیاں نکالتے ہوئے اُسے یہ انتہادر محسوس ہوا۔ چھاتیاں پتھر کی طرح سخت ہو گئی تھیں۔ دونوں چھاتیاں اکٹھی گریبان سے باہر آنی ناممکن تھیں ایک چھاتی نکال کر اُس نے ٹوٹ کر پیالے کا رخ سیدھا کر دیا۔ اور ہولے ہولے چھاتی دبانے لگی۔ درد کی شدت سے وہ بے حال ہو گئی۔ شاید درد کا دوسرا نام غورت تھا۔

پیالہ بھر گیا تو اُسے کچھ آرام آ گیا۔ درد دودھ بن بن کر بہہ گیا۔ اُس نے چھاتی کو پھرن کے اندر کر لیا اور کان لگا کر آوازیں پر کھینے لگی۔ بارش کی سرسراہٹ ادبھی ہو گئی تھی۔ مکان کے کسی کونے سے ٹپ ٹپ کی داغ آواز آرہی تھی۔ اُسے اطمینان ہوا۔ احتیاط سے پھرن کے گریبان سے دوسری چھاتی نکال کر وہ ہولے ہولے دبانے لگی۔

یکایک اُس کے ہاتھ رُک گئے۔ سیڑھیوں پر کھٹ کھٹ کی مدھم آواز آرہی تھی۔ رکوئی آسم تھا یا شاید مکان کی کڑیاں سردی کی وجہ سے سکڑ رہی تھیں۔ اُس نے دروازے کی سمت بغور دیکھا۔ دروازے کی روشن دال پھینے لگی۔ اُس کے ہاتھ بے تنہا شا پیالے کو چھپانے کے لئے بڑھے۔ جلدی میں پیالہ اُلٹ گیا۔ اور سارا دودھ لحاف میں جذب ہو گیا۔ پیالے کو ایک طرف ٹپک کر اُس نے لحاف کچھ کر چھاتی کو چھپا لیا اور تنگے پر گر گئی۔ اس گھر میں اُس کی جان پر مصیبت بن آئی تھیں۔ ایک پلا چین بینے لینے دیتے تھے یہ لوگ۔ اب ساری رات دودھ سے بھٹی لحاف کے نیچے کھٹکھٹا تھا۔

آواز سن کر بڑھیا کے دل پر بر بھی سی چلی۔ اُس کی بیٹی زندہ
 دروڑ ہو رہی تھی، پر تری دکھانا اُس سے منظور نہ تھا، مرنے کی وجہ
 سے ہی تغیر بردار نہ دیکھنا نصیب ہوا، سخی برت لی ہوتی تو شاید بچے یوں ہاتھ
 سے نہ نکل جاتی، اب ہر بار نانا جائز طریقے سے پھولی کو قابو میں رکھتا ہوا۔
 چاہے ایسا کرتے کرتے اُسکی بوڑھی ہڈیاں چور چور کیوں نہ ہو جائیں۔ خون
 پسینہ بہا کے بڑھاپے نے جو دنیا آباد کرنا چاہی وہ جوانی کی ایک جہتی نے
 ڈھاکے رکھ دی تھی اور اُس بڑھیا کو اسیدوں اور امانوں کے کھنڈروں
 پر بہن کرنے کے لئے زندہ رہنے دیا۔

بڑی پاکیزہ بنی پھرتی ہے۔۔۔۔۔ ہوں۔۔۔۔۔ پانی چاہئے۔۔۔۔۔
 بڑ بڑاتے ہوئے واپس لوٹ گئی۔

آہٹ مرنے ہی پھولی نے منہ سے طاف مٹا دیا، چھاتی کو گرہ باندھ کے
 اندر سنبھال لیا۔ اور آسنو پونچھ ڈالے۔ اٹھ کر بیٹھنے سے جسم میں درد
 کی ان گنت لہروں نے پھر سے جنم لیا، اور اُس کا سارا جسم درد کی لہروں
 پر ڈھونے لگا۔

ایک بار اور آہٹ ہوئی اور وہ پھینکا گئی، جب گیت ڈھونڈا
 پر آہٹ ہوتی تھی تو اسے جو گستاہو کر بیٹھتا پڑتا تھا جیسے اُس
 کو کوئی دکھ نہ تھا، کوئی درد نہ تھا، جیسے کسی ڈاکٹر کی چھریاں اور زار
 اُس کے بدن پر نہ آزمائے گئے تھے۔ نہ ہی کسی کپوندے کے کھوڑے ہاتھوں
 نے اُس کے جسم کو آٹ پلٹ کے رکھ دیا تھا، کمپونڈر کے کھوڑے
 رحم ہاتھ عبدالسلام کے کھوڑے رحم ہاتھوں سے زیادہ کھوڑے اور
 بے رحم ثابت ہوئے تھے۔ یاد آتے ہی اُس کا ذہن ڈالو ڈالو موند لگا۔

روتے دیکھ لیا تھا، تب بھی نہیں جب وہ بڑھیا اور پھولی کو ساتھ
 لے کر ڈاکٹر کی رازدار خاموشی کی جانتا تھا۔ جہاں ڈاکٹر اور کپوڑ
 سرکنڈوں کے گھنٹے بھنڈ میں چھریاں اور اس کے انتظار کر رہے تھے
 پھولی اُس دن ایک ایسی بھیڑ کی طرح چھپتی ہو جاتا ہو کہ ذبح خانے کے
 علاوہ اُس کی اور کوئی منزل ناممکن ہے۔ اور تب بھی اُس نے پھولی کو
 نہ روتے دیکھا تھا جب ڈاکٹر نے پھولی کے پھوٹے جسم میں بے دردی
 سے نشتر تارے تھے۔ دیکھ بھی کیسے لیتا۔ وہ پھولا سے دُور۔۔۔۔۔
 بہت دُور روکر کے کنا سے سرکنڈوں کے سلے میں ایسے ڈبکا رہا
 جیسے زندگی کو پیدا ہونے سے پہلے مرتا نہ سہہ سکے۔ بقول میں اُس نے کئی
 بار پھولی کے چہرے کو اُکھارنے کی کوشش کی لیکن ہر اسان ذہن خدو
 خال واضح نہ کہہ پایا تھا۔

ایسے سوچا جائے تو اُس نے پھولی کو کئی بار روتے دیکھ لیا تھا۔
 جب کبھی بڑھیا پھولی سے لڑ پڑتی تو ماں بیٹی کے لڑنے کی تان رونے پر آکر
 ٹوٹ جاتی تھی۔ اور پھولی ہر بار سرکھٹنوں میں چھپا کے روتی تھی۔ دیکھ
 دیکھ۔۔۔۔۔ ہلکے ہلکے۔۔۔۔۔ سسکیوں میں لپٹ لپٹ کر۔۔۔۔۔
 شرم کا آئینہ تانے پھولی اُس کے سامنے کئی بار روئی تھی۔ اور
 اُس نے کبھی پھولی کا سر اُٹھا کر رونے کا سبب نہ پوچھا تھا۔ عورت
 کو روتا دیکھ کر وہ بے بس سا ہو جاتا تھا۔

لیکن آج پھولی منہ چھپاے بغیر رو رہی تھی۔ بے شرم ہو کر رو
 رہی تھی۔ اُسے دیکھا دیکھا کر رو رہی تھی۔ آج نہ سر اُٹھانے کی ضرورت
 تھی اور نہ سبب پوچھنے کی ضرورت۔ وہ تو روئے جا رہی تھی۔

بہا رہی ہے تو نہ معلوم کیا ہو۔۔۔۔۔

”میں پانی کا ایک اور نکاس لادوں گا۔“ اُس نے آنسوؤں کو پانی کے
قطروں میں تبدیل کرنا چاہا لیکن پھولی ماتی بھی۔ وہ تو آج اُسے آنسوؤں
میں ڈبوئے پر چل گئی تھی شاید۔

”مجھے پانی بہن چاہیے۔ نہ ہر چاہیے نہ ہر۔۔۔۔۔ مجھے نہ ہر لادو تا کہ
اس مصیبت سے چھٹکارا مل جائے“ شدتِ جذبات سے مغلوب ہو کر
پھولی نے اُس کا بازو پکڑ لیا۔ وہ پریشان ہو گیا۔ پھولی کی گرفت بازو
میں کبھی جا رہی تھی۔

”بازو چھوڑ دو۔۔۔۔۔ بازو پکڑنے سے فائدہ“ اُس نے سمجھانا
چاہا۔

”بہنیں۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ میں بازو نہیں چھوڑوں گی۔۔۔۔۔ نہیں چھوڑوں
گی!“ پھولی پر شاید ندیان طاری ہو گیا۔

”تم میرا کہا مان لو۔ بازو چھوڑ دو اور کھانا کھا لو۔ کھانا ٹھنڈا ہو رہا
ہے۔“ اُس نے پھولی کی تیز گرفت ڈھیلی کر دی چاہی۔ اس گھر کی ریت ہی
عجیب تھی۔ کوئی پادری پکڑتا ہے تو کوئی بازو۔۔۔۔۔ چھٹکا را پالے کوئی تو
کیسے پالے!

”بہنیں۔۔۔۔۔ نہیں۔ میں بازو نہیں چھوڑوں گی۔ ایسے تر پاتر پا کے
مارنا تھا۔ تو پہلے کیوں نہیں مرنے دیا تم لوگوں نے“

پھولی اُس کے بازو پر ٹک گئی اور وہ گھبرا گیا۔ کہیں پیشیاں ڈھمیلی
پر گئیں یا زخم کھل گئے۔ تو بارش اور اندھیرے میں اُس نے ہی ڈاکٹر کو دھونڈھے
دھونڈھے پھرنا شک ہو گا۔ کاش بڑھیا آجائے اور اُس کی مصیبت ٹل جائے

ناممکن تھا کہ پھولی کی چینیں نیچے رسوئی تک نہ پہنچ گئی ہوں۔ شاید بھیا
 کہیں باہر گئی ہے اور اُسے درخیز غلام سمجھ کر اپنی لاڈلی کو سمجھا لئے کھڑے
 پیوڑ دیا۔۔۔۔۔ ہوں۔۔۔۔۔ لاکر۔۔۔۔۔ جھلی ونگ۔۔۔۔۔ دغا باز۔۔۔۔۔ ال
 ز ادیاں۔۔۔۔۔ پھولی کی گرفت ڈھیلی پڑتی جا رہی تھی اُس نے اپنی جلد و
 جہد نیز کردی و ذرا اور کوشش کرے تو اس ڈانٹ کے چنگل سے نکل
 سکتا ہے۔

یسا کہ پھولی نے اپنا سارا جسم اُچھال کر اُس کی باہنوں پر گر
 دیا۔ پھولی کے ادھ موئے ٹوٹے جسم میں اتنی سکت۔۔۔۔۔! پھولی کی
 پیچنے اُسے سوچنے کی مہلت نہ دی۔ پیچ درد سے لبریز گونجتی کراہتی اٹھی
 اور اُس کے کھٹکھٹے بدن میں پیوست ہو گئی۔ اُس کا بدن سسکا ٹھا
 شاید پھولی کے زخم کھل گئے مزید جدوجہد خطرناک تھی وہ سانس روکے
 بے حس و حرکت پڑا رہا۔

پھولی اُس کی گود میں بے حس و حرکت پڑی تھی۔ شاید بے ہوش
 ہو گئی تھی یا شاید جان بوجھ کر بے ہوش بن گئی تھی۔ ان لوگوں کا کوئی
 بھر دس نہ تھا۔ اُس نے دھیرے سے پھولی کو ہلایا۔ پھولی کے بدن میں کوئی
 حرکت نہ ہوئی۔ بوجھلا کر اُس نے بڑھیا تو آوازیں دیں لیکن سارے
 کھٹین سناٹا طاری رہا۔ بارش کی سرسراہٹ بھی بند ہو گئی تھی۔ شاید بارش
 بھی مر گئی تھی۔

پھولی کا سارا بوجھ اُس کی باہنوں پر تھا۔ اور باہنوں میں ٹھکن
 ابھر رہی تھی۔ شاید پھولی مر گئی تھی۔

اُس نے دھیرے سے ایک ہاتھ چھڑا کر پھولی کے گال پر رکھ دیا۔ گال

۳۔ نسوؤں سے بھینکنے کے باوجود دہک رہا تھا، شاید پھولی کا زندہ ہوتی رہے یقین نہ آیا
 ہاتھ دھیرے دھیرے بڑھ گیا، اور ہچرن کی سلولوں کو مسلتا پھانڈتا پھولی کے
 سینے تک بجا پہنچا دل کی دھڑکن بدستور اچھل کود کر رہی تھی، اسے تسکین سی ہوئی
 پھولی سر نہیں گئی تھی، بلکہ ممکن سے نہ تھاں ہو گئی تھی خود اس کا اپنی باہر نہ تھکن سے
 نہ تھاں ہو رہی تھی، یوں بے ترس و حرکت اکڑوں رہنے سے بدن بھی زیادہ ٹھنڈ
 محسوس کر رہا تھا، پھول کے جسم کی حدت پاس نہ ہوتی تو وہ مختصر بھر کا پنپنے لگتا، پھولی
 کے سینے کی بھی تھارت تے ہاتھ کو گرم کر دیا تھا، ویسے پھولی کے سینے کا عالم
 لمس بھی بڑا اچھا لگ رہا تھا، جی نہیں کرتا تھا ہاتھ ٹپانے کو، غیر ارادی طور پر ہاتھ کے ساتھ
 ساتھ اس کا ذہن بھی پھولی کے عالم جسم پر رہنے لگا۔ تنہا نہیں پھولی کے خد و خال کو جیسے
 چہا رہی تھیں۔

پھولی کا گلاب کی طرح شفاف تھا، نگلے کے ایک طرف کوئی کان سی رنگ پھرک
 رہی تھی، شاید رنگ بتلی تھی پروئے کی مدھم روشنی میں کان لگ رہی تھی، اور پھولی کے اچھے
 رنگ کو واضح کر رہی تھی، جی نہیں اٹھا کہ اس رنگ کو پھر کتنے سے روکے۔ اس رنگ کو پھول بچایا
 اس کان رنگ کو پھر کتنے دیکھ کر اس کے اپنے جسم کی ہر رنگ پھر کتنے لگی تھی، جی نہیں کرتا تھا، پھولی
 کو اپنے سے الگ کر دے پھولی اس کی باہنوں میں ایسے گرمی پڑی تھی، جیسے کوئی نہنیا بچہ
 سویا پڑا ہو۔ دینے کی روشنی نے پھولی کے سوکھے چہرے پر ایک عجیب سی معصومیت بکھر
 دی تھی، جس کی گہرائیوں میں گھبرائیوں کے نقوش، ہونٹوں پر جی پٹریاں اور آنکھوں کے گرد
 نمودار سولہ ڈراؤنے حلقے۔۔۔ ماضی کے سب نشان مدغم ہو گئے تھے، رحمان کا ذہن مسیت
 کے جال میں الجھ سا گیا، ماضی ڈراؤنے چٹنے میں تبدیل ہو گیا، جسے ٹھکرا دینا بہتر محسوس ہوا
 سامنے بڑا معصوم چہرہ کسی چرم کا ارتکا باند کر سکتا تھا۔ نا ہی اس نازک جسم میں کسی گناہ
 کی ترغیب چھپی ہے۔

کسی نامعلوم جنبے کے تحت رحمان کا سر جھٹکتا گیا اور ہونٹ کا ل رنگ کی طرف بڑھنے لگے۔ اس بیٹھے نازک سے لمس سے شاید اس کے بدن کی تنازات سرد پڑ جائے۔ اب تو یہ آگ سی نہ جاتی تھی۔ گناہ... ترغیب... معصومیت... عبدالسلام کا چہرہ ہجڑوں کا چہرہ اور اس کا چہرہ... فرق کیا تھا؟ دیکھ کے مدھم مدھم روشنی میں سب ضد و خلاف گڈ مڈ ہونے لگے۔ اوردہ دونوں... صرف وہ دونوں... درمیان... دو خالق یا صرف دو انسان... وہ دنیاوی پردوں سے بے پرواہ، سماج کی بندشوں سے آزاد ذہن کی حدود سے بے نیاز تخلیق کی قوتوں میں سرشار ہونے لگے۔ دیکھ کے مدھم پر بھتیجی روشنی میں ابدیت نے جنم لینا شروع کیا۔ کھٹکا ہوا اور سر لٹا گیا۔ اُس نے جھٹکے سے اپنا چہرہ دور ہٹا دیا۔ بڑھیا دروازے پر کھڑی تھی۔ وہ بے طرح گھبرا گیا۔

”یہ... بیبے ہوش ہو گئی ہے،“ اُس کی زبان ٹکھڑا گئی۔ کاش بڑھیا اسے بوں گھور گھور کے نہ دیکھے۔

”مر جاتی تو اچھا تھا،“ بڑھیا نے اندر آتے ہوئے کہا، ”تم جا کے کھانا کھا لو۔ پر دس رکھا ہے میں اس کو سنبھالوں گی،“ بڑھیا نے حکم دیا اور اُس نے زرخیز غلام کی طرح حکم کی تعمیل کرنے میں ہی اپنی شریعت سمجھی۔

رحمان کی پیٹھ سبڑھیلوں کے اندھیرے میں جذب ہونے دیکھ کر بڑھیا نے اپنے تئیں چہرے کو ڈھیلنا ہونے دیا۔ سارے چہرے پر بے یقینی کی لکیریں نمودار ہو گئیں۔ یقین نہ آتا تھا کہ اُس کی بوڑھی اُمیدیں جوان ہو جائیں گی۔ شاید کمزور زندگی کو آخر کار بڑھاپے پر رحم آگیا ہو۔ بڑھاپا جانتا تھا کہ زندگی ماضی کو یاد کر کے دھندھکوں میں گم کر دیتی ہے حقیقت کو مہمل انسانوں میں تبدیل کرتی ہے۔ اور بڑھاپا یہ بھی جانتا تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نئی اُمیدیں جنم لیتی ہیں۔ نئے ارمان سر اُٹھاتے ہیں، اور حقیقت میں بھی ڈھل جاتے ہیں۔ زندگی جو کھڑی، اور بڑھاپے

بس پھلتی پھسلاتی چلی جا رہی تھی۔ گو بارش صبح سویرے سورج طلوع ہوتے ہی بند ہو گئی تھی لیکن بادلوں کی دیز تہ نے آسمان کی وسعتوں کو ڈھک رکھا تھا۔ دینا نا تھا بس کی کھڑکی میں سے آسمان کے مشرقی کنارے کو گھور رہا تھا۔ آسمان کے مشرقی کنارے پر بادل کی دیز تہ پھٹ رہی تھی اور ایک نیلا داغ کسی کی نیلی آنکھوں کی طرح واضح ہو رہا تھا۔ نیلے داغ کو دیکھ کر دینا نا تھکبی ڈانوا ڈول ہو رہا تھا کہ یہ داغ اور پھیل جائے۔ پھیلنے پھیلنے آسمان پر لپٹے سفید گھن کے پرچے اڑا دے تاکہ سورج کو ایک بار پھر یہی لینے کا موقع ملے اور زمین پر دھوپ کی بو چھاڑے۔ پانچ دن کی لگاتار بارش زمین کی ساری حرارت ہالے گئی تھی اور حسرات کی جگہ تلے پانی کے جھیل چھوڑ گئی تھی۔ حد نظر تک پانی ہی پانی نظر آتا تھا۔

موقعہ بارش نہ ہوتی تو شاید دینا نا تھ جینے بھری ہوئی چھٹی پوری کاٹتا۔ لیکن بارش آگئی اور دریایا کی سطح کو خطرناک حد تک ابھار گئی۔ ٹھیکہ دار کے بلاوے آگئے اور اسے نیلی آنکھوں کو چھوڑ کر والی سونواری لوٹ آنا پڑا تاکہ اگر کہیں دریایا کی سطح کناروں سے بے قابو ہو جائے تو نمک خوار لوگ ٹھیکہ دار کے جان و مال کی حفاظت کر کے حق ملک ادا کر دے۔

بس کو جھٹکا لگا اور دینا نا تھ کے ذہن نے بھی جھٹکا کھا لیا۔ اس کا منہ کڑوا ہو گیا۔ جی چاہ رہا تھا کہ کسی طور ٹھیکہ دار کے چنگل سے رہائی پالے۔ ماں باپ سے چھٹکارا پالے۔ بیوی بچے سے چھٹکارا پالے اور چھٹکارا پاکر کسی ایسی جگہ بھاگ جائے جہاں ٹھیکہ دار جھڑک نہ سکے۔ ماں باپ پالنے پوسنے کی قیمت نہ مانگیں اور جہاں بیوی چڑھیں کی طرح انسانوں..... دیوانوں پر نہ چھائی رہے۔ جہاں کسی کی کوئی گرفت نہ ہو۔ جہاں کوئی خود غرض نہ ہو۔ اس کی سوچ بے قابو ہونے لگی۔ آسمان پر نیلا داغ بڑھتا جا رہا تھا۔ شاید بڑھتا ہی جائے گا۔ بڑھتے بڑھتے آسمان کی وسعتوں کو

بے نقاب کر دے گا یہ محسوس ہوتے ہی دینا نا تھ کے ذہن کی وسعتیں بھی بے نقاب ہونے لگیں۔ شاید ہر کوئی خود غرض ہے۔ رشتے ناٹے خود غرض ہیں۔ بال بچے خود غرض ہیں۔ جتنے کہ اس کا اپنا وجود خود غرض ہے۔ زندگی بذات خود خود غرض ہے۔ ورنہ اسے کیا پڑی تھی ایک نیلی آنکھوں والے اجنبی وجود سے اُس بڑھانے کی۔ ایک اجنبی وجود.... گوشت پوست کا بے سنگم ٹوٹھرا.... جس کو اس نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا.... نہ محسوس کیا تھا۔ شاید اس لئے کہ کوئی اُس کے اپنے وجود کو واضح کر دے۔ اُس کی زندگی کو معنی پہنڈے۔ اُس کی دنیا کے خدو خال کو ابھارے۔ عجیب دنیا کی عجیب ریت..... عجیب بات تو یہ تھی کہ سواماتی کی دعائیں قبول ہو گئی تھیں اور نوزائیدہ بچے کی آنکھیں آسمان پر بڑھتے نیلے داغ کی طرح گہری نیلی تھیں۔

بس ہا جن گاؤں میں داخل ہونے سے پہلے آخری بار پھسل گئی۔ اور پھسلنے پھسلنے سڑک کے کنارے تک آگئی۔ کچھ اور پھسل جاتی تو قریب کے گڑھے میں یقیناً لڑھک جاتی جو بارش کے پانی سے لہا لب بھر گیا تھا۔ بس گر گر کر کوئی نچا پاتا وہ اس جھیل نما گڑھے میں ڈوب کر رہ جاتا۔ تھ بھر کے لئے بس پر موت کی پرچھائیں اُٹھ آئیں۔ ساری سواریوں پر سکنہ ساطاری ہو گیا جس کو توڑنے کی ہمت باتو فی کلینز کو بھی نہ ہوئی۔

کسی بچے کی ریں ریں نے خاموش سنائے کو توڑ ڈالا۔ زندگی نے ایک بار پھر پھر بری لی۔ سب سواریوں کے سر غیر ارادی طور پر روتے بچے کی اور مڑ گئے۔ شاید ماں نے گھبراہٹ کے مارے بچے کو زور سے بھینچ لیا تھا۔ بچہ تکلیف دہ گرفت سے آزاد ہونے کے لئے ہاتھ پیر مار رہا تھا۔ سواریوں کے ہاتھوں پیروں میں جان سی آگئی۔ سب اپنے دلوں کی بھڑاس نکالنے لگے۔ ڈرائیور کی پھرتی کو سراہا گیا۔ حکومت کی نااہلیت کا تذکرہ ہوا۔ انجنیروں کی نکتہ چینی کی گئی اور آخر میں ٹھیکہ

داروں کو صلواتیں سنائی گئیں۔

”وچاہ توں راہ چاہ در پیش۔ کردہ۔۔۔“ دینا نا تھا کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ کچھ دنوں سے اس کو بات بات پر مقولے استعمال کرنے کی عادت ہو گئی تھی۔ ٹھیکہ دار کچھ کچھ پڑھ لکھ گیا تھا۔ اس لئے اپنے میسٹری کو کبھی خاطر میں نہ لاتا تھا۔ ٹھیکہ دار کی دھونس کا توڑ ہی کرنے کے لئے دینا نا تھا نے مقولے استعمال کرنے کا گرا اختیار کیا تھا۔ ٹھیکہ دار کی سمجھ میں مقولے نہ آتے تھے اس لئے دھونس جانے سے احتہاز کیا کرتا تھا اور دینا نا تھا کی مصیبت طل جاتی تھی۔

لیکن ہزار کوشش کے باوجود دینا نا تھا پورا مقولہ نہ دہرا سکا۔ بس سے بھٹکے نے ذہن مفلوج کر دیا تھا۔ مقولہ یاد آتا یا نہ آتا لیکن مقولے کی تفسیر تو یاد تھی۔ اس کچی سڑک کو پکا بنانے کا ٹھیکہ اس کے اپنے ٹھیکہ دار نے لیا تھا۔ اور ایک مالک پر اپنی قابلیت کا رعب جانے کے لئے دینا نا تھا نے خود تجویز دی تھی کہ سڑک کی بھرائی کے لئے مٹی سڑک کے اطراف سے ہی کافی جائے تاکہ مٹی دور سے لانے کی ضروری نہ پڑ جائے۔ ویسے سڑک پر روڑی بھی نام ہی کو بھائی گئی تھی۔ جو بارش کے ساتھ ساتھ نرم نرم زمین میں دھنس گئی تھی اور روڑی کی جگہ کچھ ہی کچھ اُبھرائی تھی۔ ٹھیکہ بھرائی نہ ہونے کی وجہ سے سڑک میں دراڑیں بھی نمودار ہو گئی تھیں۔ گاڑی میں بیٹھے بیٹھے دینا نا تھا تھلا سا اٹھا۔ لوگ دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے ٹھیکہ داروں کو گالیاں دے رہے تھے۔ ٹھیکہ دار کے آدمیوں کو گالیاں دے رہے تھے۔ لیکن وہ اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے کس کو گالیاں دے۔ ٹھیکہ دار کو یا اپنے آپ کو۔۔۔۔۔!

”اور بارش آگئی تو ساری سڑک بہہ جائے گی۔۔۔۔۔“ ڈرامیور نے موٹی سی گالی دے کر اپنے تبصرے کا اختتام مناسب سمجھا۔ ”آج بس واپس آئی مشکل

ہے۔ کلینر نے ڈرائیور کے متصرے پر یقین کی غرضت کر دی اور دینا ناتھ کے بازو میں بیٹھا منبرا کسما کے رہ گیا۔ بس واپس نہ گئی شہر پہنچا حال تھا۔ وہ اپنی ناؤ رزاق کے حوالے اس شرط پر کر آیا تھا کہ رات ہونے سے پہلے واپس لوٹ آئے گا رزاق کی لڑکی سے رشتہ آن کی شادی کی بات چل رہی تھی اس لئے رزاق مان گیا تھا وہ کوکس کی ناؤ کی خبر گیری کر رہا ہے۔ اور ایسے دنوں میں جب تھوڑے تھوڑے وقفوں بعد ناؤ کو پانی کی چڑھتی سطح کے ساتھ متوازن رکھنا پڑتا ہے۔ رات کو واپس نہ پہنچ سکے گا تو رزاق اکیلا اپنی ناؤ کے ساتھ ساتھ اس کی ناؤ نہ سنبھال سکے گا۔ ناؤ کی خبر گیری آج کی رات نہ ہوئی تو ناؤ ڈوب جائے گی۔ دفعۃً آپ ہی آپ جھنجھلا اٹھا۔ کھلا کیا ضرورت تھی اس خطرناک موسم میں شہر چھوڑنے کی۔ رحمان اُس کا کون تھا۔ رشتہ ناٹے پیار و محبت پر پلٹے ہیں در نہ کون کس کا باپ اور کون کس کا بیٹا۔ لوہے کی زنجیر سے تو نہ بند شدہ تھے وہ آپس میں جیسے ناؤ گزارے سے بندھی رہتی ہے۔ بوڑھا۔۔۔۔۔ کھوسٹ۔ ناؤ بے سہارا چھوڑ کے آیا۔ رحمان امیدیں ارمان چھین گیا تھا اب اُس کی ناؤ۔۔۔۔۔ آخری سہارا بھی چھینے جا رہا تھا۔ بڑھا پا جب آتا ہے تو شاید ہر داؤ الٹا پڑتا ہے اور ہر امید ٹھوکر بن جاتی ہے کہیں وہ واقعی بوڑھا تو نہیں ہو گیا ہے۔۔۔۔۔ اے بوڑھے دیکھ کے چلو۔۔۔۔۔

کسی نے اُس کے بڑھاپے کو ہلکارا اور وہ بس کے دروازے کا سہارا لینے پر مجبور ہو گیا۔ سڑک پر بہت سارے لوگ ایک طرف دوڑے جا رہے تھے وہ ہراساں ہو گیا۔ سہارا لینے کے لئے دینا ناتھ کی طرف دیکھا۔ لیکن دینا ناتھ اُس سے ذرا دور کسی آدمی کو آوازیں دے رہا تھا۔

”اے محمد۔۔۔۔۔ اے او محمد کے بچے۔۔۔۔۔“

محمد دوڑتے دوڑتے رک گیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا اور دینا ناتھ کو پہچان کر

واپس آگیا۔ بڑا بھی دینا نا تھا کے پاس سرک گیا۔

”سلام ستری صاحب.....“ محمد نے آتے ہی سلام گزارا اور دینا نا تھا غور سے ہر ایک طرف دیکھے بغیر نہ رہ سکا۔

”کیا بات ہے۔ ہر کوئی بھاگے جا رہا ہے کہیں یاد نہ تھے تو آگے تو نہیں لگائی کہیں“ دینا نا تھا نے سب محمول اپنا مخصوص اجبہ استعمال کیا۔ ذرا سی ہنسی مذاق سے ان لوگوں کے سیدھے سادھے ذہن اس کی گرفت میں آجاتے تھے۔ ورنہ یہ لوگ الگ تھے۔ ذرا سی پیچھے ہٹ چکے جاتے تھے۔ وہ تو بھلا ہو ٹھیکہ دار کا جس نے الیکشن لڑنے پر اس کو مامور کر دیا۔ ٹھکانہ ٹھیکہ دار الیکشن جیت لے یا نہ جیت لے لیکن وہ ان گنواروں کے ذہن جیتنے میں طاق ہو گیا تھا۔

”ہی ہی ہی۔۔۔“ محمد کو دیکھ کر ہنس پڑا حتیٰ کہ بڑا بھی مسکرا اُسے بغیر نہ رہ سکا۔ ”صاحب کہیں بارش سے کبھی آگ لگتی ہے۔۔۔“

”ہی ہی ہی۔۔۔ آگ نہیں لگتی ہے صاحب بلکہ عید گاہ میں لیکچر ہو رہا ہے۔ سب لوگ وہیں جا رہے ہیں۔“

”کیسا لیکچر۔۔۔“ دینا نا تھا نے یونہی پوچھ لیا۔ ”کیا کوئی منسٹر آگیا ہے یا کوئی ماہر اپنی بکواس سنانے آیا ہے۔“

سونہ داری جب سے ڈیولپمنٹ بلاک میں گئی تھی روز کوئی نہ کوئی افسر یا منسٹر تقریر چھاڑنے کے لئے آجاتا تھا۔ اور جس دن افسر یا منسٹر نہ آجائے اس دن کوئی ماہر مریضانی کا لیکچر چھاڑنے آ موجود ہوتا تھا۔ اور کوئی بطخ پالنے کے گرتبانے آتا تھا۔ مرغیوں اور بطخوں کے فارم کھولے گئے تھے۔ لیکن مرغیوں اور بطخوں سے زیادہ ان پر نوکر تعینات تھے۔ ماہر لوگوں سے ایسے بڑاؤ کرتے تھے۔ جیسے سونہ دار کی زمین پر نہ کبھی کوئی مرغی یا بطخ دیکھی گئی ہے اور نہ پائی گئی ہے۔ گاؤں کے لوگ

لیکچر سن کر پیشان ہو گئے تھے۔ سیاسی کارکن کو زبردستی لیکچر سننے کے لئے اکٹھا کرتے تھے۔ لیکن دفتر کی ترقی کی رفتار انہی لیکچروں کی مرہون منت تھی۔ ہر لیکچر پر کئی کئی فائیلوں نے جنم لیا تھا۔ فائیلوں کو دیکھ کر سونہ واری کی ترقی کی رفتار بڑھتی محسوس ہوتی تھی۔

"سیلاب کے متعلق لیکچر ہو رہا ہے صاحب۔ لوگ ڈر رہے ہیں کہ اس سال بھی سیلاب نہ آجائے۔ اسی لئے گاؤں چھوڑ کے جانا چاہتے ہیں۔ کچھ لوگ تو پہلے بھی گئے صاحب۔ ٹھیکہ دار نے بھی لیکچر کرنا ہے۔ کمر ٹوٹ گئی صبح سے خرش خروش کرتے ہوئے اور کرسیاں دھوتے ہوئے۔۔۔" عجلہ دے کر مہر باہق رکھتے ہوئے کہا اور دنیا ناخک کو اپنی کمر جھکتی محسوس ہوئی۔ ٹھیکہ دار کا نام سن کر اس کی کمر کیا اس کا سارا وجود جھک سا جاتا تھا۔

"ٹھیکہ دار کہاں ہے۔۔۔"

"ابھی گھر پر ہے صاحب۔ اسر دل کے ساتھ چائے پی رہا ہے۔ آتا ہو گا۔"

آپ چلے۔

ٹھیکہ دار کا نام سن کر دنیا ناخک کا جی چاہا انکار کر دے۔ سب کے سامنے ٹھیکہ دار کے دوبرو جانا مشکل تھا۔ ٹھیکہ دار اپنی اوت کار عجب قبا۔ نے کے پیئے نوکر دل کو خواہ مخواہ دوسروں کے سامنے ڈانٹ دینے اور بے عزت کرنے سے کبھی نہ چوکتا تھا۔ لیکن انکار کے الفاظ منہ سے نہ نکل سکے۔ ٹھیکہ دار کے سامنے جانا اسے آج منظور تھا لیکن رحمان کے سامنے جانا اسے بالکل منظور نہ تھا۔ کھلیان میں دوستی کی آخری ڈور بھی ٹوٹ گئی تھی۔ اب ایک دوسرے کا سامنا کرنا مشکل تھا۔ نہرا کوٹا نے کا بہانہ لے لیا نہرا چاچا میں تمہارے ساتھ رحمان کے پاس نہیں آ سکتا۔ ٹھیکہ دار مجھے ڈھونڈ رہا ہے۔ بہتیں اکیلے

جانا پڑے گا۔

دنیا ناٹھ کی بات سن کر نبرا کا دل بیٹھ گیا۔ اکیلے رحمان کے پاس جانا اس کے بس کی بات نہ تھی ورنہ جس دن زیورات کی گمشدگی ظاہر ہو گئی تھی وہ اس دن رحمان کے پاس چلا آتا۔ لڑکا جوان تھا۔ ہاتھ پیر کا سفید تھا۔ بد لحاظ تھا۔ لڑ پڑے تو وہ اکیلا کیا کر سکتا تھا۔ آج دنیا ناٹھ رحمان کی کرتوتوں کا پتہ نہ دیتا تو وہ کبھی آنے کی حافی نہ بھرتا۔ رحمان کے ساتھ ساتھ وہ بھی کسی مصیبت میں نہ پھنس جائے۔ اس لیے وہ دنیا ناٹھ کے بھروسے چلا آیا تھا۔ سوچا تھا دنیا ناٹھ کا ساتھ ہو گا تو شاید رحمان کو سنبھالنا مشکل نہ ہو گا۔ شاید دنیا ناٹھ کے کہنے سننے پر رحمان واپس شہر جانا منظور کر لے۔ ایک دوسرے کے دوست جو ٹھہرے۔

”تم کچھ دیر کے لیے نہیں آ سکتے۔۔۔۔۔“ نبرا نے بے بسی ہو کر کہا۔
 ”ٹھیکہ دار مجھے ڈھونڈ رہا ہو گا چاچا۔ شہر بلاوا بھیجا تھا ورنہ کون ادھوری چھٹی کاٹ کر آتا۔ اور کیا معلوم کوئی مینسٹر بھی آ گیا ہو۔ میرا جانا بہت ضروری ہے۔۔۔“ دنیا ناٹھ نے لفظ مینسٹر پر زور دے کر نبرا کو مرعوب کرنا چاہا۔
 ”میں اکیلا رحمان سے نیٹ نہ سکوں گا۔ تم تو جانتے ہو کہ وہ خود سر ہے۔ کیا معلوم لڑ پڑے“ نبرا چاچا نے کہا اور دنیا ناٹھ تذبذب میں پڑ گیا۔
 رحمان سے چھٹکارا اٹھلیان میں پالیا تھا۔ اب اس بوڑھے سے چھٹکارا کیوں کر مل جائے۔ غلطی کی جو ساتھ لے آیا۔ بس میں بٹھا کر روانہ کر دیتا اور خود دوسری بس سے آجاتا تو یہ دوسرے مول نہ لینا پڑتا۔ نامعلوم وہ ناحق کیوں دوسروں کی مصیبت اپنے سر لے لیتا ہے۔ رحمان کو لے آیا تو مصیبت بن گیا اب رحمان کے باپ کو لے آیا تو یہ بھی پیچھا نہیں چھوڑتا۔

”اچھا چایا۔ تم جلو میں بھی ٹھیکہ دار کو منہ دکھا کر آتا ہوں... بس تمہارے پیچھے پیچھے“ دینا ناخنہ نے جھوٹ بولا۔ ”ضرور آنا...“ نبراس نے اور کوئی چارہ نہ دیکھ کر کہا ”تمہارے آنے تک میں کوئی بات نہ چھیڑوں گا“۔ ہاں چایا... میں ابھی آؤں گا“ دینا ناخنہ نے سر نہ زرد سے ہلاتے ہوئے کہا۔ اب شاید وہ عمر بھر نبرا کا سامنا نہ کر سکے گا۔ بچپن کی دنجیری ایک ایک کر کے ٹوٹی جا رہی تھیں۔ کھلا کیوں نہ لڑیں۔ اب وہ بچہ نہ تھا۔ بلکہ ایک بچے کا باپ تھا۔

نبرا کی مانگیں چلیں کہ تو جل رہی تھیں لیکن ہر قدم پر لڑکھڑاہی تھیں۔ سڑک کچھ سے دب سی گئی تھی۔ قدم دھرتے ہی سارا قازن گجرتا تھا۔ اس کے تختوں میں بلا کی تھکن ہو رہی تھی۔ تختوں کے بجائے جیبے دوکھڑے ہوں۔ کئی بار اس نے چاہا کہ دوکھڑی کے لیے سڑک سے ملحق منڈ پر بیٹھ جائے۔ سننے نیڈ پر ہریالی کی رگیں ابھرائی تھیں اور کسی قالین کے نقش کی طرح خوب صورت لگ رہی تھیں۔ اس پر سے قالین پر بیٹھ کر حد نظر تک پھیلے شیشے کے تختوں کو دیکھنے میں بڑا مزہ آتا۔ بارش کا پانی کھیتوں میں جمع ہو کر شیشے کے تختوں کی طرح ساکن تھا اور بڑا بھلا لگ رہا تھا۔ سورج کی کچھ کر نہیں بادل کے درپچوں میں سے پھیل کر ان تختوں پر نقشاں تھیں اور جب کبھی کوئی ہوا کا جھوٹا پانی کی سسلی کو لڑاں کرتا تو گریں چلی چلی جاتی اور ساری کائنات کی پہچانیاں نقشاں نظر آتی۔ لیکن اس کے قدم نہ رک پائے۔ بہتے لمحات کا احساس اسے قدم بڑھانے پر مجبور کرتا۔ بادل کے دریکے راست کی آمد کے ڈر سے بند ہونے کی سعی کر رہے تھے۔ شاید اتنے سے پہلے بارش شروع ہو جائے۔ بارش آگئی تو یہیں کھنس جانے کا

خطرہ تھا۔

اُس کا پیر کیچڑ میں دھنس گیا۔ اُس نے دور لگایا۔ پیر کیچڑ میں لت پت نکل آیا لیکن جوتا بھنسا رہا۔ اُس نے جھک کر ہاتھ سے جوتے کا پیر کھینچ لیا۔ جوتے کے اندر کیچڑ ہی کیچڑ بھرا تھا۔ اُس کے منہ سے سوٹی موٹی گالیاں اُبل پڑیں۔ جن کی جیزی نے مچلتی کرفوں کو بھی بادلوں کا پردہ کرنے پر مجبور کر دیا۔ کون کہتا تھا یہ زمین سوندھاری تھی۔ سونے کا گھڑا ہے۔ یہ زمین تو کیچڑ کا گھڑا ہے کہ جو کوئی آتا ہے پھنستا ہی جاتا ہے۔

بنرا اگر تاپڑتا جوتے کا پیر بجاتا ہوا بندھ پر چٹھہ گیا۔ دوسری طرف دریا کا پانی بند کی ادنیائی تک آگیا تھا۔ تیز رفتار پانی میں ہلکی سی سرسراہٹ بھی نہ ہو رہی تھی۔ نہ کوئی لہر اٹھ رہی تھی اور نہ ہی کوئی لہنور۔ صاف جتنی سطح ہلکے سے تھر تھرا رہی تھی جیسے ہچکیاں لے رہی ہو۔ یقین نہ آ رہا تھا کہ اس بے جان دریا میں مصیبتوں کا سیلاب چھپا بیٹھا ہوگا۔ اس مٹیالے پانی میں برآمدی کا رنگ گھلا ہو گا اور اس دریا کی خاموشی میں زندگی کی چیخ دیکار پنہاں ہوگی۔ پانی کے بجائے خون اور آنسو بہہ رہے ہوں گے۔ دریا تو ایسے بہہ رہا تھا جیسے کوئی بے ضرر لاش بھی جا رہی ہو..... مردہ مردہ، پر جب کبھی کوئی جھاگ سکا تو وہ بہتا ہوا گزرتا تو نہرو کی نگاہیں عجز ارادی طور پر اس تودے میں اپنی کشتی کے ٹوٹے خدو خال ٹپوٹنے کی کوشش کرتیں۔

ہنگن میں پہنچ کر اسکی آنکھیں چاروں اور طواف کرنے لگیں۔ کچھ دن پہلے ہنگن میں اچھڑی کیاریوں کا نشان دیکھا تھا وہ اب منہدم ہو گیا تھا۔ نہ کیاریوں کا نشان باقی تھا اور نہ کیاریوں کی منڈیریں

باقی تھیں۔ کیاریوں کی جگہ سارے آنگن میں جا بجا کچڑ کے ڈھیر اٹھ کر آئے تھے۔ مکان پر کھڑی مٹی کا لیب موجود نہ ہوتا تو مکان اور کچڑ کے ڈھیر میں تمیز کرنا مشکل تھا۔ بے ڈھنگا مختصر سا مکان جس کی چھت بوسیدہ ہو چکی تھی۔ مکان کی تیسری منزل کچھ کڑیوں کے سہارے یوں کھڑی تھی جیسے گرنے کی تیاری کر رہی ہو۔ تیرھویں دیواروں میں بے ہنگم دریچے اور کھڑکیاں ناسور سے لگے تھیں۔

براہریش کی اکی ڈکی بوندوں سے بے نیاز خستہ مکان کو اپنی بوڑھی لگا بھول سے ٹٹولتا رہا۔ اس معمولی سے مکان میں اس کی دنیا برباد ہو رہی تھی۔ ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں یہ مکان رحمان کی طرح آگ سے بھی نہ نکل جائے۔ بہت نہ چڑھ رہی تھی قدم آگے بڑھانے کی۔ مکان کا کھلا دروازہ کسی اژدہ کے خوفناک دہانے کی طرح اس کا منتظر تھا شاید.....!

دفعۃً اژدہ کے دہانے میں فونی زبان بھنکارنے لگی۔ وہ گہرا گیار تار یک دروازے میں سے کوئی عورت لال پھرن پہنے اٹھ آئی۔ بڑھیا کو پہچاننے میں اسے دیر لگی۔ آج بڑھیا کا پھرن زیادہ میلانہ تھا۔ نہ ہی آج بڑھیا کے بال بے ترتیب تھے۔ چہرے پر بھی کچھ لالی اٹھ آئی تھی یا شاید لال پھرن کی پرچھائیں تھیں۔

”کون ہو تم.....؟“ بڑھیا کی آواز کچھ بھرے آنگن کو بھلانگ نہ آئی بلکہ نفرتی گھنڈوں کی آواز کانوں سے ٹکرائی۔ اس کا بدن جھنجھٹا اٹھا۔

”میں رحمان کا باپ ہوں.....“ گھمبیر لہجہ اختیار کر کے اس نے بدن کی جھنجھٹا ہٹ کو جھٹکانا چاہا۔

اندر آؤ جی..... اندر آؤ..... بڑھیا شرماسی گئی یا شاید اُسے دہم ہو گیا۔ بہر حال بڑھیا نے سر پر پہ لیشان دوپٹے کو سنبھالا اور پیٹھ پھیر کر مکان کے اندر چلی گئی اپنی بار منبر کا ذہن بھی جھنجھٹا گیا اور قدم بڑھایا کہ پیچھے پیچھے بے قابو ہو گئے۔

گھر سے کی فضا بہت گرم تھی۔ اُسکے کھڑے بدن نے انگوٹھی ایسی لی۔ آج فرش نئی چٹائیوں سے ڈھکا ہوا تھا اور کمرے کے کونے میں ایک رنگین درمی بکھی ہوئی تھی۔ درمی کے کنارے ایک نیا بستر لٹایا تھا۔ شاید رحمان کا تھا ورنہ ان بچک منلوں کے پاس تھا کیا یاد آتے ہی اُس کا غصہ نیز ہوا۔ اُس نے کھڑے کھڑے ہی تشرش پس میں پوچھا رحمان کہاں ہے۔ آج کوئی پکچر ہو رہا ہے گاؤں میں۔ سینے چلا گیا آتا ہی ہو گا۔ تم بیٹھو نا۔ بڑھیا کی ادا غضب کی تھی۔ غیر ارادی طور پر وہ ہوکنا ہو گیا۔ شاید بڑھیا چونچے دیکھا کہ اُسے رام کرنا چاہتی تھی۔ ماں نہ ادی۔ جی میں آیا

رحمان کی آمد تک کھڑا رہے۔ بڑھیا کے انداز خطرناک تھے۔ لیکن سردی نے ہاتھ پیر سن کر دئے تھے اور ٹانگوں میں کپکپاہٹ تھی۔ اُس نے چپ چاپ جوتے نکال لئے اور پلٹے بستر کے ساتھ پیٹھ لگا کے بیٹھ گیا۔

نئے سماوار اور چینی کے پیالے دیکھ کر اُسے یاد آیا کہ پہلی بار جب وہ اس مکان میں ٹھہرا تھا تو چائے میٹھی کی ہانڈی میں بنائی گئی تھی اور میٹھی کی پیالیوں میں پی گئی تھی۔ طاق میں چاندی کی طرح چم چم کرتا لالٹن بھی نہ تھا بلکہ کالک میں لٹھڑا ہوا دیا تھا۔ اندازہ لگانے کی ضرورت باقی نہ رہی۔ کہ اتنی جلدی اس گھر میں خوشحالی کیونکر وارد ہو سکی۔

اپنے خون اور پسینے کی کماٹی کو کسی دوسرے گھر کی زینت

بننا دیکھ کر اُسکے وجود میں تلخی سی اُٹھ آتی۔ یا شاید قہوہ کچھ زیادہ تلخ تھا
 ویسے قہوے میں رچی میٹھا اس اُسکے انگ انگ میں رنج رہی تھی۔ اُس کے
 ہر انگ سے ممکن بنوڑ رہی تھی۔ جتنے کہ اُسکے ذہن کو بھی اس مکان کے
 ماحول سے کچھ کچھ ہم آہنگ کر رہی تھی۔

بڑھاپا جو اپنے کے سامنے بیٹھی تھی۔ چوہے میں بھرتی آگ کی لپٹوں
 نے بڑھاپا کے چہرے کو آگ سی لگا دی تھی اور بڑھاپا کا چہرہ لال پیرن
 کو بھی ماند کر رہا تھا۔ چوہا زور و شور سے جل رہا تھا اور چوہے پر کھی
 جانڈی زور و شور سے اُبل رہی تھی۔ منبر اُنے سوچا کہ کچھ دیر میں اُس کے
 سامنے کھانا پر دس کر آ جائیگا۔ بڑھاپا اُس کے سامنے بیٹھ کر ایسے کھانا کھا لے گی
 جیسے پہلے۔۔۔ بہت پہلے زمان کی ماں سامنے بیٹھ کر کھانا کھا لیا کرتی تھی۔ اور
 وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر اس گھر میں مدغم ہو جائیگا۔ جیسے اس
 چار دیواری کے یاہر بارش اور طوفان نے تباہی نہ مچائی ہو۔ نہ تو مکان کی
 چھت اُڑاڑ جا رہی تھی اور نہ ہی مکان کو ڈوبنے کا خطرہ تھا۔ بلکہ مکان
 کے اندر زندگی اپنی مدہم چال پر بدستور کامزن رہتی تھی۔ جتنے کہ یہ مکان
 طوفان کی لہروں پر ڈول بھی نہ رہا تھا۔ نہ مکان اُس کی کشتی کی طرح ٹوٹ
 جائیگا۔ اور نہ کوئی بے گھر ہو گا۔ نہ ہی کسی کا آخری سہارا ہٹ جائے گا۔
 شاید اُسکی کشتی شہر میں بہہ گئی ہو گی۔ اور وہ تھا کہ گھنٹوں میں کانگری
 دبائے بستر سے پیٹھ لگائے ایسے پاؤں پسارے بیٹھا تھا جیسے اس مکان
 کی ہر اینٹ کا سہارا میسر ہو اور اس مکان کی ہر کڑی نے اُس کے
 بوڑھے بدن کو سنبھال رکھا ہو۔

کاش اُسکے پاس بھی چھوٹا سا مکان ہوتا۔ مکان کے سامنے ننھا سا

راہداری میں جوتے جھاڑنے کی آواز منیر نے نظر انداز تو کر دی
 پر جو نہی کسی کا سایہ کرے میں داخل ہو گیا تو وہ ہڑبڑا کر بیٹھ گیا۔ تب
 اُسے یاد آیا کہ اُسکے پاس کوئی چھوٹا سا مکان نہیں۔ کوئی ننھا سا آنگن نہیں۔
 بلکہ صرف ایک پرانی سی کشتی ہے جو وہ شہر میں اللہ کے بھر دے اس
 طوفان میں اکیلا چھوڑ آیا ہے۔ اس لئے اُسکو جلدی سے فیصلہ کر کے واپس
 جانا چاہئے۔ اللہ کو اور بھی بہت سارے کام تھے اُسکی کشتی کی رکھوالی
 کرنے کے سوا۔ لمحہ بھر کے لئے اُسے محسوس ہوا کہ دینا نامنہ اُس کی مدد
 کے لئے آپہنچا ہو گا۔ لیکن دوسرے لمحے اُسکی نگاہیں رحمان کے سرِ پایا میں
 الجھ گئیں۔

رحمان کا تنو مند جسم اُسکی نگاہوں کے سامنے ایسے کوند گیا جیسے وہ
 خود بڑھاپے کا چولا اتار کر سچر سے جوان ہو گیا ہو۔ وہی قد.....
 وہی چال ڈھال..... ویسے ہی چوڑے پچکلے شانے اور اُس جیسے ہی
 گھنگھریالے بال۔ جتنے کہ بال کی لٹ رحمان کے ماتھے پر اُس انداز
 سے بکھری پڑی تھی جیسے کبھی.... بہت پہلے اُس کے اپنے ماتھے پر بکھری

بڑی رہتی تھی۔ اگر رحمان کے سراپا اور اپنی یادداشت کے پیکر میں کچھ فرق تھا تو وہ بلکے نے ڈھانپ رکھا تھا۔ میرا کہے بدن میں رحمان کی قربت نے سفنا ہٹ رواں کر دی۔ رحمان کی رگوں میں وہی خون دوڑ رہا تھا۔ جو اُسکے اپنے بدن میں دوڑا کرتا تھا۔

وہ کیا کہہ رہے بیٹے سے..... رسمی گفتگو چھوڑ دے یا ڈانٹ پلا دے۔ یا صرف خاموش رہ کر بیٹے کا ردِ عمل دیکھ لے۔ آج شاید پکی زمین پر بنایہ گھر وند ابھی طوفان میں پھنسی بے بس کشتی کی طرح بہہ جاتے گا۔۔۔۔۔! یکایک باپ کو سامنے پا کر رحمان بھی گھبرا گیا۔ لیکن اُس نے گھبراہٹ ظاہر نہیں ہونے دی۔ اُس نے خاموشی سے جوتے اتار دیے اور باپ سے ذرا دور بیٹھ گیا۔ ہمت نہ پڑ رہی تھی باپ سے آنکھیں ملانے کی سیر میرا کی آنکھیں میبا کی سے رحمان کے جسم پر انگ گئی تھیں۔ سفید لٹھے کی قبض میں رحمان بڑا وجہہ لگ رہا تھا۔ قبض کے اوپر کالے رنگ کی واسکٹ تھی۔ واسکٹ کا رنگ لٹھے کی قبض کے سفید رنگ پر چھب رہا تھا۔ شاید رحمان کے جوتے بھی نئے تھے۔ بیٹا باپ کے ارمان بڑی بے دردی سے لٹا رہا تھا۔۔۔۔۔ ہوں..... اُس نے آنکھوں پر زور دیا۔ کرے کی مدھم روشنی میں جوتوں کا نیا پن دکھائی نہ دیا لیکن رحمان کی سفید لٹھے کی شلو اور جتنا یہی کھنی کہ نئی بنائی گئی ہے اور کافی قیمت کی بھی ہے۔ وہ اپنا دل مسوس کے رہ گیا۔

رحمان خاموشی سے چائے پینے لگا تو نبرا سے نہ رہا گیا۔ رحمان شاید سمجھ رہا تھا۔ کہ باپ گھٹکھانے آیا ہوگا۔۔۔۔۔ اُس نے کچلے کو کھنکھار ادا کر دیا۔۔۔۔۔ لہجے میں کہنے لگا۔۔۔۔۔ چائے جلدی سے پی لو۔ دیر ہو رہی ہے۔ باپ کی آواز نے بھی رحمان کو سر اٹھانے پر مجبور نہ کیا۔

کسی دیر ہو رہی ہے»

» واپس شہر چلنا ہے.... میرا نے وضاحت کی اور رسوئی میں بیٹھی پھولی کی ماں کا جسم تن سا گیا۔

» کیوں... یہ اچھے رحمان نے سراٹھا کر باپ سے بے خوف آنکھیں۔
ملا میں اور نبر اکو یھیں ہو گیا کہ رحمان کی رگوں میں بھی گرم خون دوڑ رہا ہے۔
» مجھ سے پوچھتے ہو بیٹے.... » نبر اکے لیے میں اتنا تیز طنز تھا کہ
رسوئی میں بیٹھی بڑھیا بھی سر موڑنے پر مجبور ہو گئی۔

رحمان نے جواب دینے سے پہلے بڑھیا کی طرف دیکھا۔ باپ کی طرف
دیکھا۔ اور ارادہ بدل دیا۔ دن کے اُجالے میں گاؤں بھر کو اکٹھا کرنے میں
کوئی فائدہ نہ تھا۔ باپ بیٹے میں فیصلہ رات کے اندھیرے میں بھی ہو سکتا تھا۔
اس نے بات ٹال دی۔

» تم کھانا کھا کر آرام کر لو..... صبح سوچا جائے گا۔... »

بیٹے کو دبتا دیکھ کر نبر اکا دل بڑھ گیا۔ رحمان شاید اتنا نبر اک نہ تھا جتنا
لوگ کہتے تھے۔

» نہیں سمجھتی..... رات کو پانی چڑھ آیا تو راستے کٹ جائیگے۔ پھر تو

جانا مشکل ہو گا۔

» تم فکر نہ کرو۔ سڑک کٹ نہیں جائیگی چاہے پانی کتنا ہی اور چڑھ
آتے۔ رحمان نے بوڑھے کو دلا سا دینا چاہا لیکن نبر اک بے خبر ہوا اٹھا۔
سو نہ داری میں سیلاب آتے یا نہ آتے لیکن شہر میں اُسکی کشتی خطرے میں
گھیر سی ہوتی تھی۔ عقل کا تقاضہ تھا کہ رات ہونے سے پہلے شہر پہنچ جائے۔
اس لئے اس نے بیٹے کو ٹوکا۔ » بھلا سیلاب کیونکر نہیں آئے گا۔

جب پانی بہا ہر چڑھتا جا رہا ہے ۔

” میں ابھی ابھی پیکچر سن کے آ رہا ہوں ۔ وہاں سبھی کہہ رہے تھے کہ پانی چڑھ بھی آتے تب بھی سیلاب نہیں آ سکتا ۔“

رحمان کے سمجھانے پر منیر اچھڑ گیا ۔ اسکی اپنی ساری عمر سیلابوں کے ہیچ گزر گئی تھی اور یہ کلی کا چھوکر اسکو سیلاب کے راز سمجھا رہا تھا یا شاید جبل دے رہا تھا ۔

” ہوں ” منیر کا لہجہ تیز ہو گیا ” میں بھی تو سنوں پیکچر میں کیا سن آئے “

موقعہ نازک تھا ورنہ رحمان باپ کے تیز لہجے کا توڑ دو چار گالیوں سے پورا کرتا ۔ اُسے مجبوراً انکساری دیکھانی پڑی ، ” آج حاجتی میں پیکچر تھا ۔ سب بڑے افسر آئے تھے ۔ انجینئر بھی آئے تھے ۔ انہوں نے کہا ۔ اس سالی دُگر اور دریا کے ارد گرد بندھ بناتے گئے ہیں ۔ اس لئے پانی رکا رہے گا ۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں اور نہ ہی گاؤں چھوڑنے میں کوئی فائدہ ہے ۔ اب تم ہی بتاؤ انجینئروں کو جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی بولو ۔“

” اور جو میں نے شہر سے آتے ہوئے سڑک میں دراڑیں پڑتی دیکھیں ؟ اور جو اس گاؤں کی سڑک پر بندھے بندھے میں سے پانی ریس ریس کے آ رہا ہے ؟ بیسوں جگہ سے پانی نکل رہا ہے“

مجلا سیلاب کے سامنے یہ کچے بندھ کہیں رُک سکتے ہیں کیا ۔ اپنے انجینئروں سے کہنا تھا کہ اپنے بندھوں کی حالت تو دیکھ لیں صرف پیکچر کرنے سے“

مینرا کی باتیں سن کر بُڑھیا سے مزید نہ رُکا گیا۔ بوڑھا کیا آگیا تھا جیسے سیلاب کا پھیرا آگیا تھا جو اس گھر کی چولیں اُکھاڑنے پر تلا محسوس ہو رہا تھا۔ گریہ گیا یہ گھر تو وہ خود اسکے تئے دیب جاتیگی۔ رحمان کے چلے جانے میں اس سارے گھر کی تباہی تھی۔ بربادی تھی۔ بوڑھے گھر کو برسوں بعد جوان سہارا ملا تھا۔ وہ چپ رہی تو شاید رحمان باپ کی باتوں سے مرعوب ہو کر شہر جانے پر آمادہ ہو جائے اس لئے اس نے رحمان کی مدد کرنی مناسب سمجھی۔

”ٹھیک تو کہہ رہا ہے رحمان بیٹا۔ سیلاب آئے کا خدشہ ہوتا تو گاؤں کا تھاؤں اب تک خالی ہو گیا ہوتا۔ ہم خود بھی مکان چھوڑ کے چلے جاتے۔“ بُڑھیا نے آخری جملہ کہہ کر بوڑھے کے ذہن پر یقین کی مہر ثبت کر فی چاہی لیکن مینرا کا ذہن پہلے جملہ پر ہی اٹکا رہا۔ ٹھیک کہہ رہا تھا دینا ناتھ ”بیٹا“ ”بیٹا“ کہہ کر ہی بُڑھیا رحمان کو بس میں کتے بیٹھی تھی اور رحمان دودھ پیتے بچے کی طرح بُڑھیا کی مٹکلی میں اُلجھ کے رہ گیا تھا۔ وہ بہہ بہہ ہو گیا۔

”میں تم کو خوب سمجھتا ہوں۔ میں بچہ نہیں ہوں۔ تم بیچ میں نہ بولو۔“ منبرا کا لہجہ اتنا گھناؤنا تھا کہ رحمان بھی کانپ کے رہ گیا۔ ”کیا سمجھتے ہو تم.....“ بُڑھیا کے منہ سے مشکل نکل گیا۔ ”تم چھال ہو..... ولالہ ہو..... کسب ہو.....“ رحمان نے باپ کو روکنا چاہا۔ یہ الفاظ نہ تھے کوڑے تھے جو اسکے سارے وجود کو بھروسہ کر گئے۔

”کیا بکتے ہو.....“ اس نے باپ کو شانے سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔

”میرا شانہ چھوڑ دو۔ اپنے گندے ہاتھ دور رکھو“ میرا بیٹہ
 پر برس پڑا۔ یہ بیٹی سے پیشہ کرتی ہے۔ اور گھر چلاتی ہے۔“
 ”بابا..... در جمان دھارٹا۔ سو چانتھارات کے اندھیرے میں
 پیپ اور گندہ پتی رہیگی تو محسوس نہ ہوگی پر بوڑھے عاوان کے
 اقبالے میں ہی تاسور کھڑے چنے پہ نکل گیا تھا۔

”میں سب جانتا ہوں۔ اسکی بیٹی نے حرامی بچہ جنا ہے اور تم اس
 کے باپ ہو۔ تبھی تم یہ گھر چھوڑنے کی جرات نہیں کر سکتے۔“
 شبرا کے انکشاف نے رحمان کے رونگھٹے کھڑے کر دئے۔ دینا نامہ
 اُس کو گناہگار سمجھ لے یا گاؤں والے تو ان کا کوئی قصور نہ تھا
 حالات ہی کچھ ایسے تھے۔ پر اپنا باپ اُس کو گناہگار سمجھ لے۔ اپنا خون
 اُس کو گناہگار سمجھ لے تو وہ کیا کر سکتا ہے۔ کیسے بوڑھے کو
 سمجھا سکتا ہے۔ کیونکر کہے باپ سے کہہ... کہہ... اُف... بوڑھے
 مہلت تو دے۔

میرا کی باتوں نے بڑھیا کے وجود کو ہلا کے رکھ دیا۔ وہ جھٹکے
 سے اٹھی۔ جو لمبے کی پٹیں ٹھنڈی پڑ گئی تھیں صرف انگاروں کی دھک
 باقی بقی چٹکی روشنی میں بڑھیا کے لال بچرن نے آگ سی پکڑ لی تھی
 ”نکل جاؤ میرے گھر سے... دونوں کے دونوں نکل جاؤ.....“
 اس وقت نکل جاؤ۔

بڑھیا کی آواز بھیانک تھی۔ چہرے پر بیتناک سُرخئی ٹوڈ کر آتی
 تھی۔ آنکھوں میں ٹیلیوں کے بجائے انگارے دھک رہے تھے۔ اور سدا
 بدن آگ کی سُرخ دہکتی لپٹ کی طرح ہرار ہا تھا۔ سُرخ سُر خراتے

لال پھرن کا جھول خونی آبشار کی طرح زندہ تھا۔ منیر کا ٹھکانا
 گیا۔ بڑھیا ایسے کھڑی تھی جیسے ماہی کے دبیز پردوں کو بھاڑ
 کر رجمان کی ماں ایک بار پھر وجود میں آکر اُسکے سامنے کھڑی ہو۔
 اور کشتی کے کھڑے در سے پھٹوں پر بنے چوہے کے سامنے اسکو ڈانٹ
 پلہ رہی ہو۔ لمحہ بھر کے لئے اُس کا ذہن وقت کی حدود کو بچھلانگ
 کر ماہی کی بھول بھلیوں میں گم ہونے لگا۔ اور اُس کے ہاتھ غیر۔
 ارادی طور پر ننھے پکتے رجمان کو سنبھالنے کے لئے بڑھ پڑے۔ لیکن اُس
 کے ہاتھ رجمان تک نہ پہنچ پائے۔ رجمان بڑھیا کی طرف بڑھ رہا
 تھا۔ بڑھیا کی طاقت جواب دے گئی تھی۔ اور اُس کا سر رسوئی اور
 کرے کے درمیان منڈیر پر ہوئے ہوئے پل رہا تھا۔ ہر سیسکی کے ساتھ
 آنسو کے قطرے گرتے جاگتے تھے۔ منیر کا دل بڑھیا کی جگہ لپی دیکھ کر
 بیچ سا گیا۔ گڑے گڑے مردے اُکھاڑنے سے کوئی فائدہ نہ تھا۔ جو ہونا تھا۔
 سو ہو گیا تھا۔ بیٹا باپ کے ساتھ جانے پر رضامند ہو تو باپ کو اور کیا چاہیے
 وہ زیوروں کپڑوں کی والیسی کا مطالعہ بھی نہیں کریگا۔ اُس نے بیٹے کو
 ٹوکا۔ ”رجمان“۔ دیر ہو رہی ہے اور گھاڑی کا وقت نکلا جا رہا ہے۔
 رجمان کرے کے دست میں اتنی تیزی سے پلٹ پڑا کہ منیر کا سر جھکا
 سا گیا۔ ”میں نہیں جاؤں گا۔۔۔۔۔“

”کیوں۔۔۔۔۔“ اُسکے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

”میری مرضی۔ تمہیں جانا ہے تو یاؤ۔ میں نہیں جاؤں گا۔ رجمان کا لہجہ
 درشت تھا۔

ایکے منیر کو جھٹکا سا لگا۔ رجمان کا انکار شاید اُسکی تھک تھی۔

ایک بیٹا باپ کو دھنکار دے اور وہ بھی اس چھڑال بڑھیا کے سامنے!
 ... لعنت ہے ایسی اولاد پر۔ سوچا تقارحان ساتھ چلے گا تو وہ ہر
 قصور معاف کر دیگا۔ نئے گھنے کپڑے بنوانے کی کوشش کرے گا۔ گھر میں
 ہونے آئے گا۔

مرنے سے پہلے اپنے بیچ کو بھلتا بھولتا دیکھ پانا تو شاید موت کی
 کھڑوادایوں میں تسکین سی رہتی۔ کہ اُسکی زندگی رات گنا گئی۔ بھلا
 ایک باپ اپنے بیٹے کے لئے اس سے زیادہ اور کیا چاہ سکتا ہے۔ لیکن بیٹا
 ہو بھی اس قابل۔ اس نامہنار نے تو زندگی ویران کر فی ہے سو کر رہا
 ہے۔ جاتے جہنم میں۔ ... اُسکی بلا ہے۔ اُسے چاہئے مزید وقت ضائع نہ
 کرے۔ گاڑی کا وقت نکلا جا رہا تھا۔ اس لئے اپنے زیوروں اور
 کپڑوں کا مطالبہ کرنا چاہئے۔ جب بیٹا اُس کا نہ رہا تو زیوروں کپڑوں
 پر بیٹے کا کوئی حق نہیں۔ کوئی حق نہیں۔ اُس نے مانگ کی۔
 اگر تمہاری مرضی یہی ہے تو سڑتے رہو نہیں۔ لیکن زیور اور
 کپڑے تو واپس کر دو۔

میرے پاس نہیں ہیں زیور کپڑے۔۔۔۔۔۔ رحمان کے جواب
 نے منبر اکو پاگل سا کر دیا۔

”واہ ایک تو چوری کرتے شرم نہیں آتی۔ اوپر سے دھونس جمار ہے
 ہو“ منبر نے تینکے کو سہارا بنانے کی کوشش کی۔ زیور کپڑوں کے
 مطالبے کے سامنے شاید بڑھیا کو بھی ہتھیار ڈالنے پڑیں۔ اور بیٹا اُس
 کے ساتھ جانے پر رضامند ہو۔ حقیقت تو یہ تھی کہ منبر کو بیٹے کے جوان
 سہارنے کے بغیر اپنا بوڑھا وجود ویران سا محسوس ہو رہا تھا۔

”چوری... بڑا بھیا کے منہ سے بے اختیار نکل گیا اور رحمان پر
 گھسٹوں پانی پڑ گیا۔ جھوٹ بولنے کی اچھی سزا مل رہی تھی۔ ڈھنگ
 مار رہی تھی بڑا بھیا کے سامنے کہ وہ باپ کی مرضی سے زیور کپڑے اٹھا لایا۔
 اکلوتا بیٹا ستھانا... بڑا لاڈلا... اور آج بڑا بھیا کے سامنے
 اسکو ننکا کر بیٹھا۔ بڑا بھیا سے آنکھ ملائی مشکل ہو رہی تھی۔
 ”جیسے تو نہیں جانتی...“ نبرا بڑا بھیا پر ہنسنے لگا ”تو نے ہی
 تو میرے بیٹے کو آوارہ بنا دیا۔“

”میں کہتا ہوں چپ رہو...“ رحمان چیخ پڑا۔ جی چاہ رہا تھا
 باپ کا گلا گھونٹ دے۔

”میں کیوں چپ رہوں۔ ایک تو چوری اور سینہ نہوری...“
 نبرا جوش میں آکر بیٹے کے سامنے تن گیا۔ تنکا شاید مضبوطی سے تھپتھپ رہا ہو!
 ”کاش تم میرے باپ نہ ہوتے... تو میں... تو میں تم کو مزا چکھا
 دیتا۔“ رحمان کی آنکھوں سے انکارے برسنے لگے اور نبرا کے تن و بدن
 نے آگ پکڑ لی ”سہ کون بد قسمت کہتا ہے کہ میں تمہارا باپ ہوں۔ میں
 تم جیسے بچے کے منہ پر تھوکتا بھی پسند نہیں کروں گا۔“
 رحمان کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے باپ کو نشانے سے پکڑ
 کر لٹکارا ”تھوکت کے تو دیکھو... بڑا بھیا کھوسٹ۔“
 اور نبرائے آؤ دیکھنا تاؤ... اپنی پوری طاقت سے رحمان
 کے منہ پر تھوکت دیا۔

”بھولی کی جاگ کھل گئی۔ وہ بڑا بھیا کے اٹھ بیٹھی۔ دل بلیوں
 اچھل رہا تھا۔ شاید بھونچال آ رہا تھا یا شاید سیلاب آ گیا تھا۔“

کا پتہ ہاتھوں سے اُس نے آنکھوں کو مسلا۔ سارے مکان ہل رہا تھا۔
وہ بستر میں سے بے تحاشہ اٹھی اور گرتی پڑتی سیڑھیاں اُترنے لگی۔
مکان گہرے ہاتھ شاید اور ماں کہیں بلے کے نیچے دب گئی تھی۔ ماں کی
چینیں کانوں کے پردے بچھا رہی تھی۔

گیرتی پڑتی وہ راہداری میں پہنچ گئی مگر رسوئی گھر کے اندر نہ جاسکی
رسوئی گھر کے اندھیرے میں گویا دو ساندھ آپس میں ٹکرا رہے تھے
اور بڑھیا چنچ چنچ کر اُن کو انگ کر رہی تھی۔ اُسکی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔
آنکھوں کے سامنے اندھیرا اُٹ آیا۔ دروازے کی چوکھٹ دور بھاگتی
محسوس ہوتی۔ بے سہارا وہ راہداری میں ڈھیر ہو گئی۔

جب اُس کو ہوش آیا تو ماں اُسکے چہرے پر پانی کے چھینٹ مار
رہی تھی۔ ماں سے ذرا پرے رحمان اور رحمان کا باپ کھڑا تھا۔
وہ انکی حالت دیکھ کر ڈر گئی۔ دونوں کے چہرے ہولناک تھے۔
کپڑے تار تار ہو گئے تھے۔ رحمان کے باپ کی ایک آنکھ بالکل بند
ہو گئی تھی۔ آنکھ کے بجائے چہرے پر ہلکے کالے رنگ کا داغ پھیلا تھا۔
وہ قیض کے دامن سے ہونٹ پونچھ رہا تھا۔ شاید رحمان کا سر بھی
چھٹ گیا تھا۔ بالوں میں سے خون کے قطرے رِس رِس کر نکال رہے تھے۔
چارے تھے۔ اور کال پر سے ہونے ہوئے شانے میں جذب ہو رہے۔
تھے۔ سفید لٹے کی قیض پر لال لال داغ واضح تھے۔ کمرے میں قبرستان
کی سی خاموشی طاری تھی جس میں رحمان اور اُس کے باپ کی تیز تیز سانسیں
پھنکار مارتی محسوس ہو رہی تھی۔

کیا دیکھتے ہو تم دونوں۔ میری بیٹی کو مار ڈالا۔ ہاتھ بٹا دیا

اسے اوپر کمرے میں لے چلیں " شاید ماں رو رہی تھی۔

رحمان نے باپ کی طرف دیکھ لیا۔ باپ پیٹھ پھیر کر کمرے کے اندھیرے میں گم ہو گیا۔ رحمان آگے بڑھا۔ اور اُسکو اپنی منہبوط بانہوں میں اٹھا لیا میٹرم کے مارے اُس نے آنکھیں موند لیں۔

اسکی جاگ کھل گئی۔ ابکے رحمان اُسکو گود میں اٹھا کر نیچے لے آ رہا تھا پیچھے پیچھے ماں اُس کا لپٹا لپٹا یا بستری لے کر چل رہی تھی۔ اور آگے آگے رحمان کا باپ جلتی لالٹیں لئے سیرٹھیاں روشن کر رہا تھا۔ آج رات ہی کچھ ایسی تھی جب اُس کا سارا وجود رحمان کی بانہوں میں ڈول رہا تھا۔

وہ رسوائی میں پہنچ گئے۔ رحمان کا باپ لالٹیں لئے کھڑا رہا۔ ماں نے بستر بچھایا اور رحمان نے اُس کو بستر پہ آہستہ سے لیٹا دیا۔ کمرے کی گھری خاموشی میں ابکے باہر سے آتی ہوئی کچھ بے ربط چیخ و پکار ہلکا سا ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ دفعتاً رحمان کا باپ کراہ اٹھا۔

وہ میں نہ کہتا تھا کہ آج رات کو سیلاب آئے گا پھر تم لوگ ماننے بھی ہاتے شہر میں میری کشتی بہہ گئی ہو گی۔ اب کیا ہو گا۔۔۔ اب کیا ہو گا؟ " رشور بچانے سے کوئی فائدہ نہیں۔" رحمان نے باپ کا منہ بند کر دیا " تم لوگ تیار رہو۔ میں اپنی ناؤ لے کر آتا ہوں۔ پانی مکان تک پہنچنے سے پہلے ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔"

" جلدی جاؤ نا۔۔۔۔۔ ناؤ بہہ گئی تو سمجھ نکل نہ پائیگے " نبرانے کہا اور بڑھیا کا دل جل گیا۔ بوڑھا کیسی بے دردی سے بیٹے کو موت کے

منہ میں دھکیل رہا تھا اُسکی مامتا نے برداشت نہ کیا وہ رحمان کو روکنے لگی۔
 ”ابھی نہ جاؤ بیٹا۔ روشنی ہو جائے حینب جانا۔ کہیں پیر پھسل گیا
 اندھیرے میں تو.....“

”ماں۔۔۔ ہانجی کا بیٹا ہوں۔ ہانجی کا۔۔۔ میرا پیر نہیں پھسلتا۔ جوڑک
 بھی گیا تو صبح تک کشتی پہنچ جائے گی“ رحمان نے بڑھیا کی ڈھارس بندھائی
 اور ننگے پیر کمرے میں سے نکل کر رات کے اندھیرے میں گم ہو گیا۔

بارش بند ہو چلی تھی لیکن ٹھنڈی ہو اس کے پیچھے سرگرداں تھے
 شاید بادل بھی ہٹ جائیں۔ اس سال موسم پر بھر دسہ نہ تھا۔ رحمان نے
 سوچا اور نگاہیں چاروں طرف اور پھینکیں۔ نگاہیں پر سو بے سہارا
 پلٹ پڑیں۔ ہر سو اندھیرا تھا۔ گاؤں کے دورے بے ربط چیخ و
 پکار نہ سنائی دیتی تو اس بھیا نک رات کے اندھے اور موت کے
 اندھے میں کوئی فرق نہ محسوس ہوتا۔ اس اندھے میں موت
 یقیناً منڈلا رہی تھی۔ اور اپنے سر دہچے پھیلائے اسکا انتظار کر رہی تھی
 شاید وہ چلتے چلتے ٹھٹھک گیا۔ پیر پانی کی سطح سے چھو گیا اور چھو کر
 ڈوبنا ہی چلا گیا۔ پانی بہت اوپر چڑھ آیا تھا۔ بڑھیا کا مکان گاؤں
 سے ذرا دور اونچے ٹیلے پر واقع نہ ہوتا تو کب کا ڈوب چکا ہوتا۔ اور
 انکی چیخیں بھی گاؤں کے وسط سے آتی ہوتی بے ربط آوازوں میں اضافہ
 کرتیں۔ گاؤں شاید پورا ڈوب گیا تھا۔ ورنہ آوازیں لحظہ بہ لحظہ مدہم
 نہ ہونے لگتیں۔

پانی کی سطح جب اُسکے گھٹنوں تک آگئی تو اُسے سردی کا احساس
 ہونے لگا۔ سطح گھٹنوں سے اوپر رانوں پر بڑھ آئی تو اُس کا دل

دنگھانے لگا۔ پانی بڑھنے کی ہی رفتار رہی تو ناؤ تک پہنچنا محال تھا۔
 اس کا بچا ہمارے واپس لوٹ پڑے آگے بڑھنے میں جان کا خطرہ تھا۔
 لیکن قدم آگے بڑھتے رہے باپ ویسے ہی بھرا بیٹھا تھا۔ اسے ناؤ
 کے بغیر واپس لوٹتے دیکھ کر زندہ نہیں چھوڑنے کا۔ باپ بوڑھا
 مہی پر اتنا سخت تھا کہ جھپ کے دوران اس کا جوان جسم بھی کچھ دیر
 کے لئے بوڑھا پے کے سامنے لڑکھڑا گیا تھا۔

وہ لڑکھڑا گیا۔ اور پانی نے چشم زدن میں اسے اپنی گود میں جکڑ لیا۔
 سیلاب راستے کی ساری کیمچر ہالے گیا تھا۔ اور کیمچر کے بجائے چکنی
 سطح کا تختہ سا چھوڑ گیا تھا۔ کئی غوطے کھانے کے بعد وہ ہانپتا کانپتا بدن
 کو سنبھالنے میں کامیاب ہو گیا۔ باغیچوں کی دیواریں اس پاس کھڑی
 نہ ہوتیں تو کب کا ڈوب گیا ہوتا۔ بدن پر آن لائن جگہیں پانی کے ٹھنڈے
 لمس سے تلہلا اٹھیں اور تب اسے محسوس ہوا کہ بوڑھے نے اس کا جسم
 بری طرح سے نوح رکھا ہے جھیلے کپڑوں کا لمس بھی کچھ اچھا نہ محسوس
 ہوا۔ وہ جھنجھلا اٹھا۔ احتیاط برتنے کا کوئی فائدہ نہ تھا سارے کپڑے
 سترابو رہ گئے تھے۔

ناؤ کو دیکھ کر اس کے ٹھٹھرنے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ کہاں تو اس
 نے کشتی کو سیلاب کے ڈر سے خشکی پر کھینچ رکھا تھا اور کہاں اب کشتی
 پانی پر جھکولے کھا رہی تھی شکر تھی اللہ کا کہ اس نے کشتی کو خشکی پر کھینچ
 لانے کے یا وجود پاس کے درخت کے تنے سے باندھ رکھا تھا۔ ورنہ
 بہہ گئی ہوتی۔ ایک رات میں دونوں کھو جانے کا ہدمہ برداشت سے
 باہر ہو جاتا۔ پانی کئی فٹ اوپر چڑھ آیا تھا۔ درخت کا تنہا پانی میں

اتنا ڈوب گیا تھا کہ کشتی اور تنے کے بیچ بندھی ڈور آخری حد تک تن گئی تھی۔ اور کشتی درخت کی ٹہنیوں میں ایسے گھس آئی تھی جیسے پانی کے ڈر سے ٹہنیوں کو پکڑے بیٹھی ہو۔ بے پاری کشتی۔ وہ کچھ دیر بعد پہنچ جاتا تو کشتی اٹھرتے پانی کا ساتھ نہ دے سکتی اور یقیناً ڈوب جاتی۔ وہ بازوؤں کے بل کشتی اچک گیا۔ درخت کی ٹہنیاں اُسکے چہرے سے ٹکرائیں اور کئی جگہ جھجھ بھی گئیں۔ پانی سے باہر آتے ہی بدن ٹھنڈی ہوا کے پتھروں سے کانپنے لگا۔ کپڑے اتار کر پھوڑنے کی فرصت نہ تھی۔ ڈر تھا کہ کشتی کی ڈور الگ کرنے سے پہلے ہی ہاتھ پیرا کر نہ جائیں۔ اُس نے اندھیرے میں ٹولا۔ چپو فرش کے پھٹوں کے نیچے چھپا پڑا تھا۔ اُسے تسکین سی ملی۔ اب کوئی خطرہ نہ تھا۔ ناقص حالت میں تھی۔ چپو ہاتھ میں تھا اور اُسکے کپکپاتے بدن میں ابھی سکت باقی تھی۔ کانپتی انگلیاں کشتی کی ٹوک سے بندھی ڈور میں الجھ گئیں۔ ڈور الگ ہو کر پانی میں ڈوب گئی۔ اور کشتی آزاد ہو کر ہر دوں پر ڈولنے لگی۔

کشتی آزاد کیا ہوئی جیسے دنیا سحر کی مصیبتیں آزاد ہو کر اس پر نازل ہو گئیں۔ جس راستے سے وہ کشتی تک آ گیا تھا اس راستے کشتی لے جانا ناممکن تھا۔ باغیچوں کی دیواروں کے بیچ اتنی لمبی کشتی گزارنی کھن کھا۔ اور باقی سب راستے پانی میں اوجھل کھے شاید پو پھٹ رہی تھی۔ ہر سو اندھیرا ہوتا جا رہا تھا۔ ایسے بادلوں پہٹ رہے تھے۔ اور ستارے ٹٹٹا ٹٹٹ کھے جتنی پر چھپائیں پھیل کر پانی کو بھی تلاؤں کی وسعت دے رہی تھیں۔ بھلا ہوا کہ

دُکے پیڑوں کا چٹکی مدد سے اُسے کچھ کچھ راہ سمجھائی دے رہی تھی
 ورنہ گمان ہوتا تھا کہ جیسے کشتی پانی کی سطح پر نہیں بلکہ آسمان کی
 بے پناہ وسعتوں میں بہہ رہی ہے اور اپنے پیچھے کہکشان کی بیکسریں
 چھوڑتی جا رہی ہے۔

فضا ساکت تھی۔ پانی ساکن تھا۔ حتیٰ کہ شور و غل کی آوازیں
 بھی دم توڑ چکی تھیں۔ یہ پانی کا سیلاب نہ تھا خاموشی کا سیلاب
 تھا جس میں زندگی کی ہر ایک روح دم توڑ چکی تھی۔ چپو کی چپ چپ
 نہ ہوتی تو شاید اُسکے دل کی دھڑکن بھی بے سہارا ہو کر اس
 خاموش سیلاب کی عمیق گہرائیوں میں دم توڑ چکی ہوتی۔ کاش۔۔۔
 وہ اس خاموش موت کی وادی سے نکل کر گھر پہنچ جاتے۔ جہاں
 باپ کی جھڑکی، بڑھیا کا پیار اور بھولی کی دھتکار۔۔۔۔۔ زندگی
 کے کئی لوازمات موجود تھے۔ کاش۔۔۔۔۔ کشتی درختوں کی ان بھول
 بھولیوں سے نکل جاتے۔ کاش۔۔۔۔۔ اُس کا چپو بہتے گھاس پھوس
 کے ڈھیروں میں اکھب نہ جاتے۔۔۔۔۔ کاش۔۔۔۔۔

اُس کو کھٹو کر سی لگی یا شاید کشتی نے کھٹو کر کھائی۔ اُس نے
 بے خواب آنکھوں پر زور دیا۔ کشتی کی نوک کسی کالے ڈھیر میں
 کھٹب گئی تھی۔ وہ احتیاط سے آگے بڑھیا۔ آگے تعجب ہوا کشتی کی
 نوک کسی کنارے کے بجائے کسی مکان کی چھت میں اٹک گئی تھی۔
 اس کے سارے بدن میں جھرجھری آتی۔ یقین نہ آ رہا تھا۔ کہ یہ
 پانی میں ڈوبا مکان جو کچھ دیر پہلے زندگی کو اپنے آنچل میں چھپا رہے
 بیٹھا تھا۔ اُسکے اندھیرے کمروں میں جو انہاں مچلا کرتی تھیں۔

اُس کے آنگن میں بچپن کھیل کر تاتھا اور بوڑھا پادہلیز کا سہارا
لے لئے پھر تاتھا۔۔۔۔۔!

اُس نے غور سے مکان کو دیکھا۔ چھت پر بکھرے برتن واضح
ہو گئے۔ شاید گھر کے لیکن ان کو سیلاب کی تیزی میں نہ بچا سکے
مکان گھر جائیگا اور یہ سب۔۔۔ انسان کی محنت و مشقت۔۔۔
خون پسینہ سیلاب کی تہ میں غرق ہو جائے گا۔ غیر ارادی
طور پر اُسکے ہاتھ برتنوں کیڑوں کو سیننے کے لئے بڑھے۔
کیڑوں کے نیچے اُس کو ایک لکڑی کا چھوٹا سا صندوق ملا۔ صندوق
میں تالا پڑا تھا۔ اُس نے صندوق اٹھا کر ہلایا۔ کھٹکھٹاہٹ کی ہلکی
آواز خاموش فضا کو چیر کر اُسکے ذہن میں اودھم مچانے لگی کشتی
ڈانوا ڈول ہو گئی۔ چشم زدن میں وہ سیلاب کو سنبھلا بیٹھا صندوق
کو سینے سے چٹا کر اُس نے کشتی چھت سے الگ کر دی اور گھر
کی طرف ہو لیا۔ بڑھ پھٹ رہی تھی۔

گھر کی چار دیواری میں جب اُس نے کندھے پر سے صندوق
اور کیڑے فرش پر رکھ دیئے۔ تب سبرا اور بڑھیا کو یقین
آ گیا کہ اُسکے کندھے پر کوئی لاش نہیں۔ بڑھیا برتنوں کیڑوں
کو پر کھنے لگی اور سبرا صندوق کا تالا توڑنے کی کوشش کرنے لگا۔
برتن تانبے کے بنے تھے اور کیڑے بھی زیادہ اچھے نہ تھے
پانی میں لت پت پت پت کیڑوں کی طرح لگ رہے تھے۔ لیکن جب
سبرا نے تالا توڑ کر صندوق کا ڈھکن اٹھایا تو رجمان بھی اپنی
سارہی خٹکن بھول کر صندوق کا جاتزن لینے پر مجبور ہو گیا۔

صندوق میں بھر کیے تھے سب سے سارے کپڑوں کے ڈھیر کے نیچے
چاندی کے گول گول روپے تھے۔ نبرا کے کانپتے ہاتھ چم چم
کرنے روپوں کو چھونے لگے۔ ٹٹولنے لگے۔ شاید سو روپے تھے
یا شاید پانچ سو روپے تھے یا شاید ہزار روپے تھے برحمان
کی گنتی جواب دے سکتی۔

”کہاں۔۔ کہاں۔۔ کہاں سے ملا یہ صندوق۔۔۔؟“ نبرا کے
منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

”پانی میں بہہ رہا تھا میں نے پکڑ لیا۔۔۔“ رحمان نے دور
اندیشی سے کام لے کر جھوٹ بول دیا۔

”کتنے روپے ہیں۔۔۔۔“ بڑھیا کے ہچے میں ڈھیروں حرص
تھا۔ نبرا چونک پڑا۔ اس نے جھٹکے سے صندوق کا ڈھکن بند
کر دیا جیسے بڑھیا کی حرص نکا ہوں سے روپوں کو او جھل
رکھنا چاہتا ہو۔ اور ترش لہجے میں جواب دیا۔

”گین لینگے بعد میں۔۔۔۔۔“ یہاں سے چلنے کی تیاری کروڑ۔ اور
بڑھیا کو مایوسی ہوئی۔ بیٹے نے روپے پائے۔ یا پ نے رکھ
لئے۔ وہ سب کون کتنی آنکی جو اسکی کبھی کوئی پرواہ کرتا۔

”ابھی میں ایک پھیر اور لگاؤں۔ تب جائینگے“ رحمان نے کہا۔

”کیوں۔۔۔۔“ بڑھیا نے یونہی بوچھڑ لیا۔ اس کا ذہن ابھی
بھر کپڑوں میں اُلجھا ہوا تھا جو شاید کسی نے لڑکی کے بیاہ کے لئے
بنوا رکھے تھے اور چھولی کا بھی بیاہ کرنا تھا۔

”ماں۔۔۔۔۔ یہی تو وقت ہے کمانے کا۔ شاید کچھ اور مال سے۔۔۔۔“

”رحمان کے جواب نے سبر کو بولنے پر اُکسایا۔
 ”ہاں رحمان... ٹھیک ہے ایک پھیرا اور لگاؤ“
 پر بڑھیا نے نہ رہا گیا۔ اور ماں آتے یا نہ آتے اُسکی بلا سے۔
 اتنے سارے روپے پا کر بھی بوڑھے کا پیٹ نہ بھر پایا۔
 لالچی... گستا...

پانی اور چڑھ آیا تو نکلنا مشکل تھا۔
 ”بیٹا کہیں پانی مکان تک آگیا تو.....“
 ”پانی اب اور نہیں چڑھے گا تاں۔ تم ڈرو نہیں۔ تم ذرا
 کھانا پروس دو۔ بڑی بھوک لگی ہے“ رحمان کے پیٹ میں
 واقعی بھوک اودھم مچا رہی تھی۔ رات کو جھگڑے کے
 باعث گھر گھر نے کچھ نہ کھایا تھا۔ اور کھانا پکا یا با بسی
 ہو گیا تھا۔

ایک بار اور جب اُس کی ناؤ گاؤں کے بیچ پہنچ گئی۔
 تو سورج کی کرنیں اپنے نفرتی بازوؤں سے سیلاب کو ٹٹول
 رہی تھیں۔ سیلاب کی سطح پر گھاس پھوس اور لکڑی کے
 ٹکڑے سرگرداں تھے۔ کہیں کوئی کپڑا بھی بہتا ہوا حد نظر
 میں آجاتا اور رحمان کی ناؤ کپڑے کا رخ کرتی۔ لیکن بے غائیہ
 اس نے کئی کپڑے پر کھ لے اور سیلاب کے حوالے کر دے
 صندوق میں بھڑکیے نئے کپڑوں کے سامنے ان چنیمڑوں کی
 اہمیت کوئی زیادہ نہ محسوس ہوتی۔ اگر کسی چیز کی اہمیت
 اُسکے ذہن میں تھی تو وہ مکانوں کی چھتیں تھیں جہاں بٹا پد

کسی اور نے اپنے ارمان اکٹھے رکھ چھوڑے ہوں۔ لیکن
 گاؤں بھر میں کسی چھت کا نشان باقی نہ رہا تھا۔ جیسے یہاں
 پہلے گاؤں نہ تھا۔ زندگی کا گہوارہ نہ تھا۔ بلکہ ازل سے
 یہ مردہ جھیل گھسٹری تھی جسکی کوئی تہ ہی نہیں۔
 جھیل کی سطح کہیں کہیں درختوں نے چھوڑ رکھی تھی۔
 اکثر درخت اکھڑے اکھڑے سے لگ رہے تھے جیسے اب
 گرے۔۔۔۔۔ اب گرے۔

جی چاہا گھر کی جانب چل دے۔ لایع کہیں اُسے بھی نہ لے
 ڈوبے۔ وقت گزرتا جا رہا تھا اور پانی پڑھتا جا رہا تھا۔
 ارد گرد ماحول میں عجیب سی بے دردی گھلی ہوئی محسوس
 ہوتی۔ اُسکو وحشت ہونے لگی۔ لیکن ایک کالے کپڑے کی
 گھسٹری نے اُس کا دھیان بٹا دیا۔ جو درختوں کے جھنڈ میں
 چھپی ہروں کے زیر و بم پر ہلکے ہلکے ڈول رہی تھی۔ کیا
 معلوم اس گھسٹری میں بھی کوئی ضد و قیاس پڑا ہو۔
 اُس کے بازوؤں میں وحشت سما گئی۔ ناؤ تیزی سے آگے
 بڑھ گئی۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کر پاس آتی ہوئی گھسٹری کو
 پکڑنا چاہا۔ کراہت کی شدید لہر اُس کے بدن کو ڈبو گئی۔
 کوئی مردہ گاتے تھی۔ بھلا کیا فائدہ تھا یوں سرگرداں
 رہنے سے۔۔۔۔۔ پریشان ہونے سے۔ پانی اپنا کام کر گیا تھا
 واپس جانا ہی عقلمندی کی نشانی تھی۔
 اُس کو ناؤ موڑنے کی ہمت نہ ملی۔ درختوں کے

جھنڈ کے پرے کسی ناؤ کی نوک ابھر رہی تھی یا شاید اُس کی اپنی ناؤ کی پر چھائیاں ابھر رہی تھیں۔ یقین نہ آتا تھا کہ اس پہلی موت میں کہیں۔ زندگی بھی پہرہ رہی ہوگی۔ اُس نے اپنی آنکھوں کو مسلا.... واقعی ایک بڑی ناؤ اُسکی طرف آرہی تھی۔ گھبراہٹ کے مارے اُس کا دل بلیوں اُچھلنے لگا۔ ناؤ پاس پہنچ گئی تو اُس نے ناؤ میں بیٹھے کئی افسر پہچان لئے۔

”ناؤ والے... ادھر آؤ... کیا نام ہے تمہارا ایک افسر نے با رُعب لہجے میں پوچھا۔

”رحمان.... رحمان شالہ... اُسکی گھبراہٹ دور نہ ہوئی۔ جیسے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہو۔

”لکھوجی.... نام رحمان شالہ... سیلاب ڈیوٹی، افسر نے ناؤ میں پڑھی سیب کی پیٹی میں سے ایک لال سیب پختے ہوئے کہا۔

”دو اور سرسیر۔ اس ناؤ پر لپٹ شیڈ بڑ چار پر جاؤ،

دو آدمی اٹھ کھڑے ہوئے اور احتیاط سے اُسکی ناؤ میں آگئے تب رحمان کو یقین ہوا کہ افسروں نے اسے مردہ گائے کو ٹوٹے نہیں دیکھا ہے۔ ویسے شاید بڑی ناؤ میں پڑھی سیب کی پیٹیاں بھی ایسی سیلاب کے بدولت شامل ہوتی ہوں۔ اُسکی ہمت بلند گئی۔

”صغور میرا اپنا مکان ہے۔ سامان ہے... لوگ ہیں... میں... میں۔

”کہاں ہے تمہارا مکان....“ افسر نے ایسے پوچھا جیسے یقین

نہ آ رہا ہو کہ سیلاب نے کسی مکان کو کھڑا رہنے دیا ہوگا۔

”وہ جناب... وہ ٹیلے پر... وہ جناب ذرا درختوں کی آڑ میں۔

”رحمان نے ہاتھ سے اشارہ تو کیا لیکن مکان دکھائی نہ دیا۔
درختوں کی گھنٹیوں نے اُن کی نگاہوں کو روک لیا۔ اور
افسر نے کہا۔

”ٹیلے پر مکان ہے تو محفوظ رہیگا۔ سرکاری سامان کی حفاظت
زیادہ ضروری ہے۔“

افسر کے الفاظ نے رحمان کے تن و بدن میں آگ سی لگا دی۔
جیسے اُسکے گھر والے گوشت پوست کے نہیں کیچڑ گارے کے
بنے تھے جو پہ گئے تو نئے بنائے جاسکتے ہیں۔ عجیب منطق تھی ان
افسروں کی۔ رات کو پیکچروں میں لوگوں کو دھوکے میں رکھا
کہ سیلاب نہیں آئے گا۔ کیونکہ بندھ بنائے گئے ہیں۔ اب جب سیلاب
نے سب بندھ توڑ پھاڑ کر بھاگنے کے سارے راستے محدود
کر دئے تو حکم ہوا رہا ہے۔ کہ سرکاری سامان کی حفاظت زیادہ
ضروری ہے۔ تاکہ جو لوگ سیلاب کے پہلے ریلے میں بچ رہے ہیں
وہ بھی بچہ باتیں۔ ویسے وہ کوئی سرکاری نوکر نہ تھا۔ سرکار نے
اسے کوئی عہدہ... کوئی نوکر ہی یا کوئی ٹھیکہ نہ دیا تھا۔ کوئی آسائشی
ہیجان نہ تھی کہ وہ سرکار کا ٹیک خوار، خیر خواہ بن کر اپنی جان دُور سے
میں ڈال دے۔ آرام سے بیٹھ بھی نہیں دیتے یہ لوگ۔ جی چاہا چلا
چلا کہ اس بے باز یادتی پر احتجاج کرے لیکن بڑی ناؤ آگے
برہمگئی تھی اور ناؤ کی جگہ گھومتے پانی کے ہلکے رے اُسکی ہزدلی
کا جھنڈ چڑا رہے تھے۔ جھبلا کر اس نے پانی کی سطح پر زور سے چپہ
ماری۔ پانی جھوٹ نہ سہہ کر پلٹ پڑا۔ ساری ناؤ پر میٹالے پانی کی

بوچھاڑ ہوئی ۔

”ارے ... ارے آہستہ ...“ ایک اور سیر نے جھجھک کر کہا ۔
 ”ناؤ چلائی نہیں آتی کیا ۔ کھانے کی ٹوکری کا ستیاناس کر دیا“ ۔
 دوسرا اور سیر غصے سے چلا پڑا اور اُس کا اپنا غصہ کنارے توڑ
 بیٹھا ۔ جی میں آیا ایک بار اور چپو کو پانی کی سطح پر مارے اتنے
 زور سے مارے کہ پانی کی بوچھاڑ ان دونوں اور سیروں کو
 ناؤ میں سے بہا لے جاتے ۔ لیکن اُس نے چپو کو پانی کی سطح پر نہ مارا ۔
 ناؤ میں دو اور سیر تھے اور دونوں ہٹے کٹے تھے ۔
 طوفان دیکر ہا اُس نے ناؤ کا رخ دریا کی طرف موڑ دیا ۔
 بمب شید منبر چار دریا کے دوسرے کنارے پر واقع تھا ۔

چار بج گئے تھے یا شاید پانچ بج گئے تھے۔ سب راہنما جگہ سورج
 کی تیر چھی کر لوں کو دیکھ کر ٹھیک اندازہ لگانے سے قاصر رہا۔
 کسی درخت یا مکان کا سایہ نظر آتا تو شاید وہ سائے کی لمبائی سے
 کچھ کچھ اندازہ لگا پاتا۔ لیکن آج ساتیوں کا نام و نشان نہ تھا۔
 اس پاس ہر چیز پانی میں ڈوب گئی تھی۔ اگر کہیں کسی ایکے کے درخت
 کا سایہ ابھی موجود تھا بھی تو مٹیالے پانی کی سطح پر بالکل نہ دکھائی
 دیتا تھا۔ ہر طرف مٹیالا پانی پھیلے ہوا تھا۔ کھیت ڈوب گئے تھے۔
 مکان ڈوب گئے تھے۔ پتے کہ ٹیلے پر بنے اس مکان کا سایہ بھی چڑھتے
 پانی میں مدغم ہو گیا تھا۔ صرف دور... بہت دور ہا جن پل کی پکی
 منڈیر کالی ٹیکسری دکھائی دے رہی تھی۔ یہ ٹیکسری پانی میں مدغم ہو گئی
 تو شاید اسکی نگاہوں کو سہارا دینے کے لئے کچھ بھی باقی نہ رہ جائے گا۔
 پل کی منڈیر تک جانے والی گاؤں کی سڑک کب کی پانی کی گہرائیوں
 میں چھپ گئی تھی۔

غیر ارادی طور پر اس کی نگاہیں مکان سے کچھ دور چڑھتے پانی

کے کنارے پر مرکوز ہو گئیں۔ پانی کا کنارہ سورج کی ترچھی کیرنوں میں کسی تیز دھار چاقو کے پھل کی طرح چمک رہا تھا اور دھیرے دھیرے زمین کا سینہ چاک کرتا جا رہا تھا۔ ذرا دیر کی اور بات تھی پانی کا کنارہ بڑھتے بڑھتے مکان پر یورش کرے گا۔ ریس ریس کر مکان کی بنیادوں کی سختی چوس لے گا۔ پینا دکھو کھلی ہو کر مکان کا بوجھ نہ سہہ سکے گی۔ مکان گر جائے گا اور وہ بھی گر جائیگا۔ اُس کے بازوؤں میں چھپا ہوا لکڑی کا چھپوٹا سا صندوق بھی گر جائے گا جس صندوق میں ایک ہارے ہوئے جوارہ کی طرح اُس نے آخری بونجی رکھ لی تھی۔ بڑے ارمانوں سے اُس نے صندوق چھپا رکھا تھا۔ بڑے ارمانوں میں ڈھکا رکھا تھا اُس نے یہ صندوق۔ لیکن یہ بے حس پانی شاید اُسکے ارمانوں کو چوس کر اس صندوق تک بھی پہنچ جائے گا۔ اس صندوق کو بھی اپنی پریسٹ میں لے گا۔ محسوس کرتے ہی وہ آپ ہی آپ جھنجھلا اٹھا۔ یہ سیلاب نہ ہوتا۔ کھونچال ہوتا تو شاید دوڑ دھوپ کرنے سے جان بچ جاتی۔ کھونچال نہ ہوتا آگ ہوتی تو بھی جل جھلس کے راستہ بنا ہی لیتا اور جو کہیں گر بھی جاتا تو کشمکش کی ہوس باقی نہ رہتی۔ پر یہ مٹیالا پانی..... دھندلا دھندلا پانی..... نہ کوئی روک تھی اس پر اور نہ اس سے لڑا جاسکتا تھا۔ دروازے کی چوکھٹ پر بیٹھ کر اس بڑھتی موت کو بے بسی سے گھورنے کے سوا کوئی کر بھی کیا سکتا ہے۔

”رجمان کا کہیں پتہ چلا.....“ کسی کی آواز نے اسکی بے بسی کو لٹکارا۔ اُس نے گرے دن موڑی۔ بڑھیا اتنا نزدیک پہنچ گئی تھی

کہ لال پیرن کا جھول صندوق کی نوک سے اٹھجا محسوس ہوتا تھا۔
اُس نے صندوق کو زور سے ستھام کر کہا۔

”نہیں... کہیں دیکھاتی نہیں دیتا۔“ آواز میں جھلا کی تھکن تھی
جیسے وہ اپنے بیٹے سے بالکل مایوس ہو گیا ہو۔

”پھر...۔۔۔ بے اختیار بڑھیا کے منہ سے نکلا۔

”پھر....“ اُس نے دہرایا۔ جھلا اس پھر کا کیا جواب ہو سکتا
ہے۔ پھر وہ شہر میں اپنی کشتی بچانے سے تو رہا۔ پھر وہ بڑھپے
سیلاب کو روکنے سے تو رہا۔ پھر وہ بیٹے کو موت کے منہ سے واپس
بلانے سے تو رہا۔ اُسکی آنکھیں پھر آئیں۔ لیکن بڑھیا کے سامنے رونا
معیوب تھا۔ وہ بڑھیا کو نظر انداز کر کے کمرے کی طرف پلٹ پڑا۔
بچھولی کمرے کی دیوار کے ساتھ بیٹھے بیٹھے سو گئی تھی۔ سر

گھٹنوں میں چھپا پڑا تھا۔ بال آوارہ ہو کر ٹانگوں پر پھیلے لحاف
پر بکھرے ہوئے تھے مگر دن تنگی تھی۔ ساری گردن میل سے اٹی
پڑی تھی اور بڑی تڑپ لگ رہی تھی سیلاب کچھ ادر بڑھ جائے
تو اس گردن کا میل بھی ڈھل جائے گا۔ گردن سے سرک کر نگاہیں
کمرے کا جائزہ لیتی رہیں۔ فرش نئی چٹائیوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ایک
چٹائی پر چھوٹی سی درمی بچی پڑی تھی۔ درمی کے کنارے دیوار کے
ساتھ ایک نیا بستر لٹا پڑا تھا۔ اُسکے بیٹے کا بستر.... اُسکے دل میں بے
انتہا درد اُبھر آیا۔ شاید یہ نیا بستر لٹا لٹا یا سیلاب کی نذر ہو جائیگا۔
رنگین درمی کا ہر رنگ دھندلا جائیگا۔ میٹا لاپانی اس درمی کا ہر رنگ
چاٹ جائے گا۔ میٹا لاپانی اور میٹا لاپا ہو جائیگا۔ اور اُس کی اپنی نگاہیں

مٹیالی ہونے لگیں۔ جیسے مٹیالے پانی کی ساری دھند لاہٹ اُسکی
نگاہوں میں سما گئی ہو۔

نگاہیں دھند لی سہمی سپر کرے کا بائزہ لینے سے نہ رُک سکیں۔
وہ بدستور کمرے کے کونے کونے کو ٹولتی رہیں۔ لالٹیں اپنی جگہ پر تھکا۔
سمادار اور چینی کے پیالے اپنے مخصوص کونے میں بکھرے پڑے تھے۔
دروازے کی چوکھٹ میں بڑھیا کسی بے جان تصویر کی طرح ٹنگی
ہوتی لگتی تھی۔ بڑھیا کے سامنے دروازے کی چوکھٹ کے ذرا
ایک طرف اُسکے اپنے بھیکے جوتے تھے۔ اپنے بھیکے جوتے دیکھ کر
اُس کا پریشان ذہن آگے سرکنے لگا۔

وہ کہاں جا رہے ہو۔۔۔۔۔ دروازے کی چوکھٹ میں ٹنگی تصویر
بول پڑی اور وہ جوتے پہننے لپٹا گیا۔ سبلا کہاں جا رہا تھا وہ؟
کہ صبر جا رہا تھا وہ؟ بڑھاپے کی آخری گھڑیوں میں اب کونسا
کام باقی رہ گیا تھا۔۔۔۔۔

ماضی کے دھند لکوں میں پریشان ذہن نے ڈبکی تو لگائی لیکن
اُسے کوئی کام ایسا نہ ملا جو باقی رہ گیا ہو۔ اُس نے کہا یا تھا۔ کھایا
تھا۔ شادی کی تھی۔ چھ بے لیا تھا۔ بیج بویا تھا۔ اور بیج کو پروان -
پہڑھنے بھی دیکھ پائے تھا۔ اپنی ٹوٹی سپوٹی کشتی میں زندگی کے سب کنارے
گھوم آیا تھا۔ محبت کا اتار چڑھاؤ بھی دیکھ آیا تھا اور نفرت کے گرداب
بھی۔ اب جو یہ چند گھڑیاں باقی رہ گئی تھیں تو بڑھیا ملک الموت
کی طرح اُس کا راستہ روکے کھڑی تھی۔ اپنے ساتھ ان ڈراڈنے
دھند لکوں میں گھسٹ رہی تھی اُسکو غصہ آگیا۔ اُس نے خاموشی سے

کشتی سیلاب میں نہ ڈوب جاتی اگر وہ یہاں نہ آتا اور شاید وہ یہاں
 نہ آتا اگر رحمان یہاں نہ رہتا۔ شاید رحمان یہاں نہ رہتا اگر وہ
 خود رحمان کو نہ روکتی شاید وہ رحمان کو کبھی نہ روکتی۔ اگر وہ زندہ
 نہ رہتا پابندی۔ شاید..... شاید زندہ رہنا بذاتِ خود ایک گناہ ہے۔۔۔
 ... بہت بڑا گناہ۔

ٹھیک کہتے ہوں تم.... بالکل ٹھیک کہتے ہوئے بڑھیا کی آواز نہ
 نہ گنتی "میں ہی ساری مصیبت کی بڑھ ہوں۔ میں اسی قابل ہوں
 کہ سیلاب بہا لے جاتے۔ پر اس معصوم جان کا کیا ہوگا۔۔۔ میری پھولی
 کا کیا ہوگا۔"

پھولی باگ گنتی تھی اور انکی گفتگو سننے میں محو تھی۔ سب کی
 نگاہیں اپنے اوپر پاکر وہ گھبراہٹ مانی گئی۔ مارے شرم کے اُس نے سر جھکا
 لیا اور سبرا کے ذہن میں عجیب سا خیال کو نہ گیا۔ رحمان کی دُہن ہوتی
 تو شاید وہ بھی سمر کی نگاہوں کے سامنے شرم سے ایلجہ ہی سر جھکا
 لیتی جیسے پھولی اپنے سر کو جھکا رہی تھی اور اُسکا در دِ پیر اٹھا۔۔
 "تمہاری بیٹی نے ہی تو میری دنیا برباد کر دی۔ یہ بھی مر جائے
 تو میرا دل کھٹکا ہو جائے گا۔"

بکوقت۔۔۔ بوڑھے درندے.... "بڑھیا بکلی کی طرح تڑپ
 اٹھی۔ ایک ماں چاہے اُسکا بچہ کتنا ہی بُرا ہو۔ اپنے بچے کے متعلق
 گالیاں کیسے سہہ سکیں گی میں تمہاری زبان کھینچ لوں گی.... بڑھیا چیخنے لگی۔
 وہ اور بوڑھا درندہ۔۔۔ سبرا کی کنپٹیوں پر چنگاریوں کی تیز
 بوجھاڑ سی ہوتی۔ بڑھیا شاید اپنے آپ کو پری سمجھ بیٹھی تھی۔

”راستہ چھوڑ دو بڑھیا کی بچی ورنہ مجھ سے بُرا کوئی نہ ہو گا۔“
نبرا نے دھمکی دی۔

”نہیں چھوڑتی راستہ... کیسے کہتے...“ (بڑھیا دھارٹی)۔

نبرا نے بڑھیا کے بدن کو دروازے کی چوکھٹ میں پھیلانا
ساحسوس کیا۔ وہ گھبرا گیا۔ کہیں یہ بدن پھیلنے پھیلنے سارے دروازے
کو ڈھانپ نہ دے پھر تو راستہ پانا مشکل تھا۔ کچل تک پانی آگیا تو آخری
راستہ بھی مسدود ہونے کا خطرہ تھا۔ کوئی چارہ نہ تھا بڑھیا کو
زبردستی دروازے سے ہٹانے کے لئے... کوئی چارہ نہ تھا۔!

لمحہ بھر کے لئے بڑھیا سکڑ سی گئی۔ صدیوں بعد کسی مرد کا ہاتھ
اُس کے بدن سے مس ہو گیا تھا۔ لیکن دوسرے لمے شرم کو بالاتے
طاق رکھ کر وہ زخم خوردہ شیرنی کی طرح نبرا پر ٹوٹ گئی۔ کمرے
میں گالیوں اور پیچوں کا سیلاب ٹوٹ پڑا اور پھولی نے زور زور
سے رونا شروع کر دیا۔ نبرا چکر اٹھا۔ آج اُسے محسوس ہوا کہ نا تجربہ
کار رحمان اس بڑھیا کے سامنے بے بس ہے وہ خود تجربہ کار ہو کر
اس بڑھیا کے سامنے بے بس ہو رہا تھا ایسے لپٹی پڑی تھی جیسے جونک
لیٹ پڑی ہو۔ اور لمحہ بہ لمحہ زور بخور مٹی جا رہی ہو کشتکش تو درکنار
کھڑا رہتا مشکل ہو رہا تھا۔ ہار مان لینے میں ہی خیریت تھی۔

”اے جاؤنگا... اے جاؤنگا...“ اُف... اب چھوڑ بھی دے

مال نہ دی۔

”تم چھوٹ کہتے ہو۔ دھوکہ دیتے ہو...“ (بڑھیا چیخی لیکن
اپنی گرفت ڈھیلی نہ ہونے دی۔ نبرا کو محسوس ہوا کہ بیٹے کی جان

لے کر اب بڑھیا اُسکی جان بیٹے پر تل گئی ہے۔ اپنی حالت پر وہ بل کھاکے رہ گیا۔

”اللہ قسم سچ کہتا ہوں..... اب چھوڑ بھی دے مال زرا دی“
 بڑھیا نے اللہ کے بھروسے اُسکو چھوڑ دیا لیکن دروازے کو بدستور روکے رہی۔ پریشان بالی... سُرخ چہرہ... اُبلتی آنکھیں... کپکپاتے ہونٹ... کمرے کے ملگجے میں بیڑھیا ہو بیڑا بن گئی رہی تھی۔

”لے جاؤنگا۔ تم دونوں کو لے جاؤنگا۔ پہلے پھولی کو لے جاؤنگا بعد میں تمہیں لے جاؤنگا۔“ سنبر اکا دل الفاظ کے جانے میں خون بن بن کہہ نکل رہا تھا۔

”ٹھیک ہے۔ لیکن جب تک تم پھولی کو پار نہیں پہنچاؤ گے تب تک روپیوں کا صندوق نہیں چھوڑ جانا ہوگا۔“ بڑھیا نے ناگ کی۔
 ”کیوں...“ سنبر نے بدکنا چاہا لیکن آواز نے سامنے نہ دیا۔ آواز سینے کے زیر و بم میں ڈانوا ڈول سنی۔

”کیا معلوم تم پھولی کو راستے میں ہی چھوڑ کے سبھاگ جاؤ گی“
 بڑھیا نے کہا اور سنبر اکا جی چاہا ایک بار اور بڑھیا سے چمٹ پڑے۔
 بڑھیا کی ہڈی ہڈی توڑ دے۔ بڑھیا ڈائیں نہ تھی بلکہ ڈائیں سے بھی برتر۔
 ”اُس کی زبان کہنے سے قاصر تھی۔“

”یقین رکھو۔ میں پھولی کو راستے میں نہیں چھوڑ جاؤنگا“ سنبر نے بے بس ہو کر کہا۔ بڑھیا سے چمٹ پڑنا آسان تھا لیکن چمٹکارا پانا مشکل...!

”مجھے تم پر بھروسہ نہیں۔ پھولی کو پہنچا کر تم واپس آکر صندوق لے جا سکتے ہو۔“

بڑھیا کا جواب سن کر نبرا سے رہا نہ گیا۔ اُس نے پھولی کی ”اور جو پھولی کو چھوڑ کر تمہیں یہیں چھوڑ جاؤں تو.....“

”مجھے اپنی پرواہ نہیں۔ تمہارا سہارا لینے کی بجائے میں مرجانا پسند کر دیتی“ بڑھیا کی آواز میں غضب کی نفرت تھی۔ نبرا کسمسا کر رہ گیا۔ مرجائے بڑھیا۔ اُس کی بلا سے۔ صندوق تو کہیں۔ لے جانے سے رہی۔ ناحق بات کو طویل دے کر وقت ضائع کرنے سے فائدہ۔ پانی مکان کے بالکل نزدیک آگیا تھا۔ اور صندوق لانے کے لئے دوسرا پھیر ابھی کرنا پڑے گا۔

”ٹھیک ہے۔ دوسرے پھیرے میں میں صرف صندوق لے جاؤں گا۔ تمہیں نہیں..... منظور ہے۔“

”ہاں..... ہاں منظور ہے۔ لے جاؤ پھولی کو.....“ بڑھیا نے کم بھارت اور اُس نے پیٹھ جھکالی۔

پھولی کو نبرا کی پیٹھ پر چڑھ جانے پر آمادہ کرنے میں اور وقت ضائع ہو گیا۔ جتنے پانی مکان کی بنیاد تک پہنچ گیا۔ وہ تو بڑھیا نے جھاڑ جھپٹ کے پھولی کو نبرا کی پیٹھ پر گھمڑی کی طرح لا دپیٹ دیا ورنہ پھولی شرم دیا سے سن ہوئی جا رہی تھی اور ایک بے جان گھمڑی کی طرح نبرا کی پیٹھ سے پھسل پھسل رہی تھی۔ نبرا کو پھولی سنبھالنے میں بڑی دقت پیش آئی اور وہ ماں بیٹی کا موانہ نہ کئے بغیر نہ رہ سکا۔ ایک بیٹی تھی جو سیلاب کے

خطرے کو نظر انداز کر کے مارے جیا کے غیر مرد کی پیٹھ پر چڑھنے سے اعتراف کر رہی تھی اور ایک ماں سستی جو اپنی بیٹی کو غیر مرد کی پیٹھ پر لادنے پر تیل کھتی تھی۔ شاید بڑھیا نے پھولی کو زبردستی رحمان کے گلے منڈھ دیا تھا ورنہ پھولی اتنی جرات نہ کرتی !

اس کے دل میں پھولی کے تئیں خواہ مخواہ رجم سا پیدا ہو گیا۔

اس نے پھولی کو اپنے بچے کی طرح سنبھال کر پار پہنچایا۔ راستے میں نہ زیادہ دشواری پیش نہ آئی کیونکہ دریا اور سڑک کے درمیان مٹی کا بندھ ابھی رکھا ہوا تھا۔ صرف کہیں کہیں دریا کا پانی چھوٹے چھوٹے شگافوں میں سے فواروں کی طرح سڑک پر پھیلا پانی میں گہرا رہا تھا۔ سڑک پر گھٹنوں گھٹنوں پانی تھا۔ چاروں طرف پانی اتنا زیادہ تھا کہ کھیتوں کی اونچی منڈیریں اور سڑک کی منڈیر پانی کی آغوش میں چھپ گئی تھی۔ شاید دُور کے سب بندھ ٹوٹ آتے تھے ورنہ دُور سے اس سڑک تک میلوں کا فاصلہ تھا اور پانی یہاں تک نہ پہنچ پاتا۔

نہرا کو بوجھ اٹھانے کی عادت نہ تھی تو پھولی کو اٹھا کر لے جانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ ویسے پھولی بھی کچھ زیادہ وزن دار نہ تھی لیکن پار پہنچ کر اُسکو اپنی ساری محنت راتیکاں جاتی محسوس ہوئی۔ پل کے پاس صرف زمین کا ایک چھوٹا سا قطعہ پانی کی دُستبرد سے محفوظ تھا۔ باقی ارد گرد ساری خشکی پر پانی نے بلغار کر دی تھی جتنے کہ ذرا دور واقعہ باجین گاؤں بھی پانی میں شرا ہو رہا تھا۔ ارد گرد نہ نہ گی کا کوئی نشان نہ تھا۔ وہ گھبرا گیا۔ کہیں سڑک اور دریا کے

بیچ بندھا بندھ لوٹ گیا تو دریا اپنا اعلیٰ راستہ چھوڑ کر کھیتوں کے
 بیچ میں سے دُور کی اور لپکنے لگے گا اور سڑک بالکل کٹ جاتے گی اور
 صندوق لانا ناممکن ہوگا۔ اُسکو جلدی کرنی چاہیے۔ لیکن بھولی جانے
 بھی توجہ تو۔۔۔۔۔ قیض کے دامن کو کھینچ کھینچ کر اُس سے
 الجھ رہی تھی۔ رور و کر بڑھیا کی جان کا واسطہ دے رہی تھی اور
 قیمتی لمحے ضائع کر رہی تھی۔ جیسے بڑھیا مر گئی تو ساری دنیا مر جائیگی
 ہوں۔ وہ جھنجھلا اٹھا۔ بڑھیا اُس سے الجھ کر قیمتی وقت ضائع
 نہ کرتی تو وہ اس وقت ہاجن گاؤں کی حدود سے پرے نکل گیا ہوتا۔!
 اُس نے قیض کے دامن سے بھولی کا ہاتھ چھڑانا چاہا۔ جھٹکا
 لگا اور دامن پھٹ گیا۔ اُسکو بے انتہا غصہ آگیا۔ زور کا دھکا دے کر
 بھولی کو زمین پر گرادیا اور خود واپس لوٹ پڑا لیکن راستہ سمجھ رہے
 اپنی حرکت پر ناام رہا۔ بڑا بہادر تھا نا وہ۔۔۔۔۔ جو ایک مریل سی
 بیمار لڑکی کو زمین پر گرانے میں کامیاب ہو گیا۔ بڑھیا موجود ہوتی
 تو بھولی کو دھکا دینے سے پہلے وہ لمحہ سمجھ کے لے کر رک جاتا
 شاید ٹھیک کہا تھا بڑھیا نے کہ وہ انسان نہیں درندہ ہے درندہ
 جو کمزوروں پر زور آزمائی کرنے سے نہیں چوکنا۔۔۔۔۔ درندہ۔
 .. بوڑھا درندہ۔۔۔۔۔ درندہ نہ ہوتا تو بڑھیا کو سیلاب میں چھوڑ
 جانے کا جتن نہ کرتا۔ درندہ نہ ہوتا تو ایک بیمار بچے پر ہاتھ اٹھانے
 سے کتراتا۔۔۔۔۔ درندہ نہ ہوتا۔۔۔۔۔ درندہ نہ ہوتا۔۔۔۔۔ سیلاب کا شور
 بیچ بیچ کر اسکے کانوں کے پردے سے اڑ رہا تھا۔ ندامت کی شدت
 سے اُسکا وجود کھسکھس کر اٹھنے لگا یا شاید پانی کی تیزی اسکے وجود کو

مقرر مقررانے پر مجبور کر ہی تھی۔ بندھ کے شکاف سیلاب کی تاب نہ لا کر بڑھ رہے تھے اور فوارے آبشاروں میں تبدیل ہو رہے تھے۔ بندھ سکی مٹی پانی کے زور سے ہی جارہی تھی۔ اور سرگ پر پھیلنا پانی گھٹنوں کو جکڑے جارہا تھا۔

مکان کے پاس پہنچ کر اُسکے وجود کو جھٹکا سالکا۔ پانی اتنی ہی دیر میں مکان کے اندر پہنچ گیا تھا۔ کیا مکان پانی کے پہلے ریٹھ نے ہی بیڑ بھا کر دیا تھا۔ نزدیک جاتے ہوئے ڈر سالگ رہا تھا۔ ہمیں گریہ گیا تو روٹیوں کے صندوق کے ساتھ ساتھ اُس کی جان تک کا خطرہ تھا۔ لیکن بیڑ سے دروازے کی دہلیز پر بیٹھی بڑھیا کو دیکھ کر اُسکا ڈر کچھ کچھ ڈائل ہو گیا۔

بڑھیا پانی سے بچنے کے لئے دہلیز پر اکڑوں بیٹھی تھی۔ پاس ہی دہلیز پر روٹیوں کا صندوق چادر میں لپیٹا لپیٹا یا رکھا تھا۔ پانی دہلیز کی اونچائی کو چھونے لگا تھا..... بڑھیا لگا تھا اور صندوق پر لیٹی چادر کے لٹکتے کونوں کو پاٹ رہا تھا۔ اُس نے صندوق اٹھا کر ہلایا۔ یقین نہ تھا کہ بڑھیا باہرے جن کے صندوق میں روٹے رہتے دیگی۔ لیکن صندوق میں سے ہلکی سی گھٹنا جھٹ نے اُسے اچنبھے میں ڈال دیا۔ اُس نے بڑھیا کی طرف دیکھا۔ کیا معلوم بڑھیا اُسے روک دے.... اُسکی منت مانگے اُسکے سامنے گر گر گرتے۔ لیکن بڑھیا نے کچھ نہ کیا۔ اُسکے وجود سے بے نیاز وہ پانی کی سطح کو ایسے گھور رہی تھی جیسے اپنی نگاہوں سے پانی کی بڑھتی سطح کو اور بڑھنے سے روک رہی ہو۔ پانی کی سطح پر کسی گھر کی ٹوٹی کڑی بہتے گھاس بھوس میں

آکھی سرگرداں تھی۔

”بھولی کو پہنچا آیا ہوں اور اب میں جا رہا ہوں۔۔۔۔۔ اُس سے کہے
نہ نہ رہا گیا۔ بڑھیا کی خاموشی بے اعتنائی۔۔۔ بھولی کی چیخ و پکار عورتوں
کے موثر ہتھیار تھے اور وہ مرد ہونے کے ناطے جانتا تھا کہ کسی مرد کو
ان ہتھیاروں کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں۔ ورنہ مرد نے عورت کا
خاتمہ صدیوں پہلے کیا ہوتا۔ عورتیں مکار تھیں۔ حرامزادیاں۔۔۔۔۔!“

”خدا کے حوالے۔۔۔۔۔“ بڑھیا نے ہولے سے جواب دیا اور نمبر کی
حیرانی کنارے توڑ بیٹھی۔ جی میں آیا کہ ایک لات مار کر بڑھیا کا سبھرم
چھوڑ چور کر دے۔ دہلیز پر یوں بیٹھی تھی جیسے کوئی فکر نہیں۔ غم نہیں۔
۔۔۔ ڈر نہیں۔

”مکان گیر نہ والا ہے۔۔۔ نمبر اس نے بڑھیا کی بے اعتنائی کا منہ پٹرایا۔
لیکن بڑھیا کی حالت میں کوئی فرق نہ پیدا ہوا۔ اور وہ جھنجھلا اٹھا۔
کاش بڑھیا ایک دفعہ صرف ایک دفعہ اُسکے سامنے جھٹک جاتے۔ ایک
دفعہ اُسکی منت مانگے تو قسم اللہ کی۔۔۔ وہ اپنی جان دے کر بھی بڑھیا کو
اس بڑھتے موت کے چنگل سے نکال لے گا۔ کاش۔۔۔ لیکن بڑھیا کچھ کہے
تو۔ جواب دینے کی زحمت بھی نہ کی حرام زادی نے اور وہ آپ ہی
آپ جل اٹھا۔

”میں کہہ رہا ہوں مکان گیر نے والا ہے۔ بہری ہو کیا۔۔۔ دب جاؤ
گی؟“ وہ طلق سچاڑ کر چبھا۔

بڑھیا نے جواب دینے کے بجائے اُسکے سراپا کا ایسی نگاہوں سے
جائزہ لیا کہ نمبر کو اپنا آپ تنگ ہوتا محسوس ہوا۔ ماں زادی۔۔۔۔۔

.... حرامزادی.... کہینی.... ڈائیں۔ وہ پاگل ہو گیا۔ سارے بدن میں وحشت کو لند گئی۔ ہاتھ بجلی کی طرح آگے بڑھے اُس نے بڑھیا کو کھینچ کر پانی میں کھڑا کر دیا۔ بڑھیا چیخی.... چلائی لیکن اُس نے اپنی گرفت ڈھیلی نہ کر دی۔

”مال زادی.... خنجر سے کرتی ہے۔ خود تو مر کر چھٹکارا حاصل کر لو گی بھولی کو کون سنبھالنا پھرے گا۔ پل پار اپنی بیٹی کے پاس پھر جا ہے مر یا زندہ رہ.... میں تجھے یہاں نہیں چھوڑنے کا۔ نبرانے اپنی کزداری کو بھولی کے کمزور وجود میں چھپانا چاہا۔

بڑھیا نے عاجزانہ اپنے رہے سہے دانت اُس کے ہاتھ پر کھاڑ دیے۔ یہ بوڑھا درندہ ایسے کھینچے جا رہا تھا جیسے کسی لاش کو کھینچ رہا ہو۔ لیکن نبرا غافل نہ تھا۔ اُس نے ہاتھ چھڑا کر ایک زور کا جھانپٹ بڑھیا کے کھال پر مارا اور بڑھیا کا ذہن جھنجھلا اٹھا۔ شاید اُسکا مرحوم ناولد بھی غصے میں اُسکو ایسے ہی جھانپٹ مارا کرتا تھا۔ بڑھیا نے سوچنا چاہا.... یاد کرنا چاہا۔ پیرا اُسکو مہلت نہ ملی۔ نبرا اُسکے بدن کو بڑی بے دردی سے گھسیٹتا جا رہا تھا۔

”تم لے چلنا ہو گا مال زادی.... چاہے مجھ کو نہیں گھسیٹ کر ہی کیوں نہ لے جانا پڑے۔ میں درندہ ہوں نا.... بوڑھا درندہ.... اب میری درندگی بھی دیکھو۔ کسی مردہ کتیا کی لاش کی طرح گھسیٹ کر لے جاؤں گا.... ہاتھ پیر مارنے سے کوئی فائدہ نہیں۔“

اور بڑھیا کے ہاتھ پیر ڈھیلے ہو گئے۔ کشمکش فضول تھی نبرا کے ہاتھ بڑے سخت تھے۔ کھردرے تھے لیکن اُسکے ہاتھ کھڑاتے وجود کو عجیب سا سہارا دے سکتے تھے۔

سورج کی اچھٹی کر نوں میں دریا بھیا نک نک رہا تھا۔ پانی میں
 ایسے بڑے بڑے پل رہے تھے جیسے دریا کی ہتھ میں بھونچال آ رہا ہو اور بہروں
 کے بنائے آبلتی آگ کی لپٹیں بھینک رہا ہو۔ کشتی بے قابو ہونے پر تنگ
 سی گئی تھی۔ اور رحمان کا سارا زور کشتی کو قابو میں رکھنے کے لئے صرف
 ہو رہا تھا۔ پانی میں اتنی تیزی سے بل پڑ رہے تھے کہ اُسکے سارے جسم
 میں بل پڑ رہے تھے۔ جی چاہ رہا تھا کہ کشتی موڑ کر واپس پمپ شپ
 بندر پار پر لے جائے۔ اس دریا کی مسست دھار میں جانا موت کے منہ
 لگنا تھا۔ جاتے بھی وہ پمپ شپ بندر پار پر تو کھانے کے لئے بھینے مرغے
 ملتے۔ پینے کے لئے اس میٹا۔ پانی کے بجائے شراب کی بوتلیں ملتیں۔
 اور زندہ رہنے کے لئے نوکری۔ اور سبوروں نے اُسکو روکنے کے لئے
 سرکاری نوکری کالاج بھی دیا تھا وہ سیلاب کو دیکھ کر پھولے نہ سما
 رہے تھے۔ سیلاب کیا آگیا تھا اور سبوروں انجینروں اور ٹھیکہ داروں
 کی قسمت میں سیلاب آگیا تھا۔ اُنکی تقدیر جاگ گئی تھی۔ سیلاب کی بنا ہی
 نے دنیا بھر کا م پیدا کر دیا تھا۔ واپس پمپ شپ بندر پار پر جاتے
 تو شاید وہ بھی دینا نہ تھا کی طرح میری بن جاتے۔!

اور جو واپس پمپ شپ بندر پار پر نہ جاتے تو دریا کے پار
 تارکے جھونپڑی کی ویرانی تھی۔ بھوک سختی بوڑھے کی حنت حانت
 سختی بڑھیا کی دھونس ڈپٹ سختی اور پھولی کی..... پھولی کی.....
 وہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کیونکہ اُسکے درمچھڑاتے ذہن میں پھولی کا کوئی
 واضح احساس نہ جاگ گیا تھا۔ پھولی تپتا بدن تھی یا برف کی منہ سیل

آگ کی بوند تھی یا خالی بوتل۔ یا بریلے سیلاب کا ایک حقیر اجوائی
زندگی کو معمولی ناؤ کی طرح بہا لے جا رہا تھا۔ اتنی تیزی سے.....
انہی تیزی سے..... اس کا سر چکرانے لگا۔

کہیں وہ بہک تو نہیں گیا ہے۔ یہ شراب کا لٹہ تھا یا تیز رفتار پانی
کا اثر..... اندازہ کرنے کے لئے اس کی کانپتی نگاہیں اُفق سے اُچٹ
کر کشتی کے کناروں پر پھیلنے لگیں۔ کشتی کے کناروں پر پہلی جہاگ
ایسے جم رہی تھی جیسے سیلاب کے ڈر سے کشتی کا سہارا لینا چاہتی ہو
اور کشتی پہلی جہاگ کے بوجھ تلے لڑکھڑاسی رہی تھی..... کراہ سی رہی
تھی۔ (ہو) حال رہا تو شاید اُسکا اپنا وجود بھی لڑکھڑا جائے۔ پانی لٹکار
رہا تھا۔ مٹہ چڑا رہا تھا۔ وہ جھنجھلا اٹھا۔ اُسکے سارے بدن میں وحشت
ہی کوند گئی تھکے بازوؤں میں نئی تیزی آگئی اور کشتی اور پانی کے
”کراؤ کی گرج اور اونچی ہل گئی۔“

سیلاب سے لڑتا جھگڑتا..... چھینٹا اڑانا وہ پار پہنچ جانے میں
کامیاب ہو گیا۔ بھلا ہوا اور دیروں کا جنموں نے جا لے سے پہلے
اس کو زبردستی شہر پار بلا دی تھی۔ شراب کی جلد بوندوں کے
سامنے اس سیلاب کی وقعت کی تھی۔ قہقہہ مار کر سیلاب کا مٹہ چڑا
چاہتا تھا لیکن اُسے ملنے سے قہقہہ نہ اُبھر آیا۔ مکان کی جگہ تلے کا ڈھیر تھا
مٹہ چڑا رہا تھا۔ کہیں وہ اب بھی نیلے کی بیگ میں غرق تو نہیں اس
نے اپنی آنکھیں مٹل ڈالیں۔ تلے کا ڈھیر وہیں کا وہیں تھا۔ پانی کی لہریں
ہر میں تلے کے ڈھیر کو چاٹے جا رہی تھیں۔ وہ کچھ دیر بعد پہنچ جاتا تو
شاید سیلاب تلے کے ڈھیر کو پوری طرح سے چاٹ گیا ہوتا اور اسے

منزل کی تلاش میں اس میلوں پھیلی مٹیالی موت میں بھٹکنے کو مجبور
 دیتا تھا کہ تنگ ہار کر وہ موت کو ہی اپنی منزل سمجھنے پر مجبور ہو
 جاں لیکن بلے کا ڈھیر ہاؤن نظر آرہا تھا۔ بلے کے ڈھیر پر چھت کی
 ٹوٹی بھوٹی کڑیاں کئے ہاتھ پیروں کی طرح بے ترتیب پڑی تھیں۔
 بے ترتیب کڑیوں پر گھاس کے گھٹے پریشان تھے۔ کچھ گھاس کے گھٹے
 پانی میں بہہ رہے تھے اور دور پہے ہارہے تھے۔ شاید وہ خود بھی ان
 بہتے گھاس کے گھٹوں کی طرح ایک گھاس کا گھٹا تھا سرگرداں
 آوارہ۔۔۔ جسکی راہ سیلاب نے اوجھل کر دی تھی۔ جسکی منزل سیلاب
 ڈھکا گیا تھا۔

بلے کے ڈھیر کے کئی پکڑ کاٹ کر بھی اُسکو کوئی ایسا نشان نہ ملا جس سے
 مکان کے کینوں کا کوئی پتہ چل جاتا۔ اُس نے ناؤ بلے کے ڈھیر سے لگا دی
 اور ہاتھوں سے بلے کو کوبنے کی کوشش کرنے لگا۔ دل میں ڈراؤ بھر رہا تھا کہ
 نہ معلوم موت کس بجلیاں صورت میں سامنا کرنا پڑے۔ کہیں بلے کے اتنے
 بڑے ڈھیر کو ہٹانے کی اُسکے تنگ بدن میں سکت نہ تھی۔ کچھ ہی دیر میں اُسکے
 پیر شلی ہو گئے۔ اُس نے ادھر ادھر دیکھا میلوں تک پانی کا راج تھا۔
 جس میں زمین کے سارے نشان مدغم ہو گئے تھے۔ صرف دور۔۔۔ بہت دور
 سیلاب سے محفوظ بنی دیکھائی دے رہا تھا۔ سیلاب کی پرچھائیاں ساگ رہا تھا۔
 باپ شاید زندگی بھر سیلابوں کا سامنا کر کے آخر کار سیلاب میں ہی گم ہو گیا ہے؟
 ناخودِ جا احساس ہوتے ہی بچتا دے کی ایک تیز لہر اُسکے تنگ ذہن کو
 دبوکتی۔ بھلا کیا ضرورت تھی سو نہ داری آنے کی۔ سو نہ داری میں اگر بچا ہوں۔
 محبت کی پٹلیں بڑھانے کی۔۔۔ بھولی۔۔۔ بھولی جس نے اُسکو نظر انداز کر کے۔

عہد السلام سے ناظر جوڑ لیا۔ عہد السلام نے چھوڑ دیا تو اُسکو اپنے دام میں
 پھنسانا پڑا۔ اور جو وہ بھی کتا رہا کو لیتا تو کسی اور شکار کو مقدس کر لیتی۔۔۔ مال زیادتی
 کتنی... کاش اُسکا باپ ایک بار زندہ ہو جائے تو بھولی کو باپ کے پیروں سے
 کچل ڈالے۔ کاش وقت کچھ لمبے پیچھے لوٹ پڑے تو وہ اپنی کوتاہیوں، زیاد
 تیوں اور گناہوں کا کفارہ کر سکے۔ کاش.....

کاش... وہ بیل کی منڈیر تک پہنچ جائے اور اپنے لڑکھڑانے بدن کو
 کچھ دیر کے لئے کھڑدری سخت زمین کا سہارا دے سکے سیلاب نے اُسکی
 زندگی کا سب سے بڑا سہارا چھین لیا تھا۔ اب حقیقت واضح ہو گئی تھی کہ
 ظاہراً وہ اپنے بل بوتے پر کھڑا رہنے کی کتنی ہی سعی کرے لاشعور میں اُسکی
 ہر حرکت باپ کے وجود کے سہارے کھڑی تھی۔ وہ سونہ واری آگیا تو یہ
 سمجھ کر کہ ناکام ہو کر بوڑھے باپ کے ہاں پناہ مل سکتی ہے۔ دینا ناخوش
 ناظر ٹوڑ دیا کیونکہ وہ جاننا تھا اُسکا بوڑھا باپ دوست کی کمی کو پورا کر سکیگا
 ۔ بھولی سے رشتہ بڑھانے کی جرأت کی کہ کہیں دائو اٹھا پڑ گیا تو باپ کا کھڑدار
 مفلوظ جسم دھال بن کر اُس پر چھا جائے گا۔ ہر بلا سے اُسکو محفوظ رکھینگا۔
 مگر اُسے سیلاب کے بیچ اپنی قسمت کھوینے وہ تب چلا تھا جب اُسکا باپ
 اُسکے ارمانوں کی حفاظت کے لئے موجود تھا۔ اب باپ نہ تھا تو کچھ بھی نہ تھا۔
 سیلاب نے اُسکی جان نہ لی ہو لیکن زندگی چھین گیا یا شاید اُس نے خود اپنی
 زندگی کو سیلاب میں غرق کر دیا۔ رو دے تو کیا حاصل۔ اس سیلاب کے
 سامنے چند آنسوؤں کی کوئی وقعت نہیں... کوئی وقعت نہیں...
 ناؤ بیل تک آگئی تو آنکھوں میں آنسوؤں کے۔ آنسو بھی شاید بیل ہی
 منڈیر سے پیٹھ لگائے نہرا کو بے اعتباری سے ٹکنے لگے بیل کی منڈیر سے

پتھر لگاتے سر جھٹنوں میں چھپاتے اسکا باپ سویا پڑا تھا۔ پاشاید سیلاب نے
 بڑھاوا کر دیا تھا۔ اسکا اپنا لنگ انٹ سیلاب نے بڑھاوا کر دیا تھا۔
 جی چاہ رہا تھا کہ وہ بھی جھٹنوں میں سر جھکا کر سویا پڑا رہے۔ صدیوں
 سو سو یا پڑا رہے۔ لیکن سر جھکانا اسے منظور نہ تھا۔ سر جھکا لے تو شاید
 یلو دھاری دھار قبض کارنگ سیلاب اڑا لے جائے۔ مٹی سے مٹی سفید
 شلوار مٹی لے پانی میں جذب ہو جائے۔ اور سارا ماحول کچھ دور پڑے
 سائوں کی طرح سائوں میں تبدیل ہو جائے۔ پھوٹی اور بوڑھیا کے
 سوا کب کے سائے ہو سکتے تھے۔۔۔۔۔ اسے یقین نہ آ رہا تھا۔ وہ کھڑا ہو کر
 کشتی کا نواز بن گیا اور وہ گرتے گرتے بچا۔ بے تحاشہ اس نے فحش
 چھلانگ لگائی۔ دیر کر دی تو شاید پل کی منڈیر کے ساتھ لگے یہ کچھ
 ساتے بھی بڑھتے اندھیروں میں گم ہو جائیں۔ کیا معلوم پل کی منڈیر
 اور منڈیر سے چٹانوں کا چھوٹا سا قطعہ بھی لگا ہوا ہے اور جھل ہو
 جاتے اور وہ ایک بار بے سہارا ہو جاتے۔ اب اس میں اکیسے رہتے
 کی ہمت نہ تھی۔ کاش اسکی نگاہیں اس خواب کو تباہ کر دے
 نہ کھیں جب تک وہ کوئی سٹو سو نشان نہ پاتے۔

تم زمیں پر بال کی جھن مٹی۔ قدم لڑا کھڑا رہا تھا اور پاؤں کی
 چاپ اُٹھنے سے پہلے ہی سیلاب کی گونج چاٹ جاتی۔ اس لئے اسکا باپ کا
 شانہ بڑھ کر جھنجھوڑا پڑا۔ سب سے پہلے پڑا جیسے سیلاب کی کوئی منڈیر
 چھو گئی ہو۔

تم۔ تم۔ تم۔ تم۔ میں سمجھا تھا سیلاب پہلے گیا ہو گا۔ یقین نہیں آتا کہ تم
 ہو تم تو دیر ہی چلے تھے روپیوں کا صندوق بھی ڈوب گیا تقاریب ہی

دوب جاتے تو کوئی کیا کرے۔ کچھ نہ باقی رہا اس دنیا میں میرا۔۔۔۔۔

”کیسے ڈوب گیا صندوق۔۔۔۔۔ رحمان کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ باب کے حرم میں نے اُسکے تنکے ذہن کو آلودہ کر دیا۔ خیر و عافیت ہو چھپے اور جان کی خیر منانے کے بجائے وہ سود و خواروں کی ہوا سب و کتاب کر رہے تھے بیوقوف بنایا تنکے کر بڑا حال ہو گئی تھی۔

”بڑا مہیا ماں زاد سی نے ڈوب دیا جو ایسے بے فکر لیٹی پڑی یہہ پیچھے کچھ بھی نہ ہوا ہوا،، نیرا دل کی بھڑاس نکالنے لگا۔

”بڑی دیر بنتی تھی۔ پاکیزہ بنتی تھی۔ پانی میں بے سہارا چلتی رہی۔ لاکھ کہنا کہ ہاتھ پکڑ کر چلو پہرہ ڈالیں رانی بھی۔۔۔۔۔ جیسے میں اُسکو چھوٹے مای کہا جاتا ہے جب مکان سے یہاں تک آدھا راستہ آگئے تو دریا کے طرف کا بندھ ٹوٹ گیا۔ میں نے تم سے کہنا تھا کہ بندھ میں دریا میں پڑ گئی ہیں۔ بالکل اسی جگہ بندھ ٹوٹ گیا۔ سو بلا میرا اندازہ کہیں غلط ہو سکتا تھا البتہ اسٹے کی داد سننے کے لئے رک گیا۔ لیکن رحمان اُسے ایک ٹکٹ گچھوڑ رہا تھا۔ نیرا نے سٹپٹا کر پچھر کہنا شروع کیا۔

”بندھ ٹوٹ گیا اور پانی کا تیز ریلہ آگیا۔ بڑا مہیا کے پیر اٹھڑ گئے۔

”بے ستائشہ مجھ سے لپٹ پڑی۔ بڑا مہیا جو ٹھہر گیا تو میں گھر گیا۔ صندوق لاتی میں لپٹا میری بغل میں دبا تھا۔ وہ بہہ گیا۔ میں نے ہزار کوشش کی کہ بڑا مہیا میرے ہاتھ پیر چھوڑ دے لیکن شیطان کی خالہ مجھ سے برابر الجھتی رہی جتنے کہ صندوق دور بہہ گیا اور لاتی بھی ڈوب گئی۔ وہ تو نہ معلوم میرے دل میں کیا آیا کہ لا لپٹ گئے کہ بڑا مہیا گویا نہاں تک لے آیا ورنہ جی تو چاہتا تھا کہ پانی میں ہی دبا کے رکھ دوں ماں زاد سی کو۔۔۔۔۔

مر جاتی تو میری بلا سے ... پر تم یوں کیا دیکھ رہے ہو کیا میں جھوٹ
 بول رہا ہوں؟ کیا تم سمجھتے ہو میں نہ صندوق چھپا لیا ...؟ بولو بھئی۔
 - جواب دو ...!

اور رحمان سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ وہ باپ کو برا بھلا کہہ کر
 جا رہا تھا۔ یقین نہ آ رہا تھا کہ بوڑھا بڑھیا کو مارنے پر تیل گیا تھا۔ شاید
 باپ صندوق کی خاطر اسکو بھی بہہ جانے دے۔ لالچی۔ حریص کتا۔ کوئی
 فائدہ نہ تھا اس جیسے باپ کے سامنے سر جھکانے کا۔ اپنے گناہوں کا
 کفارہ کرنے کا۔۔۔ اسکی سوچ خود بخود بدلتی گئی۔ اس نے پیٹھ موڑی
 اور نہرا ابل سا پڑا۔ یقین نہیں آتا میری بات کا۔۔۔ میں اگر جھوٹ
 بول رہا ہوں تو بڑھیا سے بوجھ لو۔ وہی سگی ہے نا کھاری۔ میں
 کون ہوتا ہوں۔ جاؤ۔۔۔ جاؤ۔۔۔ بوجھو۔۔۔ لیکن وہ تمہیں کچھ نہ بتا سکے گی۔
 وہ مر گئی ہے۔۔۔ میری کوشش کے باوجود مر گئی ہے۔

”بڑھیا۔۔۔ بڑھیا مر گئی ہے،“ اسکی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ جس بڑھیا نے
 اسکو مرنے سے بچایا وہ کیسے مر سکتی ہے جب وہ خود زندہ ہے۔ نہرا
 سمجھا گیا ہے۔ سیلاب نے اسکا دماغ خراب کر دیا ہے۔ ابھی تو کہہ رہا تھا
 کہ بڑھیا الٹی پڑی ہے۔ ویسے ہے تو عجیب سی بات لیٹ کے پڑا رہنا
 بھولی کو چاہئے کیونکہ بھولی بیمار تھی۔۔۔ کہیں واقعی تو نہیں مر گئی بڑھیا۔۔۔
 - ارے نہیں۔۔۔ مر گئی ہوئی تو بھولی یوں چپ نہ پڑی رہتی۔۔۔ وہ رونے
 لگتی۔۔۔ بین کرتی۔۔۔ جیسے ہر زندگی ہر موت پر کرتی ہے۔ کہیں شاید بھولی
 بھی مر گئی ہو۔۔۔ اس نے یہ اعتبار نگاہوں سے باپ کی طرف دیکھ لیا۔
 کہیں بوڑھے نے صندوق کی خاطر ماں بیٹی کو مار نہ دیا ہو۔۔۔!

نمبر ایٹے کی آنکھوں میں برہمیتی ہے اعتبار ہی کو نہ سہہ سکا۔ اُس نے سر جھکا لیا اور آہستہ سے کہنا شروع کیا۔

”برہمیا بہت پانی پی گئی۔ پیٹ دبایا لیکن پانی نہیں نکلا۔ ہوش بالکل نہ تھا۔ پھولی روئے لگی۔ بھلا میں اکیلے آدمی کیس کیس کو سنبھالتا۔ مرنے والے کو سنبھال دیا روتی بیٹی کو۔ پھولی کا دھیان ہٹانے کے لئے میں نے اسے برہمیا کے پاؤں دے دیئے پر لگا یا۔ خود برہمیا کے بدن کی مالش کی۔ لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ برہمیا سر دھونچکی کھٹی۔ اب بھلا میں پھولی سے کیا کہتا۔ کیونکر کہتا کہ اُسکی ماں مر گئی ہے۔ وہ تو اب تک سمجھ بیٹھی ہے کہ بوڑھیا بے ہوش ہے۔ پاؤں دابنے دابنے خود بھی ہوش کھو بیٹھی۔ نہ۔ نہ۔ نہ مری نہیں بیٹھن سے نہ ڈھال ہو کر بے سدھ ہو گئی ہے۔“

اجمان کو اب بھی اعتبار نہ آیا۔ اُسکو باپ کی کسی بات پر بھی اعتبار نہ آتا تھا۔ اُس نے جب بھی کسی بات کو سوچنا چاہا۔ سمجھنا چاہا۔ اعتبار کرنا چاہا پھر اسے جان بوجھ کر اُسکے اعتبار کو جھٹلایا۔ بچپن میں وہ پھل پھول کے پھلنے پھولنے تو نبر اسیوں کی تاثیر کر دوسری بنانا اور کسی کھلنے کی مانگ کرتا تو نبر اکیلوں کو خطرناک چیزیں کہہ کر مال دیتا تھا۔ اور جو کبھی کبھار وہ سیر سپاٹے پر جانے کی ضد کرتا۔۔۔

دوسرے بچے نشاط باغ شاہمار باغ اور ڈل کی سیر کو جایا کرتے تھے۔ تو نبر اجین بھوتوں کا حوالہ دے کر اُسکو جانے سے روکتا تھا جتنے کہ اُسکی ہر حرکت کو گناہ کا لباس پہناتا تھا۔ بوڑھے کی بات پر اعتبار آتے تو کیونکر۔۔۔ اُس نے برہمیا کے وجود میں ماں کی کمی کو پورا کرنا چاہا تو باپ نے برہمیا کو ڈائین کا درجہ دے دیا۔ آج باپ کی بات پر یقین آتے تو کیونکر۔۔۔۔۔

سہرا نے اسکو بڑھیا کی طرف بدستور گھورتے پا کر بوہنی کہہ دیا۔
 "ہو سکے تو کچھولی کو جو جگہ گانا نہیں... بیمار تو ہے ہی۔ روئے پٹنے سے
 مر جاتے گی اس ویرانے میں۔"

بڑھیا کے پاس پہنچ کر جواباً اُسکے ذہن نشین ہو گئی وہ یہ سہتی کہ بڑھیا
 کے کمر در سے پاؤں کیچڑ میں لت پت تھے۔ کچھولی بڑھیا کے پاؤں پر سر رکھ
 کر بے شلہ بڑی سہتی اور بالوں کی ایک لٹ کیچڑ میں لت پت بڑھیا کے پاؤں
 سے چپک گئی تھی۔ لہجہ بھر کے لئے اُسکے جی میں آیا کہ جھٹک کر بالوں کی لٹ
 کیچڑ سے الگ کر کے سزا دے۔ بیماری نے ویسے ہی سب بال نکال لئے
 تھے۔ بچی ہوائی مرغی دگتی تھی۔ لیکن وہ جھٹک نہ سکا۔ کچھولی کی جاگ کھل
 جانے کا خطرہ تھا۔

وہ ذرا اور آگے بڑھ گیا۔ بڑھیا ایک لمبے ڈانڈھ کی طرح سیدھی
 لیٹی پڑی تھی۔ سر ہم زمین پر ٹٹھک سا گیا تھا۔ گلے پر اُبھری رگوں کا
 جال تھا ہوا تھا۔ چہرہ دکھانہ تھا پر آنکھیں بند تھیں۔ بائیں کھال پر کیچڑ کا دھبہ
 تھا جس سے میل کی لکیر کان کے پاس بکھرے سفید بالوں کے گچھے میں بڑھ
 گئی تھی۔ سر کے باقی بال کیچڑ میں تھپڑ کر پٹائی کی طرح بٹے دکھائی دیتے تھے۔
 غیر ارادی طور پر اُسکی نگاہیں ماں کے چہرے سے بہک کر بیٹی کے
 چہرے پر جم گئیں۔ ماں بیٹی کے خند و خال بہت حد تک ایک دوسرے سے ملتے تھے
 ۔ وہی مسخ سی ناک۔ وہی بھاری پیوٹوں سے ڈھکی لمبو تری آنکھیں اور
 وہی نازک نازک کمزور جسم۔ کوئی نمایاں فرق تھا تو یہ تھا کہ کچھولی کا جسم
 ہلکے ہلکے سانس کے زیر و بم پر ڈول رہا تھا اور بڑھیا کا جسم بالکل نہ ہل رہا
 تھا جیسے بہت لمبا کھٹن سفر طے کر کے آرام کی گہری نیند سوز رہی ہو۔ شاید

ایسی ہلکی سی حرکت کا نام زندگی ہے۔ ورنہ بڑھیا کے جسم اور چہرے پر موت کی کوئی ایسی چھاب نہ ڈال دی گئی جو پھولی کے جسم اور چہرے پر نہ گئی اور پھولی زندہ گئی۔

پھولی زندہ گئی اور بڑھیا مر گئی تھی۔ کچھ دیر کی اور بات تھی پھر یہ تسم قبر کی حقیق اندھیروں میں گم ہو جائیگا ہمیشہ کے لئے۔ یا پانی کی احتواء گہرائیوں میں۔ کون جانے سیلاب کسے کا نام نہ لے۔ اس زمیں کے قیصر کو بھی اپنی پیٹ میں لے لے اور وہ سبیا بھی بڑھیا کے ساتھ ساتھ پانی کی احتواء گہرائیوں میں گم ہو جائیں۔ اس طرح سوچ کر اپنا جی ہلکان کرنے سے کوئی فائدہ نہ تھا۔ بڑھیا مر گئی تھی اور بڑھیا کے ساتھ ساتھ اس کے بند بھی مر گئے تھے۔ پھر کہ اب پھولی کا قرب حاصل کرنے کے لئے بھی کوئی جواز نہ باقی رہ گیا تھا۔ وہ شاید آزاد ہو گیا تھا۔ سو نہ داری کی کھڑور فوٹوں سے آزاد ہو گیا تھا۔ اسے خوش ہو جانا چاہئے۔ رہائی حاصل کرنے کے خیال سے خوش ہو جانا چاہئے۔ لیکن وہ کوئی خوشی نہ محسوس کر سکا وہ کسی کسی انجانے گوشے میں یہ خیال گھبرا رہا تھا کہ وہ سو نہ داری کی کھڑور فوٹوں سے آزاد نہیں ہوا بلکہ اُن کے سامنے مار گیا ہے۔

جو ی طرح سے مار گیا ہے۔

اُس نے ایک گہری سانس لی اور واسکٹ کی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ ایک جیب سے کچھ پیسے برآمد ہوئے۔ دوسری جیب سے سگریٹ کا بیسکا ادمہ ملا۔ اُس نے جوتے اور سیرپینٹ بندھنا شروع کیا۔ پیراٹیکل منہ میں کھولیں گئے تھے۔ اُس نے پینے قیصر کی جیب میں ڈال دی۔ ادمہ بچا سگریٹ کے ٹکڑے کو پاس پر لے ایک پتھر پر احتیاط سے

رکھ دیا۔ سوکھ جائے تو بیٹے کے قابل ہو جائے۔

بچپن خالی کر کے واسکٹ اپنے کندھوں سے جدا کر کے ہتھ کر لی۔

دھیرے دھیرے بڑھیا کابلے جان سر اٹھایا۔ ہتھ کیا ہوا واسکٹ سر کے نیچے جما دیا۔ بڑھیا کا سر تھکتے ہوئے واسکٹ پر رکھتے ہوئے کچھ پانی کی بوتلیں اُسکے ہاتھوں پر گر گئیں۔ شاید بارش سیر سے شروع ہو رہی تھی۔ وہ کھڑا ہو گیا اور آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ دُعا لائی نکالوں کو لگے۔ آسمان پر اچھیرے ستارے باؤں نہ دکھائی دتے۔

رات اپنے جو بن پر تھی۔ میٹلا پانی اندھیرے کا لہا دہ اڑھ کر کالا لگ رہا تھا۔ اندھیرے کے سمندر نے سیلاب کتہہ و دیکڑ دیئے تھے۔ اور زمین کا یہ تنہا سا قطعہ وسعت اختیار کر کے اچھا خاصا میدان سالک رہا تھا۔ فضا پانی کی گونج سے حاملہ نہ ہوتی تو یہ بھیانک رات عام راتوں سے مختلف نہ ہوتی۔ آج کی رات نہ ہوا چل رہی تھی۔ نہ بارش ہو رہی تھی اور نہ ہی کوئی اور غیر معمولی بات ہو رہی تھی۔ رحمان کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ساری کائنات حسب معمول دین بھر کی تکان سے پور تارہ کی کی چادر

تانے آرام کی نیند سو رہی ہو اور آسمان پر جلوہ گر ستارے حسب معمول پہرے

دے رہے ہوں۔ ستاروں کی ہلکی سی روشنی بچپن دُعا کی طرح پھیلی ہوئی لگتی تھی۔

رحمان کو محسوس ہوا اور اُس نے سوچا کہ کاش یہ تاریک پردہ بڑھ کر

اُسکے آوارہ ذہن پر بھی تن پاتے پاس پڑی بڑھیا کی لاش کی طرح اُسکے کلبلا تے

خیالات کو بھی ڈھانپ رکھے پھر شاید وہ بے روک ٹوک باپ کا سامنا کرنے

کی ہمت کر سکے۔ جو ان ہوتے ہوئے بھی وہ ایک ننھے کلبلا تے بچے کے مانند

بوڑھے باب کا سہارا لینے پر مجبور تھا۔ اور باب تھا تو اُسکی بے چارگی سے
بے نیاز پانی کے کنارے بیٹھا پانی کو گھورتا چارہا تھا۔ چھوٹے باب کے بوڑھے
سہارے کو تو شاید باب حسب معمول برس پڑے اُسکی دیدہ دلیری پر۔۔۔ اور
آج باب کے نشتر پہنے کی اُس میں سکت باقی نہ تھی۔ کیسی کے نشتر سمجھنے کے لئے
طاقت باقی نہ تھی۔ جی تو چاہ رہا تھا کہ وہ بھی پھولی کی طرح بڑھیا کے پاس
دیرنا مار کر رو دے۔ اتنا رو دے کہ آنسوؤں کا سیلاب اِرد گرد مٹالے
سیلاب کو بہا کر اُسکو بھی ساتھ بہا لے جاتے۔ ایسی جگہ بہا لے جاتے جہاں
کوئی دُکھ نہ ہو۔ جہاں کوئی تکلیف نہ ہو۔ جہاں کوئی کشمکش نہ ہو۔۔۔۔۔
جہاں کوئی مارجیت نہ ہو۔۔۔۔۔ جہاں کوئی۔۔۔۔۔

”کیا سوچ رہے ہو۔۔۔“ نمبر ایک سرگوشی نہ تھی ہتھوڑے کے مار تھی۔
اُسکی سوچ کے پرچے اُڑ گئے۔ پریشان اوسان یکجا کرنے میں اُسے
صدیاں لگ گئیں اور صدیوں بعد اُس نے جواب دیا۔
”بڑھیا کو ٹھکانے لگا دیں تو چلیں۔۔۔ یہاں رکنے سے فائدہ۔۔۔“
”کہاں چلو گے۔۔۔ نمبر انے بدستور پانی کی سطح کو گھورتے ہوئے کہا۔
اندھیرے میں پل کی منڈیر سے پیٹھ لگاتے اکڑوں بیٹھا وہ انسان نہ لگ رہا تھا
بلکہ پتھر کا ڈھلا۔۔ اور پتھر کے ڈھلے سے لڑنا آسان نہ تھا۔

”شہر۔۔ شہر چلیے۔ اب یہاں۔۔ اب یہاں کیا رکھا ہے“ کاش نمبرایوں بے
حسن و حرکت نہ بیٹھا رہے تو شاید وہ یوں نہ ہکلائے شہر کہاں جاؤ گے۔
شہر میں بڑی ناؤ تو بہہ گئی ہوگی۔۔۔ ایک نمبر انے سر اٹھا کر اُسکی طرف ایسے دیکھا
جیسے رحمان نے خود اپنے ہاتھوں سے بڑی ناؤ کو دھکا دے کر سیلاب کے
موا لے کر دیا ہو۔ سہڑک اٹھے تو شاید چور چور ہو کر رہ جاتے۔ بدن میں

بالکل سکت نہ تھی۔ اس نے جیسی سے جواب دیا۔

» یہاں تو اب کوئی ٹھکانہ نہیں۔ شہر میں کمر کچھ نہ کچھ بڑا راست کر چکا ہے۔
 « اور بھولی کا کیا کرے گا۔ « ایک ہنر کی آواز بجی تھیکھی لگی یا شاید
 اُسے مخاطب ہو اپانی کی گونج میں ہر آواز عجیب سی سنائی دیتی تھی۔

» بھولی کے ساتھ میرا کوئی رشتہ نہیں۔ میں تو صرف بڑھیا کی
 خاطر یہاں رہ رہا تھا۔ « کہتے کہتے وہ گھبرا سا گیا۔

» اور بچہ ہو ہوا تھا۔ « ہنر نے آخر کار نشتر جھکودیا۔

» بچہ میرا نہیں تھا۔ « رحمان بھوٹا پڑا۔ » بچہ میرا نہیں تھا۔ «

کسی اور کا تھا۔ میں تو ناحق بیچ میں مارا گیا۔

» ہوں۔ «۔ « ہنر اُڑک گیا اور رحمان نے سوچا وہ گھڑی
 آخر کار آگئی جس کا انتظار سب کو تھا۔ جب اُس کو بوڑھے باپ
 کے سامنے کھڑا رہ کر اپنا سارا ماضی داؤ پر لگانا تھا۔ بوڑھے
 باپ سے فیصلہ کرنا تھا۔ اس دن کا انتظار بڑھیا کو بھی تھا۔
 لیکن عجیب بات تھی کہ آج بڑھیا نہ تھی۔ بلکہ وہ اکیلا بوڑھے باپ
 کے سامنے کھڑا تھا۔ اور یہ بھی عجیب بات تھی کہ فیصلہ کرنے کے بجائے
 وہ فیصلہ سننے کا منتظر تھا۔

فیصلہ سننے کے لئے رحمان بے حس و حرکت دم سادھے باپ کے سامنے
 کھڑا رہتا لیکن اُسکی بلبلائی تکانیں تاریکی کے پردوں کو چھید کر باپ کے
 چہرے پر فیصلے کو ٹولنے کی سرٹوڑ کو شش کر رہی تھیں۔ دریا کی گونج بھی
 جیسے شہر کا فیصلہ سننے کے لئے کھڑا کر بخند ہو گئی تھی۔ اور وہ خود
 بخند ہو کر ٹوٹ پڑا۔

”تمہیں یقین نہیں آتا بابا... میں سچ کہہ رہا ہوں۔ وہ میرا بچہ نہیں تھا۔ میں اس گھر میں رہنا سنا تھا اس لئے زبردستی میرے گلے منڈھ دیا گیا۔ اب تمہیں کیسے یقین دلاؤں؟“

”یقین تو آ رہا ہے... بہنرا کی آواز نہ حال سی ہو گئی۔“ لیکن سوچ رہا ہوں بڑھیا نے تمہیں کھلا یا پلا یا تم کو اپنے سگے بیٹے کی طرح رکھا۔ جب تم مٹی کے نیچے دب گئے تھے تو بہنرا کی تیمارداری کی۔ تمہیں نئی جان دی... میں بڑھیا کا یہ قرضہ چکا نہیں سکتا۔۔۔ اُسکی بیٹی کو بے سہارا نہیں چھوڑ سکتا۔۔۔ میں احسان فراموش نہیں... یسنا تم نے.....“

”تو میں کیا کر سکتا ہوں... رحمان باپ کی باتیں سن کر سر پریشان سا ہو گیا۔ بوڑھے کا یہ رُخ اُسکے لئے بالکل نیا تھا۔

”تمہیں بھولی کے ساتھ شادی کرنی پڑے گی اُسکے بغیر اور کوئی راستہ نہیں“ بوڑھے نے فیصلہ دیا اور دریا کی منہج گونج جیسے ایک دم بجھل گئی تو رحمان کے پاؤں اکھڑ گئے۔

شادی... بھولی کے ساتھ... میں شادی... میں...

”ہاں ہاں شادی... بہنرا جھٹھلا پڑا، تم شادی نہیں سمجھ پاتے

”لیکن بابا... میں کیسے شادی کر لوں... بھولی بچہ... ایک بچہ... رحمان نے

بہنرا کو یاد دلایا۔

”میں سمجھتا ہوں... بہنرا جا چاکی آواز گھسیر ہو گئی۔ یہ سامنے دریا دیکھتے ہوئے۔ سیلاب آنے سے پہلے اسکا پانی صاف تھا شفاف تھا۔ تمہیں پیاس لگتی تھی تو بے روک ٹوک ہاتھ بڑھا کر پانی پی لیتے تھے۔ مجھے پیاس لگتی تھی اور میں بھی پی لیتا تھا۔ سب پی لیتے تھے۔ یہ ایک سیلاب آنا پانی گر لا ہو گیا۔ میل ہو گیا۔ پینے کے قابل نہ رہا

اب تم اپنے کی جاہت رکھتے ہوئے بھی پانی نہیں پی پاتے۔ کچھ دنوں بعد یہ لڑا ب اتر جائیگا۔
 مٹی نہ پر مٹی جائیگی صاف شفاف پانی اُبھر آئیگا۔ تو تم پانی پینے میں جھجک محسوس نہیں کرتے
 یہ جان کر بھی کہ پانی مٹی لا تھا۔ گدلا تھا اور پینے کے بالکل قابل نہ تھا۔ پتھر کے
 تو حیوان کے سب سے ۔۔۔۔۔“

” میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہ آیا۔ معلوم تم کیا کہہ رہے ہو۔۔۔۔۔ رحمان بے صبر ہو کر بول اٹھا
 شاید لوڑے کا سر سہر گیا تھا جو آج غیب سی باتیں کر رہا تھا۔ ورنہ مجھ کو اور پانی کا کیا میل۔!۔
 ”تم نہیں سمجھ پاؤ گے یہ باتیں۔۔۔ سبرا غصے ہو گیا۔ تم نے ابھی زندگی کہاں دیکھی جو زندگی
 کے راز سمجھ پاؤ گے۔ تم ابھی بچے ہو۔۔۔ ننھے بچے۔ کھلونے سے کھیل لیا تو ٹوڑی دیر اور جی اوب
 گیا۔ لگے نئے کھلونے کے لئے بچنے بٹھنے سے دل بھر گیا تو سونہ داری چلے آتے۔ سونہ داری جو
 جی اوب رہا تو اب شہر جانے کیلئے محل رہا ہو بھلا کیا رکھا ہو شہر میں ہمارے لئے راناؤ تھی
 تو وہ بہہ گئی ہوگی۔ رجنے کا کوئی سہارا باقی نہیں شہر بیلے بھی جاؤ تو درگھو کر س کھانے
 کے سوا کچھ بھی نہیں گھر بسانے کے لئے جگہ نہیں تمہاری شادی نہیں ہو سکتی رہے گھر کو کون
 دیکھا رہا کی۔۔۔“

اور یہاں کیا ہے۔۔۔ رحمان بھی جھنجھلا گیا۔ سیلاب نے شاید بدھے
 کو واقعی پاگل کر دیا تھا۔

یہاں سب کچھ ہے۔۔۔۔۔ بوڑھے کی آواز میں اُسید اُبھرنے لگی۔ چوٹی ہے جس سے تم شادی کر دیتے اور اپنا گھر
 سادے زمین ہے بوڑھا چوڑا ہے مکان چاہے گر گیا ہے۔ ہم تینوں بول بول کر اینٹ اینٹ جمع کر دیں گے۔ ایک
 چوٹی سی چوڑی بنائیں گے تم محنت موزوری کرو گے۔ میں باغ لگاؤں گا۔۔۔ دیکھ۔۔۔۔۔ سیلاب رک گیا ہے میں
 شام سے پانی کی سطح کو جانچ رہا ہوں مایک داغ بھی پانی نہیں چٹھ رہا ہے۔ بلکہ پانی کچھ کچھ اتر رہا ہے۔
 اتنا اللہ شکر۔۔۔۔۔ ہوتا اتر جائے گا۔۔۔۔۔ کھترے کھترے کی گھور رہے ہو پانی کو دیکھو۔۔۔۔۔ پانی کو کیا نہیں
 نہیں آتا مٹی بات کا۔۔۔۔۔
 رحمان کو زندگی میں پہلی بار پاپ کی باتوں پر یقین آئیں۔ سیلاب واقعی اتر رہا تھا۔



